من تصنیف

پادری-ایچ-گولکناتھ صاحب بی-اے

جسکو

کرسچن لٹریچر سوسائٹی پنجاب برانچ نے شائع کیا

سنہ ۱۹۰۳ع

اول　　　جلد ۵۰۰　　　قیمت مر

C. L. S. (PUNJAB BRANCH) LUDHIANA.

فہرست کتاب کشف الحقائق

باب اوّل

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

دِیباچہ

اس کتاب کے لکھنے کی غرض یہہ ہی کہ طالبان حق کے لئے باعثِ ہدایت اور اُن کے لئے جو سچائی کی سبیل کو پا چکے ہیں باعثِ تقویت ایمان ہو۔ اس میں مسیحی مذہب کی فضیلت کو ظاہر و باہر کیا گیا ہی اور ابطال و اوہام کے جو اُس کے راستہ میں سدِّ راہ اور مزاحم ہو کر درگاہِ الٰہی تک انسان کو پہنچنے نہیں دیتے اُٹھا ڈالنے کی کوشش کی گئی ہی تاکہ طالب حق مسیحی مسافر کی طرح خدا کے آستانہ تک پہنچکر پکارے اور وہ سُنے کھٹکھٹائے اور وہ کھولے۔ مانگے اور وہ دے +

اِنسانی تواریخ کی فلاسفی مسیحیت سے جدا یاس و حسرت کا طوق اپنے گلے میں لئے ہوئے نظر آتی ہی۔ اُس کے دقائق ایسے ہیں جنکے حل کرنے کی کوئی کُنجی نہیں آتی۔ اُس کے سامنے ایسے مسئلے درپیش ہیں جن کے جواب میں وہ غلطاں و پیچاں ششدر و حیران اور مہرِ خموشی بر دہان نظر آتی ہی۔ مگر اُسکے صفحوں کو مسیحیت میں پڑھو تو اُن کا کافی اور شافی اور تسلی بخش جواب ملتا ہی جسکو پولوس رسول نے

انہوں کے خط میں یوں ادا کیا ہے کہ "سب پر یہہ بات روشن کروں کہ اُس بھید میں شراکت کیونکر ہوتی ہے جو ازل سے خدا میں جس نے سب کچھ یسوع مسیح سے پیدا کیا پوشیدہ تھا تا کہ اب کلیسیا کے وسیلہ سے خدا کی گوناگوں حکمت حکومتوں اور ریاستوں پر جو آسمانی مکانوں میں ہیں ظاہر ہووے" (۳: ۹ و ۱۰) اب ہماری دعا یہہ ہے کہ روح القدس جو زندگی کا عطا کرنے والا اور خداوند ہے اِس خاکسار کے اِس ہدیہ کو منظور فرما کے اپنے بندوں کے ایمان کی تقویت کے لئے اور گمراہوں کو راہ میں لانے کے لئے کام میں لاوے اب اُسکے لئے جو تم کو گرنے سے بچا سکتا اور اپنے جلال کے حضور کامل خوشی سے تمہیں بے عیب کھڑا کر سکتا ہے جو خدائے واحد حکیم اور ہمارا بچانیوالا ہے جلال اور حشمت اور قدرت اور اختیار اب سے ابد تک ہوئے۔" آمین +

احقر ایچ گولک ناتھ

"خدا کی صفتیں جو دیکھنے میں نہیں آتیں یعنی اس کی ازلی قدرت اور خدائی دنیا کی پیدایش سے اس کے کاموں پر غور کرنے سے ایسی صاف معلوم ہوتی ہیں کہ ان کو کچھ عذر نہیں"

تمہید

ہماری منشا تمہید کے متعلق اس امر پر بحث کرنا ہے۔ کہ آیا الہامی ذریعہ کے علاوہ نیچر از خود کس حد تک خدا کی جستجو اور موجودات کی تواریخی حالت کی نسبت صحیح صحیح پتہ دیتا ہے وسائل معلومات نیچر خدا اور خود اپنی نسبت عقل ہے یا کانشنس (نوٹ نمبر ۲) آگے چل کر تواریخاً دیکھا جاویگا۔ کہ کس درجہ تک ان ہر دو مذکورہ قوائے انسانی کی رسائی خدا کو اپنے تصور میں لانے اور ہمارے مذہبی اور اخلاقی مسائل کے حل کرنیکے لئے رہنما ہیں مگر اس سے پہلے یہہ بھی جاننا ضروری ہے کہ کتب مقدسہ ہماری عقل اور کانشنس (نوٹ نمبر ۲) کے حقوق اور اختیارات کے قائم کرنے کے لئے کیا فتویٰ دیتی ہیں؟ سو واضح رہے کہ وہ نادیدنی اشیاء کے بارہ میں ہم سے بلاتحقیق اعتقاد طلب نہیں کرتی ہیں۔ چنانچہ مرقوم ہے کہ "ساری چیزوں کو آزماؤ اور بہتر کو اختیار کرو"۔ درباره عقل انکی یہہ شہادت ہے کہ خدا کی بابت جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اُن پر آشکارا ہے کیونکہ خدا نے اسکو اُن پر آشکارا کیا ہے۔ اس لئے کہ اُسکی صفات جو دیکھنے میں نہیں آتیں یعنی اُسکی ازلی قدرت اور خدائی دنیا کی پیدایش

کے وقت سے خلقت کی چیزوں پر غور کرنے میں ایسی صاف معلوم ہوتی ہیں کہ اُن کو
کچھ عذر نہیں (رومیوں کا خط ۱: ۱۹ و ۲۰) اور کانشنس کے بارے میں یہ ہے کہ جب
غیر قومیں جو شریعت نہیں رکھتیں اگر طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں۔ تو وہ شریعت
نہ رکھتے ہوئے اپنے آپ شریعت ہیں۔ وہ اُس کام کو جس سے شریعت کا مقصد ہے اپنے
دلوں میں لکھا ہوا دکھاتے ہیں۔ انکی تمیز بھی گواہی دیتی اور اُنکے خیال آپس میں الزام دیتے
یا عذر کرتے ہیں (رومیوں کا خط ۲: ۱۴ و ۱۵) اِن مذکورہ بالا آیات سے صاف صاف
ظاہر ہے کہ کتب مقدسہ عقل اور کانشنس کے فطرتی تقاضا اور اختیار کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں چنانچہ
اُنکے حسب منشا دیگر مذاہب کی اخلاقی شریعتوں کا انکار نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے ہر ایک
بنی نوع انسان کو عقل اور کانشنس کی طرف سے مجبور کرتی ہیں کہ وہ خدا کی تلاش کرے اور
کانشنس کی آواز کا شنوا ہو جو مرکوز فی الروح ہے۔ چونکہ انسانی رتبہ عقل اور کانشنس کے
ہونے کی وجہ سے بہت ہی اعلیٰ اور برتر ہے بلکہ وہ خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اِس لئے
اُسکا فرض منصبی اور عین حق ہے کہ وہ ان قویٰ کے ذریعہ جن سے خدا اور خود اپنا علم
ادراک میں آسکتا ہے خدا کو جاننے اور جاننے کے درپے رہے۔ پس مناسب ہے کہ ہم پہلے
عقل کے وسائل معلومات اور کانشنس پر بحث کریں +

بیان دربارہ معلومات عقل انسانی

ذریعہ اول۔ از روئے فطرتِ انسانی درباب حقیقتِ اصول و ماہیتِ وجود
خدا کے وجود کی دلیل از روئے بداہت فطرتی ہے یعنی انسان میں بعض لازم تصورات

ہیں جن سے یہہ استدلال صحیح کیا جاتا ہی کہ خدا ہی۔ یا دوسرے لفظوں میں ایک غیر محدود ذات جو کل اسباب کی علت ہی موجود ہی۔ دلیل استقرائی خدا کی نسبت قائم نہیں ہو سکتی مگر جب بدیہی طور سے خدا کا لازم ہونا تصور میں آتا ہی تو دلیل عملی کا نظری جواب نیچر میں یہہ ملتا ہی کہ ایسا وجود جسکو خدا کہنا چاہئے واقعی موجود ہی۔ انسان کی عقلی وضع کا یہہ ماننا تقاضائے فطرتی ہی کہ خدا ہی + اور ثبوت کے لئے نیچر سے اُسکی حقیقت دریافت ہوتی ہی + فی البداہت خدا کے وجود کا امکان ہی۔ اور استقرائی خدا واقعی ہی + اسی طرح ذہن میں حسابی اصول پائے جاتے ہیں اور بجواب اُسکے نیچر میں حسابی طاقتیں موجود ہیں +

صورت دلیل عملی یہہ ہی کہ ہم میں ایسے وجود کا تصور مرکوز ہی جو غیر متناہی اور بیحد اور کامل ہی۔ مگر کمال کے تصور کے لئے حقیقی وجود کا ہونا لازم ہی۔ کل انسانوں میں خدا کا تصور پایا جاتا ہی مگر خدا کا تصور ایسے وجود کا تصور ہی جو کامل مطلق ہی۔ جس سے کوئی برتر اور اعلیٰ ترین قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ پس ایسے وجود کا تصوّر اُس وجود کا لازم ہونا چاہتا ہی ورنہ کامل وجود کا تصور قائم نہ ہوگا کیونکہ ہم اپنے دماغ میں اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کا تصور باندھتے چلے جاوینگے مگر ہمارے تصور کا کوئی خاتمہ نہوگا جبتک کہ اُس کا ایک کامل وجودِ مطلق پر جو حقیقی اور اصلی ہی ٹھکانا اور قرار نہ ہو + ہمارے تصورات از روئے تجربہ و مشاہدہ پیدا ہوتے ہیں یا ہم خود قائم کرتے ہیں یا فطرتاً روح میں مرکوز ہیں + اُن میں سے خدا کا تصوّر انسان میں فطرتی ہی۔ جو منجانب خدا ہی روح میں ڈالا گیا ہی کیونکہ انسان اور نیچر تو از خود ناممکل ہیں مگر کمال کا تصور جو انسان کرتا ہی وہ عطیہ خدا ہی + ہمارا انحصار دیگر تعلقات سے ہی۔ ہم خود ہیں کامل اور کافی نہیں ہیں۔ ہم تو محتاج

بالغیر ہیں۔ تو ضرور کوئی ایسا کامل وجود ہے جو بذات خود کافی و شافی یا مستغنی الذات ہے۔ الحاصل کمال کا تصور اس امر پر شاہد ہے کہ ضرور ایک کامل وجود ہے + اس دلیل کے مطابق خدا وہ ہے جو ذا المطلق اور شرط مشروط سے مبرا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا سبب خود آپ ہے یعنی اُسکی ہستی کا کوئی خارجی سبب نہیں ہے۔ (۲) غیر متناہی۔ (۳) وجب الوجود یعنی وہ جو شرط مشروط سے مبرا ہے واجب ہے۔ (۴) الواحد یعنی واحد مطلق نہ صرف اور قسم کے لحاظ سے جنس مطلق بلکہ المطلق۔ کیونکہ المطلق وہ ہے جو از خود قرار دادہ ہے + اور نیز اس سے یہہ بھی مفہوم ہے۔ کہ وہ خود کا امتیاز بصورت موضوع و محمول خود اپنی ذات سے کرتا ہے۔ ذات کا مفہوم مثل اور چیزوں کے نسبتی نہیں ہے بلکہ یہہ وہ وجود قائمی ہے جو باطن کی ہر ایک انقلابی حالت میں بدستور قائم رہتا ہے اور خود کا امتیاز خود سے کرتا رہتا ہے + خدا از قسم فرد نہیں ہے بلکہ اپنی ذات میں شخصیت رکھتا ہے جس میں اپنیت یا میں کا مفہوم مستلزم ہے مگر یاد رہے۔ کہ المطلق کا تصور خدا کے جاننے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ وجود باشعور ہے اور خودی رکھتا ہے اور علت العلل ہے + یہہ دریافت کرنے کے لئے علاوہ دلیل عملی کے دلائل استقرائی یا نظری کا ساتھ ملانا ضروری ہے + جب خدا کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور حاضر و ناظر ہے۔ تو ہم مکان اور زمان کا لحاظ کر کے اُن کے مقابل میں یہہ مذکورہ بالا صفات بیان کرتے ہیں یعنی غیر محدود وہ شی ہے جسکو زمان گھیر نہیں سکتا اور نہ مکان ناپ سکتا ہے + الغرض خدا کا ازلی اور ابدی اور حاضر و ناظر ہونا صفات ثبتہ ہیں نہ کہ نفی۔ یعنی اُن تمام چیزوں کا جو کہ محدود ہیں وہ اصل اور علت ہے + مکان اور زمان کی نسبت جو

لازمی خیالات ہمارے دل میں مرکوز ہیں اُن کے ساتھ ہم وجود کے خیال کو شامل کرتے ہیں یعنی کہ الوجود جو غیر محدود ہی ازلی اور ابدی ہی اور جو غیر متناہی ہی حاضر و ناظر ہی - لہذا جو غیر متناہی ہی وہ محدود کا سبب مطلق بھی اور تمام اسباب نیچر اپنے مسبب کو چاہتے ہیں جو سب کا شروع اور آخر ہی مگر جیسا ہم نے پہلے بیان کیا ہی سبب کے دریافت کرنیکے لئے دلیل استقرار کی ضرورت ہی یعنی علاوہ باطنی اصول کے ظاہری شہادت کی بھی ضرورت ہی +

دلیل از روئے ملاحظہ حادثات نیچر

معلول سے علت دریافت کرنا اس دلیل کا خاصہ ہی + یہہ دلیل ظہور خارجی میں حادثات اور تبدلات کا پایا جانا اپنے مد نظر رکھتی ہی - اور حادثات کی بنیاد پر علت کا دریافت کرنا اُسکا پہلا کام ہی + صورت اصول یہہ ہی کہ ہر ایک حادثہ یا وقوعہ کا اول سبب ہی اور دوم ایسا سبب ہی جو وقوعہ کا مناسب حال اور شافی جواب ہی + علت سے یہہ مراد ہی کہ ہر ایک حادثہ یا وقوعہ جو دور زمانہ میں پیش آتا ہی اسکا صورت مقدم میں کوئی سبب یا اسباب ہیں جنکی طاقت سے وہ صادر اور ظاہر ہوتا ہی + علت کا فیصلہ جو تصور میں پیدا ہوتا ہی اصولی اور قطعی ہی - اُس میں علامات کلیت اور لازمیت کے پائے جاتے ہیں اور یہہ بھی مراد ہی کہ ہر ایک وقوعہ کا شافی سبب ہی ایسا سبب جو قابل تسلیم ہو + اوّل ہر ایک حادثہ وجود علت پر دال ہی - دوم ہر ایک حادثہ کا کافی اور شافی سبب ہی بلحاظ رسائی طاقت - یہہ بھی یاد رہے کہ نتائج میں وہ کچھ

ظاہر نہیں ہی جو بصورت مرتبہ امکان اور رسائی علت کی طاقت میں اصلی اور
مقدم موجود نہ تھا+ علت کی معلول کے ساتھہ یہی نسبت ہی کہ علت اپنی خصوصیّت
اور رسائی میں نتیجے سے برتر اور اعلیٰ ہی+ یہہ دلیل عمل اور نظر یا بداہت اور ملاحظہ دونوں
کو باہم ملاتی ہی+ اِس دلیل میں عمل اور نظر دونوں شہادت کے طور پر پیش ہوتے
ہیں- اس طریق پر کہ محدود سے شروع کرکے یہہ دلیل لامحدود کا استدلال کرتی
ہی نسبت سے مطلق کا- غیر لازم سے لازم اور واجب کا+ دلیل کا تقاضا یہہ ہی کہ
عقل کا محدود سے کافی اور شافی سبب کی طرف رجوع ہونا فطرتی ہی+ دلیل تو شاہدات
کے ملاحظہ سے مستنبط ہوتی ہی مگر اصلیت دلیل مشاہدہ سے خارج اور مقدم ہی+ صورت
دلیل یہہ ہی کہ ہر ایک حادثہ کا سبب ہی اور ہر سلسلہ حادثات کا کافی اور شافی سبب
ہی تو نتیجہ یہہ نکلا کہ وہ کافی اور شافی سبب خدا ہی+ دنیا میں دائمی سلسلہ تبدلات
کا نظر آتا ہی- جو آج واقعہ ہوا ہی اُس کا سبب گذشتہ کل تھا اور اس طرح متوالی
مقدم و تالی صورت میں ایک سلسلہ اسبابِ ثانی کا نظر آویگا مگر عقل کی حجت کا
ٹھکانا اور قرار تب ہی ہوگا جب وہ مقدم و آخر سبب خدا کو قائم کرے- فطرتاً خدا
کا تصور انسان میں موجود ہی کہ وہ واجب الوجود اور المطلق ہی+ نظراً دنیا میں
جو کچھہ موجود ہی وہ بصورت حادثہ نظر آتا ہی اور محتاج سبب کا ہی- ایسے سبب کا
جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہیں ہی بلکہ واجب الوجود اور المطلق ہی+ یہہ یقین
عقل کے لئے اطمینان بخش ہی اور عین اُسکے فطرتی اصول کے مطابق ہی- بہ نسبت
اس یقین کے کہ دنیا میں محض ایک لامحدود سلسلہ حادثات کا ہی جاری رہتا ہی+

علاوہ اس دلیل کے دلیل از روئے ترتیب و ضابطہ نیچر ضروری ہے کہ یہہ بھی ظاہر ہو کہ المطلق باشعور اور بالارادہ بھی ہے +

دلائل استقرائی

(۱) از روئے ترتیب نیچر - اس دلیل کی صورت یہہ ہے کہ وہ اشیا جو مفید مطلب دنیا میں نظر آتی ہیں بلا شعور و فہم ظہور پذیر نہیں ہیں + یہہ دلیل استقرائی ہے یعنی نتائج کے ملاحظہ سے وہ سبب کا استدلال کرتی ہے + اس دلیل میں تین امور شامل ہیں (ا) ہر ایک وقوعہ کا سبب ضرور ہے - (ب) کافی اور شافی سبب ہے - (ج) جس وقوعہ میں علاماتِ قصد اور مقصد نظر آتے ہیں اُس کا باشعور سبب ہے + نیچر میں واقعی نظم و نسق اور انجام پایا جاتا ہے اور اسی واسطے نیچر کو نظام قدرت بھی کہتے ہیں انجام سے یہہ مراد ہے کہ باوجودیکہ مختلف وسائل باہمی اتحاد و ارتباط سے ایسی نسبت رکھتے ہیں کہ اُن میں انجام پایا جاتا ہے + اور انجام کا پایا جانا عقل کا کام ہے مثلاً آنکھ کی ساخت اور ترکیب اس قسم کی واقعہ ہوئی ہے کہ وہ روشنی میں دیکھتی ہے آنکھ نے روشنی کو نہیں بنایا اور نہ روشنی نے آنکھ کو - ان دونوں میں ایک ایسی مناسبت ہے جو انجام پر دال ہے + جب وسائل نیچر جدا جدا وجود میں انجام کی تکمیل کی خاطر فراہم ہو کر اپنا عمل ظاہر کر رہے ہیں تو بھی استدلال کرنا فطرتی ہے کہ وسائل کے فراہم اور مرتب کرنے والا ایک باشعور عامل ہے + اور انجام اور وسائل کی خصوصیتوں کا ملاحظہ کر کے ہم عامل کے طریق عمل اور قصد کو دریافت کرتے ہیں + مثلاً مخلوق میں

انجام کی صورت نیکی اور حکمت کی دیکھ کر ہم نہ صرف ایسے وجود کو دریافت کرتے ہیں جو خالق محض ہی بلکہ جو دانا اور نیک حکیم بھی ہی +

انجام کی صورتیں چار قسم کی ہیں (۱) شعور کے خاص مختلف علامات جدا جُدا اجزا ہیں۔ یا یوں کہیں کہ علامات جزئی (ب) اجزا کل ہیں پا یا جانا۔ علامات کلی۔ (ج) نقشہ توحیدی (د) کل کا اتحاد وارتباط + پہلے میں آنکھ وکان وہاتھ وغیرہ کا جدا جدا مطالعہ اور اسی طرح نباتات وحیوانات ومعدنیات کا مطالعہ بھی چیزوں کی وضع وبناوٹ میں نظم ونسق کو ظاہر کرتا ہی + دوسرے میں کل باہم ملکر انجام کو ظاہر کرتے ہیں مفرد مرکب کے ساتھ تعلق رکھتا ہی۔ نباتات حیوان کے ساتھ اور حیوان انسان کے ساتھ۔ وغیرہ۔ انسان میں کل ادنیٰ اشیا شامل ہیں۔ اور مفرد دنیا میں حسابی اصول پائے جاتے ہیں +

تیسرے میں ادنیٰ اجزا کی بناوٹ کا وہی نقشہ دکھایا جاتا ہی۔ جو اعلیٰ میں پایا جاتا ہی یعنی پہر کہ مخلوق میں آثار الہی یا قیاس ربّانی ایک ہی پایا جاتا ہی + چوتھے میں اتحاد کل + اس میں آئین نیچر کا واحد ہونا اور اصول کا ایک ہی ہونا دکھایا جاتا ہی +

(۲) از روے **عقل** یعنی وضع اور بناوٹ ذہنی معہ اپنے تمام قواے اِس امر پر دال ہی۔ کہ اُسکا کوئی سبب ہی اور ایسا سبب جو کہ اُسکی بناوٹ کا مناسب حال اور شافی جواب ہی یعنی ایسا سبب جو ذہن کا نہ صرف علم رکھتا ہی بلکہ اُس کو بنا سکتا ہی + ذہن میں بعض مدامی اور لازم صداقتیں پائی جاتی ہیں اور اُن کے جواب میں قواعد اور اصول واقعی نیچر میں فعلی اور تحریکی صورت میں نظر آتے ہیں لہذا

اُن کا کوئی ایسا خالق ہی جو باشعور ہی+ پھر بطفیل ذہن مجھے اپنا ادراک ہی کیونکہ میں اپنا علم خودعلمی سے رکھتا ہوں+ اِس علم میں تین باتیں شامل ہیں۔ خود بطور موضوع۔ نہ خود بطور محمول۔ اور نسبت حکمی جو علاقہ دونوں میں ہی+ خودعلمی کا علم قطعی ہی کیونکہ اُس کا دریافت کرنا کسی عقلی طریق عمل سے نہیں ہی۔ بلکہ وہ ایسی حقیقت ہی جو ہر وقت سامنے موجود ہی پس جو حقیقت بیّن ہی وہ محتاج ثبوت نہیں ہی۔ میں ہوں ایک ایسے امر کی تصدیق ہی جو ثبوت کے لئے منطقی طریق عمل بصورت قضیہ شرطیہ کو نہیں چاہتا ہی بلکہ حقیقت بدیہی ہی+ خدا جو المطلق ہی وہ بھی ضرور اپنی ذات میں اپنیت یا خودی سے ممتاز ہی کیونکہ جب وہ روح ہی اور باشعور روح ہی اور علت العلل بھی ہی تو وہ بھی اپنا علم خودعلمی سے رکھتا ہی+ جب میں خود اپنیت رکھتا ہوں مگر اپنے سبب میں اپنیت منسوب نہ کروں تو ظاہر ہی کہ میں نتیجے میں سبب سے زیادہ صفات بیان کرتا ہوں جو ناممکن قیاس ہی+

یاد رہے کہ اپنیت یا خودی کا ہونا حالت منفردی میں مفہوم نہیں ہی+ منفردی تو مکان اور زمان میں پائی جاتی ہی اور اسی لئے محدود ہی مگر شخصیت کا علاقہ جو خودی کی ذات میں پایا جاتا ہی وہ زمان و مکان سے نہیں ہی بلکہ عقل اور ذہن سے ہی۔ جو خود کا ادراک خودعلمی سے کرتا ہی+ پس خدائے مطلق جو واجب الوجود اور اپنی ذات میں کامل ہی اور مکان اور زمان کے دائرہ سے منزہ اور مبرا ہی وہ ذات شخصی بہ معنی خودی رکھتا ہی+

(۳) ازروئے اخلاقی وضع۔ انسان کی اخلاقی ذات کی موافقت

تعلقات خارجی کے ساتھ عین موزوں ہی+اس علاقہ اور موافقت کا مقرر کرنیوالا
کوئی وجود ضرور ہی+علاوہ اسکے ہم واجب کا تصوّر اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو یہ
تصوّر اگر خدا سے نہیں ہی تو کہاں سے پیدا ہوا؟ پھر ذمہ واری کا خیال بھی ہمارے
ذہن و دماغ میں پایا جاتا ہی کہ ہم کسی کے جواب دہ ہیں۔ وہ کون ہی؟ پھر دنیا کا اخلاقی
ضابطہ دیکھنے میں آتا ہی۔ تو ضرور اسکا کوئی حاکم اخلاقی ہی+

بیان متذکرہ بالا کی تفصیل کے لئے اب ہم تیار ہیں اور یاد رہے کہ جو دلائل
اوپر جُدا جُدا بیان ہوئے ہیں اُن کو کسی قدر باہم ربط دیکر بیان کرینگے تا کہ عمل
اور نظر دونوں کو ساتھہ ساتھہ پیش کریں+

بابِ اوّل

فصلِ اوّل

نیچر کا مطالعہ نظری جسکو ہمارا ذہن استقرار و استخراج کے ذریعہ سے اپنے دخل اور تصرف میں لاتا ہے اُس کے اس طریق ملاحظہ سے خدا کی ہستی کے اثبات بخوبی روشن ہوتے ہیں۔ کیونکہ شہادات اثبات خدا کے خود اپنے طریقِ ظہور میں + مثلاً اُس کی قدرتِ کاملہ و حکمتِ بالغہ اور اُسکے طریق افعال جو جابجا اس نظام کائنات میں مثبت اور منقوش ہیں + اور اُن طریق ظہور کے مختلف صورتوں کی تشریح اور تاویل ہماری عقل بہت سی تحقیق اور تدقیق کے بعد کرتی ہے + خدا جو فوق النیچر ہے اُس کی نسبت ہم نے ظاہر کیا ہے کہ وہ کُل نیچر کا علت العلل بلکہ اُسکا اصل منبع اور سرچشمہ ہے پس اس صورت میں کل نیچر خدا کا ظہور ہے۔ کیونکہ نیچر کی ابتدا اُسی سے ہے اور اُسی سے یہہ سلسلہ قائم ہے + مگر یاد رہے کہ نیچر خدا کے ظہور کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ اُسکا ظہور نیچر میں پایا جاتا ہے اور فوق النیچر اپنا ظہور نیچر کے ذریعہ اور نیچر میں زیادہ کرسکتا ہے۔ تو اس صورت میں انقلابِ زمانہ میں ایک نئی طاقت کا دخلیاب ہونا ہے جس سے نیچر کی صورت میں ایک نئی طاقت ظہور پذیر ہوتی ہے تا کہ اُس کی بدولت مقصد اعلیٰ اور انجام برتر بن حاصل ہو +

فوق النیچر کے ظہور جن کی تشخیص و توضیح ہوسکتی ہے وہ تین نوع پر منقسم ہوسکتے ہیں +

(۱) وہ صورت ہے جس میں فوق النیچر نیچر میں داخل ہو کر اُس میں قائم اور جاری رہتا ہے مثلاً بیجان چیز میں جان کا آجانا اور اُس میں قائم رہنا اب یہہ جان نیچری طاقتوں اور صورتوں سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اپنی اصلیت کے لیئے ایک اعلیٰ طاقت کا مطالبہ کرتی ہے جو پہلے بیجان نیچر میں موجود نہ تھی + اسی طرح انسان دیگر حیوانات پر فوقیت رکھتا ہے اور گو اس کی ساخت و ترکیب میں نیچر کے اسباب پائے جاتے ہیں اور اس صورت میں مستعمل بھی ہیں مگر اعلیٰ طاقت کے دخل نے اعلیٰ استعمال کے لئے اُن اسباب کو ایک نئی صورت میں بدل دیا ہے +

(ب) وہ صورت ہے جس میں فوق النیچر ظاہر اور غائب ہوتا ہے + مثلاً جب نبوت بیان کیجاتی ہے تو اُسکے وسایل اور ذرائع نیچر میں پائے جاتے ہیں۔ نبی۔ کلام۔ امت مگر الفاظ نبوت وہ کچھہ ظاہر وانکشاف کرتے ہیں جو نبی نے از خود اختراع نہیں کئے ہیں بلکہ اُنکی اصلیت فوق النیچر ہے + اب نبوت تو قائم رہتی ہے مگر وہ طاقت جس میں وہ نبوت بیان ہوئی ہے ورا ثتاً قائم نہیں رہتی + جان کا جب مادہ میں ایک دفعہ دخل ہوا تو وہ نیچر ہو کر اپنا سلسلہ جاری رکھتی ہے۔ مگر نبوت جاری نہیں رہتی ہے + اسی طرح معجزات بھی وقوع میں آئے مگر سلسلہ نیچر میں جاری نہیں رہے +

(ج) وہ صورت ہے جس میں فوق النیچر نیچر میں داخل ہو کر قائم رہتا ہے اور علیحدہ بھی ہو جاتا ہے مثلاً مکاشفہ + اِس میں ایسی صداقتوں کا انکشاف ہے جو انسانی عقل کی کہنہ سے بعید اور فوق العقل ہیں۔ اور اُنکی اصلیت محض فوق النیچر ہے + کتب مقدسہ تو موجود ہیں اور فوق النیچر بھی ایک صورت میں نیچری طور پر اُن میں موجود ہے

مگر اُن کی صداقتوں کو جاننے اور عمل میں لانیکے لئے زیادہ تر عرفانِ الٰہی اور معرفت کی ضرورت ہی یعنی جو پہلے وحی کی صورت میں اعلان ہوا وہ مضمون از سر نو مومنین کے دلوں میں ظاہر کیا جاتا ہی۔ تاکہ فوق النیچر کا تعلق اُن کے ساتھ ہمیشہ قائم رہکر اُنکی زندگی کو غائت مطلوبہ تک پہنچائے + خدا کا جاننا کہ وہ ہی اور کیا ہی؟ بذریعہ اُسکے مختلف ظہورات کے معلوم ہوتا ہی + یہہ تو ضمناً بیان کیا گیا ہی +

پہلی دلیل جو انسان بذریعہ مطالعہ خارجی اشیاء دریافت اور حاصل کرتا ہی وہ از روئے ترتیب نیچر ہی + واقعی نیچر میں جو ترتیب نظر آتی ہی اُس سے خدا کا جلال اور حشمت آسمانوں پر اور اُس کی صنعت اور بداہت زمین پر۔ اور اُسکے افعال انسانی روح میں اور اُسکا طریق برتاؤ اقوام میں پایا جاتا ہی + یہہ ایسے حقائق اور معارف الٰہی ہیں اُن پر یہی معقولی استدلال کرنا پڑتا ہی کہ یہہ آثار و علامات افعال الٰہی ہیں + ہماری عقل ایک آلۂ دریافت ہی۔ اِس لئے نیچر میں جو آثار و افعالِ الٰہی نظر آتے ہیں اُن کو وہ بخوبی دریافت کرسکتی ہی۔ کیونکہ افعال مذکورہ مختلف ظہور نیچر میں خدا ہی کے ہیں + اور عقل خدا کے ظہور کو اُس حد تک دریافت کرسکتی ہی جہانتک خدا کا ظہور نیچر میں پایا جاتا ہی + نیچر میں طاقتیں اور ترتیب اور آئین وغیرہ مشاہدہ میں آتے ہیں + اور انسانی روح اور وضع اور انسانی تواریخ میں حکمت اور دانائی عیاں ہی + اسپر عقل کا یہہ لازمی تقاضا ہی کہ وہ علت کو دریافت کرے اور وہ علت کو اِس بنا پر تلاش کرتی ہی کہ ہر ایک حادثہ یا صورت تبدیلی جو مفرد اور مرکب چیزوں میں پائی جاتی ہی اُس کا کوئی معقول اور مناسب حال سبب ہی + مزید براں جب تبدیلی میں ترتیب اور حکمت

حکم رکھتی ہی تو علت کے وجود میں وہ صفات ضرور موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ معلول
میں ظہور پذیر ہوری ہیں + علاوہ بریں جب ہماری عقل مخلوقات کے مختلف اور جداگانہ
چیزوں میں نظم و نسق کو بھی شامل حال ملاحظہ کرتی ہی جسکی وجہ سے وہ چیزیں باہمی
حرکاتِ مرکب سے ایک صریح غائت مطلوبہ کو مدنظر رکھتی ہیں تو زیادہ تر ایک ایسے زندہ
وجود کا یقین دل میں پیدا ہوتا ہی جو نیچروں کے حرکات سے جداگانہ اپنی ذاتی ہستی
رکھتا ہی + مثلاً جب کان اور آنکھہ وغیرہ اعضاء انسانی کا بغور و تعمق ملاحظہ کیا جاتا ہی +
تو اُنکی ساخت اور ترکیب میں مقصد اور انجام نظر آتا ہی + کان میں ہر ایک قسم کی آواز
پُہنچتی ہی خواہ توپ و تفنگ کی آواز بھی کانوں میں گونجے ۔ تاہم اُسکو کوئی ضرر
یا صدمہ نہیں پُہنچتا + اور آنکھہ کی وضع بذریعہ غلاف نیچے اوپر کے اور پلکوں اور بھوؤں
کے محفوظ ہی اور باوجود لطیف اور نازک ہونیکے نہ تو بہت روشنی کی تیز شعاعوں کا
دخل اندر ہونے پاتا ہی اور نہ سر کا پسینہ آنکھوں تک آتا ہی ۔ اور حسب ضرورت کُھلتی اور
بند ہوتی ہیں + اسی طرح دیگر جاندار اور بے جان چیزوں کی ترکیب اور ساخت میں
مقصد اور انجام پایا جاتا ہی + خواہ اس حقیقت کا کوئی ایک سبب یا کئی ایک اسباب
بتائے جاویں مگر آخرش یہہ تسلیم کرنا لازم ہی کہ اُنکی ساخت اور ترکیب میں دوراندیشی
اور شعور سے کام لیا گیا ہی ۔ نہ یہہ کہ نیچر کی حرکات میں اچانک حکمت دخلیاب ہوئی +
ہم اس مشاہدہ کے قابل ہیں کہ ہر ایک چیز کا اول انجام خصوصیتی ہی ۔ اور ساتھہ ہی
انجام خارجی بھی ہی + انجام خصوصیتی کی مثال یہہ ہی کہ جسم وکا جزو کے ساتھہ ایسا
مناسب علاقہ ہی کہ اُس میں انجام کو مدنظر رکھا ہی + مثلاً آنکھہ کی بناوٹ اس قسم کی

ہی۔ کہ دیکھنا اُسکا انجام ہی انجام خارجی کی مثال یہہ ہی۔ کہ اندرونی انجام کے علاوہ اُس جزو کا کل بدن کے ساتھہ علاقہ ہی جو اُسکے مقصدی کام کو ظاہر کرتا ہی + مثلاً آنکھہ کا دیکھنا کام ہی۔ مگر اُس کا علاقہ بدن سے ہی جس میں علاوہ آنکھہ کے دیگر اعضا بھی شامل ہیں + اسی طرح بدن کا علاقہ دیگر اشیاء سے ہی اور مادے کا مادے سے علاقہ ہی۔ اور اس دنیا کا اجرام فلکی کے ساتھہ۔ سیاروں کا سیاروں کے ساتھہ۔ حتّٰی کہ کل کائنات ایک عظیم توحیدی مرکز نظر آتا ہی + پس عقل کو بجز اسکے اور کچھہ تسلیم نہیں کرنا پڑتا کہ نیچر میں یگانگت کا پایا جانا اُس الٰہی حکیمانہ نقشہ کے مطابق ہی جو ازل سے خدا میں موجود تھا اس واسطے یہہ استدلال کرنا صحیح ہی کہ نظام قدرت کا علت ایک ایسا وجود رکھتا ہی جو باشعور اور بالارادہ ہی + اس بیان کے متعلق یہاں بطور ضمن یہہ بھی کہنا ضروری ہی۔ کہ مادہ خود مخلوق کی قسم سے ہی + گو یہانتک محض ترتیب کا ذکر ہوا ہی تاہم مادہ بلکہ مادہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی بجز ترتیب کے پایا نہیں جاتا ہی + بفرضِ تسلیم مادہ کا وجود بغیر ترتیب بھی ثابت ہو۔ تو کیا وہ خالق عظیم جو اپنی حکمت اور دانائی سے مادہ کو ترتیب دیتا ہی اُس کے بنانے پر قادر نہیں ہی؟ پھر مادہ میں وہ کونسی خصوصیت ہی جو ازلی قرار دی جاوے؟ ظاہری مادہ از قسم وجود نہیں ہی۔ اُسکی اصلیت و ماہیّت کو جو مادہ کے ظاہر ہونیکا باعث ہی کسی محقق باریک بین نے بیان نہیں کیا ہی۔ مادہ میں طاقتیں موجود ہیں۔ آیا یہہ مقدم ہیں۔ یا مادہ کا کوئی اور جزو مقدم ہی کوئی بیان نہیں کر سکتا ہی + اگر مادہ مجموعۂ قواے ہی۔ تو قواے از قسم حرکات ہیں۔ اور وہ سبب کا مطالبہ

کرتی ہیں + مگر حقیقت میں مادہ کا ہر ایک ذرہ بصورت ترتیب نظر آتا ہے بے ترتیب
ذرہ آجتک دیکھنے میں نہیں آیا + ہاں کتب مقدسہ کی شروع کتاب میں بیان ہے۔
کہ زمین ویران اور سنسان تھی عبرانی میں ہیں توحو اور بوحو معنی موجود
نہ ہونا آیا ہے۔ تو سنسان اور ویران ہونے سے یہہ مراد ہے کہ بروقت مخلوق اُنکی
کوئی شکل یا صورت نہیں تھی پیدائش کی کتاب میں اول مادہ کی اصولی پیدائش
کا بیان ہے + چنانچہ مرقوم ہے۔ کہ "ابتدا میں خدا نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا"۔
لفظ مادہ عبرانی میں مستعمل نہیں ہے۔ اُس کی جگہ دو الفاظ زمین اور آسمان استعمال
ہوئے ہیں۔ اس اصولی پیدائش کی ابتدائی حالت ویران اور سنسان تھی۔
اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آسمان اور زمین کا پیدا ہونا یہہ ظاہر کرتا ہے کہ
مادی چیزوں کا آغاز زمانہ میں ہوا ہے +

کیونکہ اگلے بیان میں ابتدا کا واؤ عاطفہ کے ساتھہ شروع ہونا یہہ تصدیق کرتا
ہے کہ کائنات کا ابتدائی وجود میں آنا خدا کا اصلی فعل تھا + پہلے مادہ ویران اور
سنسان حالت میں تھا اور بعد میں روشنی نے اُس میں دخل پایا جس کے طفیل
مادہ کا ابتدائی متحرک ہونا بیان ہے جس سے کُل کائنات ترتیب کی صورت میں مرکب
ہوئی + سائنس کے بنولے یہی ہیں + خلق کے لئے عبرانی لفظ باڑا استعمال ہوا۔
جو معنی بدیع یعنی عدم سے وجود میں آنا۔ یہہ لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے۔ پہلی آیت
میں جہاں آسمان اور زمین کا مخلوق ہونا بیان ہوا ہے۔ پھر پانچویں دن کی ذیجان
پیدائش کے لئے بھی لفظ باڑا استعمال ہوا ہے اور باقی مقاموں میں جہاں مخلوق

کے محض صورت بدلنے کا یا مادہ کے تصرف کا بیان پایا جاتا ہی۔ مثلاً دوسرے اور چوتھے دن
کی پیدائشوں کے ذکر میں جہاں اُسی قسم کی مخلوق کا جاری رہنا بیان ہوا ہی۔ مثلاً زمینی
ذی جان کے بیان میں وہاں پر لفظ عاشہ بمعنی بنانا استعمال ہوا ہی۔ الحاصل لفظ
باڑا وجود کے تین طبقوں میں مستعمل ہوا ہی یعنی مادی دنیا کی پیدایش کے لئے۔ جان کی
پیدائش کے لئے۔ اور روح کی پیدایش کے لئے + علاوہ ازیں لفظ باڑا خاص خدا کے
فعل کے ہی لئے کل کتب مقدسہ میں استعمال ہوا ہی۔ اور آدمی کے فعل کے لئے استعمال
نہیں ہوا ہی پس فعلِ پیدایش ایک صریح معجزہ ہی علم طبیعات اپنا بیان کسی موجودہ مصدقہ
جملہ سے شروع کرتا ہی اُسکا اصولِ بیان عدم سے شروع نہیں ہوتا بلکہ واقعات سے
شروع کرکے وہ علاقہ اشیاء ظاہر کرتا ہی + یعنی اسکی علمی بنا حقیقت اور واقعات پر ہوتی ہی۔
اُسکا کام حقیقتِ اشیاء کا بیان اور شرح کرنا ہی + مگر پیدائش کی کتاب کا قطعی بیان مادہ
وغیرہ کی نسبت یہہ ہی کہ وہ مخلوق ہی + مادہ کی اصلی صورت گیس کی سی تھی جسکو بےشکل اور
غیر مرئی کہنا بجا ہوگا گیس کا بقاعدہ پھیل جانا اُسکا ایک خاصہ ہی چنانچہ اسکی تصدیق
یہں لکھا ہی۔ کہ زمین ویران اور سنسان تھی + کیونکہ واقعی گیس دیکھنے میں نہیں آتا اور
پھر مرقوم ہی کہ گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ یہہ بھی سچ ہی کیونکہ ابھی تک مادہ بےحس
اور بےحرکت حالت میں تھا۔ اور وہ حرکت جس کی بدولت اُس میں وہ جسمانی اور
کیمیائی طاقتیں عمل میں آویں اور اُن میں اُجالے کو پیدا کریں موجود نہ تھی + اور یہہ جو
لکھا ہی کہ گہراؤ کی اوپر یہہ بھی بامعنی ہی کیونکہ مادہ گیس کی حالت میں ہونیکی وجہ سے
ابھی تک مکان میں بقاعدہ پھیلا ہوا تھا۔ یہہ نہیں کہ بےحد پھیلا ہوا تھا بلکہ یہہ کہ اُس

کی لمبائی اور چوڑائی کا اندازہ ہو سکتا تھا اور پھر لکھا ہے کہ "خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی" یعنی خدا کی روح مادہ مذکور کو جو بحالت گیس تھا حرکت دے رہی تھی۔ اُس تدبیر کے مطابق جو اُن چھ پیدائشی زمانوں میں ظاہر ہونے والی تھی واقعی اگر معدنیات اور نباتات اور حیوانات کا بنظرِ غور ملاحظہ کیا جاوے تو ظاہر ہوگا کہ وہ کل اجسام مرکبہ ایسے طریقہ اعمال کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں جو اُن کی اصلی اور ابتدائی حالت پر دلالت کرتا ہے یعنی جسقدر حالتِ مرکبہ سے اُن کو حالت انفرادی میں لایا جاوے تو آخرش اُن کا وہ چند ایک عناصر ہونگے۔ جو کہ کل اجسام کی اصل ہیں چنانچہ نیچر کے کل اجسام کی تین حالتیں ہیں ٹھوس۔ مائع۔ گیس سب سے لطیف گیس ہے بڑے سے بڑے محقق نے مادہ کو کم سے کم لطیف کرتے ہوئے حالت گیس تک پہنچایا ہے اور یہہ امر تصور کرلیا ہے کہ مادہ کی ابتدائی حالت گیس ہوگی۔ مگر الہامی کتاب سے ہی یہہ منکشف ہے کہ یہہ گیس ابتدائً پیدا کی گئی +

پھر جب ترتیب سے استدلال شعور کی یکجائی ہے تو مادہ کے ادنیٰ ایٹم کا کوئی بھی حصہ یا ذرہ ایسا نہیں ہے۔ جو شانِ عقل سے خالی ہے مگر کہا جاتا ہے کہ مادہ بھی علاوہ روح کے ازلی ہے تو گویا روح اور مادہ دو چیزیں ازلی ہیں مگر مادہ تو ہمیں ترتیب کی صورت میں نظر آتا ہے تو جس نے مادہ کو مرتب کیا وہ مادہ سے متقدم ہے پھر کیوں مادہ قدیم مانا جاوے علاوہ ازیں قانون اختصار بہت سے اسباب کی جگہ ایک ہی کافی اور مناسب حال سبب کو چاہتا ہے تو جب شعور صریحاً ترتیب کا کافی سبب نظر آتا ہے۔ تو وہ کونسا امر مانع ہے کہ وہ مادہ کی خلقت کا کافی سبب ہو؟

علاوہ اسکے ایک اور تصور بھی مادہ کے بارہ میں پیش ہوتا ہی جسکو نیبولر تھیوری کہتے ہیں اس تصور کے مطابق مادہ کی مقدم اور اصلی حالت نہایت لطیف تھی۔ مگر اب بتدریج اپنی اندرونی حرکات اور قوای کے ذریعہ سے وہ موجودہ ترتیبی صورت میں آگیا ہی مگر قبل ازیں کہ وہ موجودہ ترتیبی صورت میں آیا ہو ضرور اُسکے سبب میں وہ سب طاقتیں موجود تھیں جو نتیجے میں ظہور پذیر ہوئیں اگر نہیں تو ظاہر ہی کہ نتیجے میں سبب سے زیادہ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو محال مطلق ہے۔ علاوہ اسکے یہہ دریافت کرنا بھی لازم ہی کہ بے شعور نیبولا کو ترتیب کے پیدا کرنیکا شعور کہاں سے حاصل ہوا؟ آنکھ کھوپری میں کیوں پائی جاوے اور پاؤں میں نہ پائی جاوے؟ کیوں ہر موقعہ اور ہر حالت اور ہر زمان و مکان میں نیچر متواتر باضابطہ اور با قاعدہ ہی نظر آئے؟ کیوں تصور نیبولا ہر ایک فعلِ نیچر کو حکمت کے طریقہ پر ہی ظاہر کرے؟ اسکا جواب آجتک کسی محقق نے نہیں دیا ہی+

خدا کی شناخت کے لئے انسان کا طریق عمل وہی ہی جو وہ خود اپنے لئے استعمال کرتا ہی انسان اپنے افعال کی حد میں بالارادہ ہی اور وہ اپنے کو اپنے افعال کا سبب جانتا اور مانتا ہی۔ اُسکی بناوٹ میں یہی اصل اور مبداء اُس دلیل کی ہی جو علت معلول کی صورت میں چیزوں کے مشاہدہ اور ملاحظہ سے اُس میں پیدا ہوتی ہی جب انسان خود مختار ہی اور نظامِ قدرت معلول کی صورت میں اُسکو نظر آتا ہی تو اُسکا علت کون ہی؟ یہہ ہوسکتا ہی کہ حرکاتِ نیچری میں ہی علی الترتیب ایک سلسلہ علت و معلول کا دکھایا جاوے مگر اطمینان ہرگز حاصل نہ ہوگا جبتک کہ عقل کا فرار اور قیام

علت العلل پر ہو۔ ہم مدارج اسباب نیچر کو تسلیم کرتے ہیں مثلاً علت فاعلی علت مادی علت صوری وغیرہ۔ مگر دور و تسلسل سے بچنے کے لئے لازم ہوگا کہ نظامِ کائنات کے سبب در سبب دریافت کرتے ہوئے قیام علت العلل پر ہووے۔ جو معلولات کا اول اور آخر سبب ہی۔ مگر علاوہ علت ہونے کے خدا نیچر کا دانا حاکم بھی نظر آتا ہی۔ جیسے اپنے میں ارادہ کا موجود ہونا دیکھ کر ہم خدا کی طرف بھی ارادہ منسوب کرتے ہیں۔ ویسے ہی جب ہم ذی عقل ہیں اور ہماری عقل کے ہر ایک کام میں شعور اور حکمت پائی جاتی ہی تو عقل کا یہہ لازمی تقاضا ہی کہ وہ خدا کو بھی دانا اور عاقل سمجھے۔ نیچر میں قویٰ اور طاقتوں کو دیکھ کر تو شانِ علت کی نظر آتی ہی اور حکمت اور دانائی کا مشاہدہ کرکے علت کی شان باشعور تسلیم کی جاتی ہی۔ اسلئیے نیچر میں ترتیب اور قاعدوں اور ضابطوں کے پائے جانیکا سوائے خدا کے کوئی اور معقول اور مناسب حال سبب نہیں ہی اور مخلوق میں نیک انجام ملاحظہ کرکے بھی استدلال کرنا پڑتا ہی کہ نیچر کا باشعور علت نیک اور رحمان بھی ہی +

جو دلیل از روئے ترتیب نیچر حاصل ہوتی ہی اب ہم کسی قدر اُس کا مفصل بیان کرتے ہیں۔ کل نظامِ قدرت میں ترتیب نظر آتی ہی جو ترتیبی انتظام ہم اپنی موجودہ آنکھوں سے بھی بلا امداد دوربین یا خوردبین دیکھ سکتے ہیں اُس کی بذریعہ آلاتِ سائنس اور بھی زیادہ تر وضاحت و صراحت ہو سکتی ہی۔ یہہ ترتیب جیسے اجرام فلکی میں پائی جاتی ہی ویسے ہی درخت کے پتے اور پرند کے بازو کی ساخت میں بھی نظر آتی ہی۔ اور انسانی تواریخ کے کل زمانوں میں اور زمینی طبقات

کے تہوں اور گذشتہ اور موجودہ حیوانی پنجروں کی وضع اور ساخت میں اور نیز زمانہ ہائے
اجرام فلکی میں بھی یہی ترتیب اور ضابطہ نظر آرہا ہی اور محقق الاشیاء کا یہی کام اور
استحقاق ہی کہ وہ نظام قدرت میں ترتیب کو دریافت کرے اور اُن کی تشریح
باوضاحت دکھائے۔ مگر یاد رہے کہ جہاں ترتیب مشاہدہ میں آتی ہی وہاں فکرو
شعور سے کام لیا گیا ہی اور واقعی کل آئین نیچر اور اُن کا اجرا ایک باشعور علت
کی شہادت دے رہے ہیں۔ دو قسم کے قواعد ترتیبی نظر آتے ہیں عام و خاص
ترتیب عام میں قاعدہ کی پابندی اور وقت کی قید پائی جاتی ہی مثلاً اجرام
فلکی میں اور ترتیب خاص میں آراستگی اور تفریق بندی اور انتظام پایا جاتا ہی
مرکب چیزوں میں نیچر کا وہ حصہ جو بظاہر غیر مرکب یا مفرد ہی اُس میں قاعدے کی
پابندی اور وقت کی قید پائی جاتی ہی جس سے ایک سلسلہ اجرائے قانون کا قائم
ہوجاتا ہی۔ اور مرکب نیچر میں صریح ترتیب اور ضابطہ ملاحظہ میں آتا ہی جو انجام
اور مقصد پر دلالت کرتا ہی۔ اگر پہلے میں ہمتائی اور یکتائی کا قاعدہ نظر آتا ہی تو دوسرے
میں ایسی یگانگت پائی جاتی ہی جو انجام پر دال ہی۔ اجرام فلکی کے مطالعہ سے
یہہ ظاہر اور منشرح ہوتا ہی کہ اُنکی ترقی اور قیام کی صورت حساب اور قاعدے
کے ساتھہ جاری ہی گویا یہہ معلوم ہوتا ہی کہ اقلیدس کے ادق مسائل حل کئے گئے
ہیں اور ان میں عدد اور تناسب کا حساب بھی شامل ہی اور یہی وجہ ہی کہ اُن کی
باقاعدہ گردشوں سے ایک سلسلہ اجراء قانون کا برآمد ہوتا ہی + اسی طرح جب
اشیاء ارضی کا ملاحظہ کیا جاتا ہی تو جزو کا جزو کے ساتھہ اور اُن کا کل کے ساتھہ اور

کل کا باقی اشیاء کے ساتھہ ایک ایسا نازک اور باریک تعلق اور رابطہ نظر آتا ہی کہ جس کے مشاہدہ سے یہی استدلال کیا جاتا ہی کہ ان اجزا میں اتفاق اور اتحاد کا ایسا سلسلہ قائم کرنا کہ جس سے کل باہمی ربط وضبط سے ایک خاص غایت مطلوبہ کو مدنظر رکھیں ہیہ ضابطہ بجز عقل کامل قائم نہیں ہوسکتا ہی پھر اس مادی دنیا کے قواعد بھی حسابی نظر آتے ہیں کشش ثقل جوادنیٰ اور اعلیٰ اور وزنی اور ہلکے مادہ میں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی دور فاصلہ پر کیوں نہ ہو برابر عمل کرتی ہی۔ وہ ایسے حسابی قانون کے زیر حکم ہی جس کی تعریف اور تحدید ہوسکتی ہی۔ مثلاً اجرام فلکی کی گردشیں جو زیر حکم اس قانون کے پیدا ہوتی ہیں اور جن گردشوں سے وہ مختلف شکلیں تصوری دائروں کی بنتی ہیں۔ جن کا بیان کانک سیکشن (مخروطی اجسام کی پیمایش) میں پایا جاتا ہی اُن کا اندازہ اور مقدار بھی ہی اور حجم بھی پھر وہ قانون جو کیمیائی ترکیبی چیزوں پر حکم رکھتا ہی جس کے طفیل سے کل مادی دنیا متعدد عناصر سے ظاہر اور موجود ہوئی ہی اُس میں بھی حساب کو پورا پورا دخل ہی کیونکہ ایک عنصر دوسرے سے ایک خاص اندازہ اور قاعدہ سے مرکب ہوتا ہی حساب کے قواعد کا ماخذ تو محاسب شمار کیا جاتا ہی مگر اُس کے قواعد نیچر میں عملدرآمد نہ ہوں تو لاحاصل اور بے سود ہیں کیونکہ اگر نیچر بے سروپا اور بے قاعدہ ظاہر ہو تو حسابی قاعدوں کے عملدرآمد کے لئے جو انسان اپنے ذہن وفہم سے اختراع کرتا ہی کوئی گنجائش نہیں ہوگی یسعیاہ نبی نے کیا سچ کہا ہی "کس نے پانیوں کو اپنے ہاتھہ کے چلو سے ناپا ہی اور آسمان کو بالشت سے پیمایش کیا اور زمین کی گرد کو

پیمانہ میں بھرا اور پہاڑوں کو پلڑوں میں ڈال کے وزن کیا اور ٹیلوں کو ترازو میں تولا"
(۴۰ : ۱۲) نیچر میں وزن اور پیمانہ اور علم ہندسہ کا باقاعدہ پایا جانا سراسر عقل وشعور کا
کام ظاہر کرتا ہے۔ دنیا میں میزانی قوانین کے پائے جانیکا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا
سوائے اسکے کہ خالق خود میزان کے قواعد کا چشمہ اور معدن ہے۔ کل خلقت میں قانون
کی صورت نظر آتی ہے یا یوں کہا جائے کہ کل نیچر میں قانون کا تسلط ہے۔ علاوہ ازیں
تمام اشیاء مفید مطلب نظر آتی ہیں جو خدا کی نیکی کو ظاہر کرتی ہیں۔ آنکھ، کان، بازو
وغیرہ کی ترکیب اور ساخت میں کیفیت اور انتظام پایا جاتا ہے گویا پہلے جدا جدا اعضاء
فراہم کئے گئے اور پھر ان کی تفریق بندی کی گئی ہے اور پھر مناسب طور پر آراستہ اور
پیراستہ کئے گئے ہیں۔ پھر مفرد اشیاء مرکب سے وابستہ ہیں۔ مادہ نباتات کے ساتھ
اور نباتات حیوان کے ساتھ اور حیوان انسان کے ساتھ مربوط ہیں۔ حتیٰ کہ انسان
میں کل ادنیٰ چیزیں شامل ہیں۔ اس طرح وہ مخلوق کا سردار سمجھا گیا ہے اور اشرف المخلوقات
کے نام سے نامزد ہے۔ پھر زمین ایک سیارہ ہے اور دیگر سیاروں سے اس کا بھاری
علاقہ ہے اور سب ملکر سلسلہ نظام شمسی کہلاتا ہے جو بذریعہ قانون کشش باہمی حرکات سے
وہ کچھ نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ جنپر موجودہ زندگی کا دارومدار ہے مثلاً موسموں کا تغیر
وتبدل اور پھر ان سیاروں کا باہمی ارتباط بذریعہ کشش ایسا واقع ہوا ہے کہ ان کا
رخ ایک ہی مستوی تصوری سطح پر ہے یعنی ان کی گردشوں اور حرکات سے جو دوائر
بنتے ہیں ان تمام میں جھکاؤ واقعہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اپنی مناسب جگہوں
پر ثابت اور قائم ہیں اسکے علاوہ مختلف اجسام ارضی وفلکی جو زیر فرمان قانون کشش

ہیں وہ اُس کی تاثیر سے مختلف فاصلوں پر اس طور پر مرتب ہوئے ہیں کہ اُن کی مختلف شکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔ جو باقاعدہ قائم اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور اس لئے اُن کا حسابی اندازہ ہوسکتا ہے + کیونکہ سیاروں کی حرکات جو مکان سے علاقہ رکھتی ہیں اور اُن کی گردشیں جو زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں اُنکا علم ہیئت کا محقق پورا حسابی پتہ لگا سکتا ہے۔ اسی طرح علم کیمیا جو اجسام کی باہمی ترکیب کو بیان کرتا ہے اُس میں قانون انفصال اور ترکیب وغیرہ یہہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس میں اجسام کا مرکب اور اجزا میں تقسیم ہونا ایک مقررہ اندازہ اور مقدار کے ساتھ ہے۔ یہہ تناسب عناصر انسان کے فائدہ اور سہولیت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس اصول کے موافق اسوقت تک جو عناصر کی تفریق بندی ہوئی ہے۔ اس میں ساٹھ اصل اور مقدم عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہہ عناصر علاوہ ذاتی خواص رکھنے کے مختلف طور پر آپس میں خاص اندازہ اور مقدار کے موافق ترکیب پاکر ہزارہا دیگر مرکبات کو پیدا کرتے ہیں جن کی بدولت کل دنیا ایک خوش پیرایہ میں نظر آتی ہے کہیں تو فرحت بخش نسیم سحری اور کہیں خوشنما پھول اور سبزی۔ کہیں الماس اور کہیں کوئلہ۔ کہیں تریاق اور کہیں زہر قاتل اور یہہ سب کار آمد اور سودمند ہیں۔ لیکن اگر ایک بھی ان میں سے اندازہ سے تجاوز کرے۔ تو بجائے مفید ہونیکے سراسر نقصان کا باعث ہوگا۔ اسی طرح ٹھوس اجسام میں گو ظاہرا کوئی شکل وصورت باقاعدہ نظر نہیں آتی مگر حقیقت میں اُن کے اجزا بھی بذریعہ کشش انفصال ہندسہ شکلوں میں فراہم ہوئے ہیں۔ ازروئے علم طبعی دریافت ہوا ہے کہ سُر میں دو چیزیں عامل ہیں۔ آواز کی حرکت اور حسابِ ہندسہ۔ دیکھنے میں زاویہ اور حساب ہندسہ کا علاقہ ہے۔ بلکہ قانون کشش میں بھی حسابِ ہندسہ عامل ہے کیونکہ اُسکی تاثیر

بالمقابل فاصلہ کے نہ صرف گھٹتی جاتی ہی بلکہ اُسکا گھٹاؤ مطابق ایک خاص حسابی تخمینہ کے ہی یہی وجہ ہی کہ سیاروں کی گردشوں سے جو تصوری دائرے بنتے ہیں اُن میں جھکاؤ باقاعدہ واقعہ ہوا ہی۔ پھر ذیجان کی ترکیب اور ساخت میں توحیدی ڈھانچے کا نمونہ نظر آتا ہی جو ہڈیاں سمندر کی بڑی بڑی مچھلیوں کے بازوؤں میں پائی جاتی ہیں اور جو چپوؤں کا کام دیتی ہیں وہی تبدیل صورت ہوکر زمین کی گھیس میں پائی جاتی ہیں جن سے وہ زمین کھود سکتی ہی اور وہی چمگادڑ میں جو رات کو پرواز کرتی ہی اور وہی انسان کے ہاتھ میں جو بتوسل اُن کے کام وکاج کرتا ہی +

کل نیچر میں قانون کا تسلط عیاں ہی۔ جس کا پایا جانا انسان کے فطرتی تقاضا کے پورا کرنے کے لئے عین مناسب حال ہی۔ خدا تو نیچر کا علت العلل ہی مگر ثانیاً نیچر میں دیگر اسباب نتائج کے ساتھ وابستہ ہیں جنکو اسباب وسائل کہنا بجا ہوگا۔ سبب ثانی کے مفہوم کے لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ سبب کسی شی کا وہ ہی جو اُس شی سے بصورت تقدیم ایک ایسا علاقہ طاقتی وصف کا نتیجہ سے رکھتا ہی کہ بجز اُس کی موجودگی اور تحریک کے شی مذکور میں کوئی تبدیلی یا حرکت واقع نہیں ہوسکتی اور سبب فاعلی وہ ہی جسکے قصد یا ارادہ کو سبب شی ظاہر کرتا ہی۔ چنانچہ سبب ثانی کی صورت یہہ ہی کہ سبب کا تقدیم حالت میں بذریعہ اپنی اندرونی طاقت کے کسی شی کو تحریک دینا جسکے توسل سے نتیجے کا پیدا ہونا ممکن ہی۔ مثلاً گرمی کا آگ میں پایا جانا اسی طرح سبب تاخیری حالت میں وہ طاقت سبب مذکور کی ہی کہ عملاً نتیجہ میں ظہور پذیر ہو۔ مثلاً آگ کا سلگنا۔ ایندھن کا جلنا۔ دیگ کا گرم ہونا۔ اب اس سے ظاہر ہی کہ انسان کا یہہ ذاتی تقاضا ہی کہ

وہ نتیجہ کا مشاہدہ کرکے سبب کی بھی تلاش کرے اور جب سبب دریافت ہوا تو سبب کے
مناسب حال نتیجے کے نکلنے کی توقع رکھے۔ اس طرح وہ آئین نیچر اور اجراء قانون کو دیکھکر
علمی تجربہ حاصل کرتا ہی۔ ایک طرف تو اُسکا تقاضا جبلّی سبب کا مطالبہ کرتا ہی اور دوسری
طرف واقعی نیچر میں ایک سلسلۂ واقعات کا اُس باطنی اصول کے جواب میں حاصل ہوتا ہی
نیچر میں جو ضابطہ پایا جاتا ہی اُسکی وجہ یہی ہی کہ اسباب نیچر میں حکیمانہ مناسبت
اور انتظام پایا جاتا ہی جسکے طفیل سے نتائج علی الدوام باقاعدہ ظہور پکڑتے ہیں
اور اُن نتائج کے قواعد کا بخوبی ملاحظہ اور تخمینہ ہوسکتا ہی۔ اور جن کی بنا پر انسان آئندہ
کا باور کرکے اپنے تکمیل ارادہ کی پوری توقع کرسکتا ہی۔ اور پھر باطنی اصول کے مطابق
جو جواب نیچر میں انسان کو ملتا ہی اُس سے نہ صرف اُس کا علمی تجربہ بڑھتا ہی بلکہ اُسکو
کمال خوشی میسر ہوتی ہی۔ اور اُس کے باطنی قواء کو تقویت حاصل ہونے سے اُسکا
انسانی رتبہ اعلیٰ اور برتر ہوجاتا ہی۔ الحاصل کل مادی چیزوں میں ایک ایسی باہم
دیگر مناسبت نظر آتی ہی اور انجام پایا جاتا ہی کہ اُن کے عمل اور تحریک میں برابر علت
معلول کا سلسلہ جاری رہتا ہی جو آئین نیچر کے نام سے نامزد ہی اور آئین یہہ ظاہر
کرتے ہیں کہ نیچر کی طبیعت اور عادت میں ضابطہ اور اتفاق موجود ہی اور اُس میں
ضابطہ اجراء بھی پایا جاتا ہی جو برابر جاری اور قائم رہتا ہی اور اُس کے قائم رہنے میں
زندگی کے تمام کاروبار چلتے ہیں۔ کل نیچر کی حرکات میں یہہ دائمی اور قائمی ضابطہ
موجود ہی۔ اُن کے بیان کی توضیح کے لئے ضروری ہی کہ جو علاقہ اُن کا مادہ کے ساتھ
ہی۔ اُسکو مفصل شرح اور بسط کے ساتھ بیان کریں۔ نیچر کی حرکات میں عام قواعد موجود

ہیں۔ یا یوں کہیں کہ حرکات مذکورہ با قاعدہ عمل میں آتی ہیں۔ اگر ماہیت مادہ کا ملاحظہ
کیا جاوے تو اُس میں کئی ایک خواص پائے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف مکان میں پایا
جاتا ہے۔ اور نہ صرف چھونے سے مزاحمت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ اُس کا ایک یہہ خاصہ
ہے کہ ذرہ ذرہ کو بذریعہ کشش اتصال اپنی طرف کھینچتا ہے جس سے تمام ذرّے باہم فراہم
ہو کر ایک ٹھوس حالت کو باضابطہ اختیار کرتے ہیں یعنی اُس ٹھوس جسم کے اجزا فراہم
ہونے کی حالت میں کوئی نہ کوئی ہندسہ شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر مادہ میں آواتی
طاقتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کیمیائی طور سے مرکب ہونے سے مختلف مدارج
پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مادہ تین صورتیں اختیار کرتا ہے یعنی ٹھوس مائع۔
گیس۔ آواتی طاقتیں یہہ ہیں بجلی۔ آگ۔ روشنی وغیرہ۔ ان خواص کی موجودگی
کی وجہ سے اجسام ایک دوسرے میں تبدیلی کے پیدا کرنے کا حکم رکھتے ہیں۔
مگر یہ نہیں اٹکل پچو اور بے قاعدہ نہیں ہیں۔ بلکہ تبدلات جو ظہور میں آتے ہیں وہ
ایک خاص مقررہ حسابی اصول کے موافق ہوا کرتے ہیں اور خواص مذکورہ اس قسم
کے ہیں کہ اُن کی ایک خاص حد بندی مقرر ہے۔ وہ وزن بھی ہو سکتے ہیں اور
پیمائش میں بھی آسکتے ہیں۔ اجسام کا اس طرح سے باضابطہ اور باترتیب فراہم
ہونا بندوبست اور انتظام کو ظاہر کرتا ہے یہہ کام صریحاً عقل اور شعور کا ہے۔ مادی
اسباب جدا گانہ نہیں ہیں بلکہ بتوسل اتحاد باہم ملکر کام کرتے ہیں۔ جہاں دو
یا تین اجسام کا فراہم ہو کر کیمیائی ملاپ ہوگا وہاں نتیجہ کا خاص ایک سبب
نہیں ہوگا۔ بلکہ دو یا تین اجسام کے اپنے اپنے خواص کا باہمی مرکب ہونا سبب

ہوگا مثلاً زنگ کے لوہے میں پیدا ہونے کا سبب عام خیال میں ہوا کا لوہے پر متاثر ہونا ہی مگر حقیقت میں زنگ کا سبب دونو ہوا اور لوہے کا ایک خاص تعلق میں آنا ہی جس کی تحریک سے ہوا میں سے کچھ اکسیجن رہا ہوا اور لوہے میں سے کچھ اپنی اُس کی خاصیت - جو بصورت آمیزش کیمیائی حلول کو زنگ کی حالت میں لوہے پر پیدا کرتی ہی - اس سے مترشح ہی کہ جب کبھی لوہے اور ہوا کے فراہم ہونے کی وہی صورت اور حالت ہوگی تو ضرور نتیجہ زنگ کی صورت میں ظاہر ہوگا ۔ جس میں تین باتیں شامل ہیں - اوّل - خواصِ اجسام جو ایک دوسرے میں مرکب ہونے کی صورت میں تبدیلی پیدا کرنیکا مادہ رکھتے ہیں + مثلاً اکسیجن بعض حسابی قاعدوں کے موافق کاربن کے ساتھ مرکب ہوگی اور روشنی ضرور کسی خاص مقررہ حالت میں چاندی کو سیاہ کرنے کی تاثیر رکھیگی + دوم - سبب کا تعلق اپنے نتائج کے ساتھ بحالتِ متحرک یہہ نہ سبب اُسوقت پیدا ہوگی جبکہ دو یا تین خواص اجسام باقاعدہ فراہم ہوکر آپس میں مرکب ہونیکے لئے متحرک ہونگے مثلاً اکسیجن کا یہہ خاصہ ہی کہ وہ لوہے پر متاثر ہو مگر جب لوہا اور اکسیجن دونوں ملکر زنگ کو پیدا کرتے ہیں تو یہہ سبب کی مثال سمجھنا چاہئے اور یہی مثال آئین نیچر کی ہی - اور اُن کا اجرا تب ہی قائم ہی جبکہ متذکرہ بالا صورتیں موجود ہیں یعنی اُس صورت میں جبکہ دو یا تین اجسام کا باہمی رابطہ بدستور قائم ر(ہے) - سوم - قوانین عام یعنی بوسیلہ استقرا حقیقتوں کو مستنبط کرکے ایک عام قاعدہ جماعت بندی میں لانا جو سب پر حاوی ہو سکے مثلاً سورج کی شعاعیں نباتات پر متاثر ہوتی ہیں جن سے نباتات کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہی - وجہ تبدیلی نہ صرف

شعاعیں ہیں بلکہ خواص نباتات بھی ہیں۔ جو کیمیائی آمیزش سے اپنی شکل اور رنگ
بدلتے ہیں اور جب یہہ ملاحظہ کیا جاتا ہی کہ سورج کی شعاعیں روزمرہ نباتات پر متاثر
ہوتی ہیں۔ اور موسم گرما میں زیادہ تیزی اور شدت سے حتّٰی کہ نباتات کے رنگ کی
شکل وصورت بالکل بدل جاتی ہی تو روزمرہ کا مشاہدہ اُسکو ایک سلسلہ قوانین میں
لاتا ہی جسکے بدستور جاری رہنے کے یقین پر کل زندگی کا دارومدار ہی +

چنانچہ خدا نے نیچر کی چیزوں کو چار اقسام کے تعلقات میں آراستہ و پیراستہ
کیا ہی یعنی اول بلحاظ خواص مادہ۔ دوم بلحاظ وزن ومقدار۔ سوم بلحاظ مکان۔
چہارم بلحاظ زمان۔ اوّل اجسام کی آراستگی بہ وصف خواص۔ اُن کے باہمی مرکبات
سے نیچر میں دائمی اتفاق واتحاد پایا جاتا ہی کیونکہ اُنکی حرکات کی تاثیریں باقاعدہ عمل
میں آتی ہیں۔ مثلاً ہوا ہماری زندگی کے لئے ضروری ہی گو اس میں کئی ایک چیزیں
اکسیجن۔ نٹروجن۔ کاربن وغیرہ شامل ہیں۔ اگر اُن میں سے کسی ایک کی بھی غیر معمولی
زیادتی پائی جاوے۔ تو موجودہ زندگی فوراً معرض خطر میں آجاتی ہی۔ اکسیجن کو تو ہم
اپنے سانس میں لیتے ہیں جو خون کے کاربن کے ساتھہ مرکب اور مشترک ہوکر
کاربونک ایسڈ بن جاتا ہی۔ اور اس فعل کیمیائی سے جو حرارت پیدا ہوتی ہی وہ
ہمارے بدن کو متوسط درجہ تک گرم رکھتی ہی۔ جو سانس کہ ہم باہر نکالتے ہیں وہ
کاربن گیس ہوکر باہر آتا ہی۔ اور یہہ کاربن نباتات جذب کرلیتی ہی۔ اور اُس کے اجزا
میں مرکب ہوکر اکسیجن اور نٹروجن کو ایک درجہ متوسط تک رہا کردیتی ہی۔ یہی وجہ
ہی کہ اُن میں سے کسی کی کمی وبیشی ہونے نہیں پاتی ہی۔ بلکہ ہوا میں اُن کا ایک

خاص اندازہ اور مقدار بدستور قائم ہی جسپر تمام مخلوقات کی زندگی کا انحصار ہی جیالوجی
کے گذشتہ زمانوں سے یہہ ثابت ہی کہ آدمی کی رہائش گذشتہ طبقوں میں ناممکن
تھی مگر یہہ انتظام اور بندوبست خدا کا ہی تھا کہ اُس نے خلقت کو بتدریج اپنی ربوبیت
سے ایسا آراستہ و پیراستہ کیا جس سے انسان کی رہائش سطح زمین پر ممکن ہوئی - اسی طرح
بلحاظ مکان جنس کی مشترکات سے انسان افراد نوع کی جماعت بندی کرتا ہی اور ہر ایک
چیز اپنی اپنی مناسب اور موزوں جگہ میں پائی جاتی ہی - ذیجان کے اعضائے بدنی
عین مناسب جگہ پر مقیم ہیں - مثلاً آنکھ جیسے نازک آلہ کا کھوپری میں جگہ پانا بالکل
موزوں اور مناسب ہی - اسی طرح حیوانات اور نباتات کی تقسیم بھی مطابق حالتِ
آب و ہوا پائی جاتی ہی - بلکہ اجرام فلکی کا باہمی فاصلہ ایک دوسرے سے جیسا کہ چاہیئے
تھا ویسا ہی ہی - یہی وجہ ہی کہ نیچر میں ایک سلسلۂ اتحاد نظر آتا ہی - علما کا قول ہی کہ قانون
کشش میں جس قدر مربع فاصلہ دور ہوتا جاویگا اُسی قدر متضاد اور تناسب مقدار
سے اُس میں کشش کا گھٹاؤ واقعہ ہوگا - چنانچہ بفرض محال اگر موجودہ حالت کی نسبت
کچھ ذرا بھی کم و بیش فاصلہ پر ہو جاوے - تو سمندر کی موجودہ مد و جزر میں جس پر کہ
جہازرانی کی بنیاد ہی - اور موسمی ہواؤں کے تغیر و تبدل میں بالکل خلل آجاویگا -
اسی طرح بلحاظ زمان ہر ایک چیز کا ابتدا اور انتہا ہی - ایک وقت بیج بونے کا ہی اور
پھر اُسکے نشو و نما پانیکا اور ایک وقت ثمر کا - اگر ہم یہہ بھی تسلیم کریں کہ ادنیٰ سے اعلیٰ
ترکیب کا وجود ظہور پذیر ہوا ہی - تاہم خدا جس کے سامنے ازمنہ ثلاثہ آج کی صورت
میں ہی فی الآخر اُسی نے کمال انتظام کے ساتھ سب کچھ بنایا اور مرتب کیا ہی -

کیونکہ نیچر واقعی خدا کا جلال ظاہر کر رہا ہے +

فصلِ دُوم

نیچر کا تواریخی مشاہدہ

اِس فصل میں یہہ ظاہر کیا جاویگا کہ فوق النیچر کا تعلق نیچر کے انجام کی تکمیل میں صریحاً پایا جاتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ نیچر کی ترتیب اور ضابطہ کے باہمی اتحاد اور ارتباط میں علت غائی پائی جاتی ہے نیچر کے اندرونی مطالعہ سے اُس میں حکمت اور دانائی کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر انجام کے لحاظ سے فوق النیچر نیچر کو بہ اہتمام و انتظام رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے +

اوّل خلقت کی بناوٹ میں ظاہراً بعض نقائص مشاہدہ میں آتے ہیں جسپر اکثر کوتاہ اندیش اشخاص یہہ حجت پیش کرتے ہیں کہ نقائص کا خلقت میں پایا جانا خالق کی حکمت کاملہ پر دھبہ لگاتا ہے مگر یاد رہے کہ خالق خود مخلوق کے کام سے دست بردار نہیں ہو گیا ہے مخلوق کا پیدائشی کام ختم ہونے سے خالق کا تمام کام ختم اور بند نہیں ہو گیا ہے۔ بلکہ اُسکا تعلق مخلوق سے بدستور قائم ہے اور کتب مقدسہ میں جو یہہ لکھا ہے کہ خدا نے ساتویں دن آرام کیا اُس سے صرف یہہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے مخلوقی کام کو چھہ دن میں ختم کیا اور اب اُس کا کام مخلوق کے انجام اور اخلاقی دنیا سے وابستہ ہے۔ جیسے پہلے بیان ہوا کہ مخلوق کے

کام میں علت غائی پائی جاتی ہی جسکو انتہا تک پہنچانیوالا وہی خالق ہی جو نیچر کا
علت العلل بھی ہی۔ مگر جو نقائص بیان کئے جاتے ہیں وہ صرف ایک ظاہری صورت
میں نقص کی حالت میں معلوم ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت وہ نقائص نہیں ہیں بلکہ
ہماری غلط فہمی ہی۔ مثلاً طوفان۔ زلزلے۔ اور چاند کا دائمی طور پر بحالت بدر نہ رہنا
یہہ نقائص بیان کئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہہ ہی کہ ہمارا علم نیچر کے بارے میں ایسا
محیط اور کامل نہیں ہی کہ جو کچھہ ہم اُس پر رائے زنی کرکے بطور شہادت کے پیش کریں
وہ ضروری مستند اور معتبر متصور ہو۔ جب یہہ امر مسلمہ ہی کہ کل نیچر میں شعور کے آثار پائے
جاتے ہیں تو اُسکے کسی خاص حصہ میں ظاہرا کوئی نقص دیکھہ کر یہہ نتیجہ برآمد نہیں
ہوسکتا ہی کہ اُس میں واقعی نقص موجود ہی بلکہ یہہ مان لینا زیادہ تر زیبا اور موزوں
ہوگا کہ ہمارے علم کا دائرہ ابھی ایسا وسیع نہیں ہوا ہی کہ کل نیچر پر حاوی اور محیط
ہوجاوے۔ پس نقص کا نظر آنا ہماری کم علمی اور ناواقفیت کا ثبوت ہی۔ گو طوفان
اور زلزلے کا وقوعہ کسی خاص جگہ میں کوئی فائدہ ظاہر نہ کرے مگر اُنکا علاقہ اُس
خاص جگہ سے ہی نہیں ہی بلکہ نیچر کے دوسرے حصوں سے بھی منضبط اور متعلق ہی۔
جہانتک گذشتہ زمانوں کی حقیقت دریافت کی گئی ہی۔ طوفان اور زلزلوں کا ایسا
کام ظاہر ہوا ہی جو خالی از مطلب نہ تھا۔ اور چاند کا کام صرف روشنی پہنچانا ہی
نہیں ہی۔ بلکہ اُس کے کئی اور کام بھی ہیں۔ چنانچہ جوار بھاٹا کے پیدا کرنے کا
سبب ہلال اور بدر کی حالتوں میں چاند ہی کی حرکات ہیں۔ پس یکطرفہ نظر
دوڑانے سے نقص معلوم ہوتا ہی کیونکہ نیچر کے کل کام پر ہمارا علم حاوی اور محیط نہیں

ہی۔ ہمارے لئے عجز اور انکسار ہی شایاں اور زیبا ہی اور یہہ بھی یاد رہے کہ نیچر کے کل
کام ترقی تبدیل صورت میں نظر آتے ہیں اور ہمارا علم نسبتاً ہی نہ کہ مطلقاً اور جسقدر ہمارا
علمی تجربہ بڑھتا ہی اُسی قدر ہماری خوشی کے سامان بھی بڑھتے نظر آتے ہیں اور ہماری
زندگی کی علت غائی یہی ہی کہ ہم اپنے تمام قواء سے حتی المقدور خدا کا جلال ظاہر
کریں۔ ہاں بیشک خدا جسکے سامنے از منہ ثلاثہ آج کی صورت میں ہی وہ تو علم کل
رکھتا ہی۔ مگر اُس کے علم کا ظہور نیچر میں بہ مدارج ہی +

دُوم۔ دنیا میں درد اور دُکھ اور مصیبت کو دیکھ کر خدا کی نیکی اور شان پر
دھبہ لگاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ دُکھ کا ہونا داخل نکات ہی۔ کتب مقدسہ
میں پایا جاتا ہی کہ گناہ کی وجہ سے دُکھ اور لعنت دنیا میں آئی۔ مگر دُکھ کا آغاز دنیا
میں قبل از گناہ ہوا قبل از تواریخ انسان جیالوجی اس امر کی شاہد ہی کہ طبقات الارض
میں زلزلوں اور طوفان کے ذریعہ سے بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا اور حیوانات میں
بہت سا باہمی کُشت و خُون واقعہ ہوا ہی پیشتر اس کے کہ موجودہ دنیا انسان کی
رہائش کے لئے تیار ہوئی۔ بھوکھ اور خوف کا غلبہ اور زور آور کا غلبہ کمزور پر۔ دُکھ
بیماری اور موت خشکی اور تری میں۔ الغرض جہاں کہیں کسی زمانہ میں جان
پائی گئی ہی وہاں دُکھ موجود تھا۔ درحقیقت ہر ایک ذی جان میں دُکھ شامل ہی۔
بھوک کا ہونا حاجت کا ثبوت ہی۔ ذی جان کے اعضائے بدنی اس قسم کے بنے
ہوئے ہیں کہ اُن سے دُکھ پیدا ہوتا ہی اور جسقدر وہ اعضا مکمل ہوتے جاتے ہیں
اُسی قدر دُکھ بھی دفع ہوتا ہی۔ درندے کا کام ہی ہی کہ چیر پھاڑ کر اپنے ظالم پیٹ

کے دیو اشنہا کو نوالہ دے + جو کچھ بیان ہوا اُس کے متعلق بعض ایسے واقعی امور
ہیں جن کا جواب دیا جا سکتا ہی + اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ دکھ کی اصل غرض
اور اُس کے نتائج کیا ہیں +

(۱) دُکھ ذیجان کو اُن امور سے آگاہ کرتا ہی جو اُس کے نقصان کا باعث ہیں
گویا وہ سکھ کا مصقل ہی- یا یوں کہیں کہ دُکھ کا ذی جان میں یہہ کام ہی کہ اُس سے
آئندہ بچاؤ کا بندوبست کرائے کیونکہ اگر ذی جان دُکھ محسوس نہ کرے تو وہ معرض خطر
میں مبتلا ہوگا- پس دُکھ اُسکا محافظ یا دربان ہی اور اُس کے بچاؤ کے انتظام کے لئے
پیشتر سے ہی آگاہی دے چھوڑتا ہی پس دکھ از قسم برائی نہیں ہی- بلکہ نیکی ہی کیونکہ
نیکی کا وسیلہ ہو کر اُسکو انجام تک پہنچاتا ہی +

(ب) دُکھ سے ہمت اور جفاکشی کی زیادہ ترقی ہوتی ہی- اور جسقدر ذیجان
با ہمت اور جفاکش ہوگا- اُسی قدر اُس کے ذاتی قوا ر زور پکڑتے اور ترقی حاصل
کرتے جاوینگے- اور کم ہمت اور کاہل زندگی کے مقابلہ میں ناکامیاب رہکر معدوم ہو جاوینگے
یہہ تو سچ ہی کہ بھوک حاجت کا ثبوت ہی اور حاجت کا پایا جانا دکھ ہی- اگر ذیجان
میں حاجت نہ پائی جاوے تو جن صورتوں میں اُن کے اعضار اب نظر آتے ہیں
اور جن سے وہ اپنے احتیاج کا سامان مہیا کرتے ہیں تاکہ دُکھ رفع ہو وہ ہرگز نظر
نہ آئینگے- خوف کے غلبہ نے خرگوش کو اپنے اعضار کا مناسب استعمال کرنا بخوبی
سکھا دیا ہی جس سے وہ اپنے بچاؤ کی تدابیر کو حتی الوسع بخوبی کام میں لاتا ہی اور واقعی
اُسکے اعضار کا انجام یہی ہی کہ وہ خوب تیز بھاگ کر اپنی جان کو بچائے- اسی طرح مرغابی

اور جنگلی کبوتر کا پرواز کرنا ہی۔ بھوک کی شدت نے شیر کو اپنے اعضا کا استعمال کرنا سکھایا ہی۔ حتیٰ کہ نہایت خوبصورت۔ قوی ہیکل۔ شجاع اور قد و قامت میں نہایت موزوں نظر آتا ہی۔ انسان میں بھی بوجہ حاجت اُس کی ذاتی خوبیاں اور اوصاف ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ بھوک اُسکو محنتی اور جفاکش بناتی ہی۔ حاجت ہی اُسکو تجربہ کار ہنرمند اور موجد بناتی ہی جس سے عیاں ہی کہ دُکھ کا انجام نیک ہی۔ اس لئے دُکھ کا ہونا انسب ہی کیونکہ دکھ کی وجہ سے ذیجان اپنے قوا اور اعضا کے واجب استعمال سے درجہ تکمیل کو پہنچتا ہی۔ قانونِ انتخابِ فطرت جسکو ڈارون صاحب نے بوضاحت بیان کیا ہی اُس میں دو باتیں پائی جاتی ہیں +

اوّل۔ کہ ترکیب اعضا کے بیرونی اشیاء کے ساتھہ وابستہ او متعلق ہونے کی وجہ سے تبدیلی واقعہ ہوتی ہی۔ اور جس کا رُخ بترقی ہوتا ہی۔ اگر کوئی امر درمیان میں مانع نہ ہو تو وہ اعضاء بدنی اُس غایت مطلوبہ کو پہنچتے ہیں۔ جہاں خارجی تعلقات کے ساتھہ اُن کی عین مناسبت ہوجاتی ہی اور یہی صورت درجہ کمالیت کی ہی +

دُوم۔ جہاں اعضاء بدنی کی مناسبت اشیاء بیرونی سے صحیح صحیح واقع نہ ہو تو وہ ضرور انجام کے ٹھیک طور پر پورا نہ کرنے کی وجہ سے نقصان اُٹھاتے ہیں یا ضائع ہوجاتے ہیں اور باقی وہی نجات پاتے اور سلامت رہتے ہیں۔ جو لائق اور مکمل ہوں۔ چنانچہ یہہ سلسلہ دنیا میں جان کے سلامت رکھنے اور بچاؤ کیواسطے برابر جاری ہی اور وہی ذیجان کامیاب اور غالب رہتا ہی جسکے اعضاء بدنی خارجی تعلقات کے

ساتھ عین مناسبت رکھتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو اُن جانوروں کی خوبی اور وصف اور شان نظر آرہی ہے جو واقعی تکمیل انجام کے لحاظ سے افضل اور اکمل ہیں +

(ج ۱)۔ انسان میں دُکھ کی وجہ گُناہ بھی ہے۔ یہہ تو داخل رموز الٰہی ہے۔ کہ خدا نے مخلوق انسان میں گُناہ کو کیوں اذن کیا؟ یہہ ہوسکتا تھا کہ خدا انسان کو فعل مختار نہ بناتا۔ مگر اُس حالت میں انسان اپنے مرتبہ سے گرا ہوا ہوتا ایک کل کی مانند ہوتا جسکو خدا جس طرف چاہتا پھیرتا۔ مگر تب وہ انسان نہ ہوتا اور یہہ بھی ہوسکتا تھا کہ خدا انسان کو اُن فرشتوں کی طرح پیدا کرتا جو معصوم ہیں اور اپنی اصلی حالت میں بدستور قائم ہیں۔ مگر یہہ تو خیالی پلاؤ پکانے ہیں۔ بجا اور درست یہہ ہے کہ ہم اصلی حقیقت کی طرف دیکھیں۔ ہمارا سروکار زیادہ تر اس دنیا سے ہے جس میں انسان حالتِ موجودہ میں پایا جاتا ہے اور خدا کا انسان کو اس موجودہ دنیا میں رکھنا خالی از حکمت نہیں ہے۔ ہم غرور و تکبر کی وجہ سے نیچر میں نقائص دکھانے کے لئے میدانِ نکتہ چینی میں کود پڑتے ہیں۔ مگر یہہ نہیں خیال کرتے کہ یہہ نقائص ہمارے معلومات کے کم ہونے کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تمدنی اور اخلاقی دنیا میں نقائص کا پایا جانا انسان کے گُناہ کی وجہ سے ہے۔ مگر خدا نے انسان کو نقص والا پیدا نہیں کیا تھا اور نقائص جو انسان میں پائے جاتے ہیں (جن کا سبب وہ خود آپ ہی) وہ اس قسم کے ہیں جن کو خدا اپنے حکم اور انتظام میں لاکر اُن سے نیک انجام پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ ایک خوش خلق انسان اور ایک معصوم انسان میں زمین و آسمان کا فرق ہے خلق وہ آزمودہ خو انسان میں ہے جو اپنے انجام کے مرحلہ کو دکھ اور مقابلہ اور غالب

ہو نیکی کے راستہ سے طے کرتا ہے یعنی نیک اخلاق انسان وہ ہے جو گناہ کے خصائل سے
جو اُسکے رگ و ریشہ میں گھسے ہوئے ہیں برابر مقابلہ کر کے اُن پر غالب آتا ہے۔ جیسے
حیوانی دنیا میں مقابلہ اور غالب آنے سے ذی جان اپنے اعضاء کے استعمال میں
درجہ کمال کو پہنچتا ہے۔ اِسی طرح خوش خلق انسان گناہ سے مقابلہ کر کے اور اُس پر
غالب ہو کر وہ اوصاف اور خوبیاں پیدا کر لیتا ہے جو اُس کی شان اور مرتبہ کو کمال تک پہنچاتی
ہیں۔ ہاں یہہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو کیوں ایسا پیدا کیا کہ بغیر دُکھ
کے وہ کمال کو نہ پہنچ سکے؟ اور کیوں اُسکو اپنے اعمال و افعال پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے
لئے دُکھ یا سُکھ کا سامان مہیّا کرے اور کیوں خدا نے ابتدا ہی سے اُس کی چال
و روش کو ایسا نہیں رکھا کہ ہمیشہ خوشی ہی اُس کے شامل حال رہے؟ اُس کے
جواب میں ہم یہہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی اور طریقہ انسان کی خوشی اور بہبودی کے
لئے نہیں ہو سکتا تھا۔ یا خدا کی نیکی اور رحمانیت کا صرف یہی تقاضا نہیں ہے
کہ وہ محض خوشی کو پیدا کرے۔ بلکہ یہہ کہ وہ ایسے شخص کو خوشی عنایت کرے جو اپنے
اعمال میں نیک ہے اور یا یہہ کہ خدا انسان جیسے مخلوق سے یہہ توقع اور امید رکھتا ہے۔
کہ جیسی فطرت اور ذات اُسکو عنایت کی گئی ہے اُسکے مناسب حال اپنے فرائض اور
واجبات بجا لائے۔ کیونکہ محض خوشی کا سامان مہیّا کرنا ایک امر ہے اور انسان کا راستی
اور سچائی کی خاطر نیک بنکر خوش و خرم رہنا امر دیگر ہے۔ یا یہہ کہ جب انجام دینا ہم
سے ابتک بعید ہے تو ابھی تک ہم یہہ فتویٰ نہیں دے سکتے کہ انسان میں گناہ کی وجہ سے
دُکھ اور رنج کا پایا جانا سراسر نقص ہے +

یہہ بات غور طلب ہی کہ خدا کا طریق عمل اپنی موالید ثلاثہ میں ایک ہی قسم کا ہی۔ مادی دنیا میں علم جیالوجی نے ثابت کیا ہی کہ موجودہ حالت میں آنے سے پیشتر اس میں بہت سے انقلابات واقعہ ہوئے ہیں۔ چنانچہ طوفان اور زلزلوں نے تری اور خشکی کو تہ و بالا کر دیا۔ پہاڑوں کو اچھال پھینکا۔ بڑے بڑے براعظموں کو غرقاب کر دیا حتیٰ کہ انہیں کی حرکات سے رفتہ رفتہ موجودہ دنیا آراستہ ہو کر انسان کی رہائش کے قابل ہوئی۔ اسی طرح حیوانی دنیا میں بہت سا جنگ و جدل اور کشت و خون واقعہ ہوا ہی اور وہی حیوان باقی رہے ہیں جو جینے کے قابل تھے۔ اسی طرح روحانی دنیا میں انسان بھی اپنی زندگی کے مقصد کو تب ہی پورا کرتا ہی جب وہ دکھ اور مقابلہ کے مرحلوں کو طے کر لے۔ اور آگ میں تایا جا کر ایک خالص نیک اخلاق انسان بنے+

(ط)۔ یہہ بھی دیکھا جاتا ہی کہ انسان کی بے طرح آزادی کے روکنے کے لئے بہت اقسام کی سزائیں اور مزاحمتیں سدراہ ہوتی ہیں۔ جن کی موجودگی سے انسان گناہ کے برے نتائج سے روکا جاتا ہی۔ انسان آزاد تو ہی مگر مشاہدہ میں آتا ہی کہ اسکو اس موجودہ دنیا میں اپنے افعال کی انجام دہی کی پوری پوری آزادی حاصل نہیں ہی۔ ہاں وہ تو اپنی طرف سے ہاتھ پاؤں مار کر بہت سے آزادانہ منصوبے باندھتا ہی مگر کوئی نہ کوئی امر جسے ہم تو اپنی تقدیر سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں خدا کی طرف سے وہ تدبیر ہوتی ہی۔ ہمارا سدراہ ہوتا ہی۔ انسان کی آزادی اور سلسلہ نیچر کا خدا کے زیر حکم اور زیر اہتمام ہونا اس خاطر کہ ان کا انجام مفید مطلب ہو یہہ ظاہر کرتا ہی کہ خدا اپنی خلقت سے قطع تعلق نہیں کر بیٹھا ہی۔ بلکہ برابر اپنی عقل کو کام

ہیں لاکر نیچر اور انسان کی علت غائی اور انجام کو پورا کر رہا ہی۔ اِس لئے خدا انسان کے ناواجب منصوبوں کو اکثر توڑ ڈالتا ہی۔ تاکہ سوسائٹی کا نیک انجام قائم رہے۔ مگر اُس کا دخل انسان کی آزادی میں با محل اور با موقعہ ہی۔ ایک حد تک تو ہر ایک فرد بشر خود غرضی سے کام لیتا ہی جس سے وہ سامان و اسباب اپنی منفردی زندگی کا مہیّا اور فراہم کرتا ہی۔ مگر ساتھہ ہی اپنی شخصی آزادی کا کچھہ حصّہ سوسائٹی کے تفویض کرتا ہی۔ تاکہ سوسائٹی کے زیر حکم ہوکر اُس کے ضابطہ کو قائم اور برقرار رکھے۔ اگر انسان کی بے طرح آزادی کو کوئی روکنے والا نہ ہو تو کل انتظام سوسائٹی درہم برہم ہو جاوے بلکہ شریعت اور اخلاق کا نام تک حرفِ غلط کی طرح صفحہ ہستی سے محو ہو جاوے۔

پس ظاہر ہی کہ نیچر کی ظاہرا گڈ مڈی میں انجام مقدم ہی اور گو بظاہر نیکی کا تسلط ابھی نظر نہیں آتا ہی اور بدی کا غلبہ زیادہ تر معلوم ہوتا ہی۔ مگر ہم یہہ جانتے ہیں کہ انجام کار نیکی غالب ہوگی۔ کیونکہ جب یہہ دیکھنے میں آتا ہی کہ وہ انسان جو احتیاط اور دور اندیشی اور حکمت سے کام لیتا ہی۔ اپنے لئے خوشی کا سامان بہتر اور عمدہ مہیّا کر لیتا ہی اور جو انسان بد احتیاطی اور غفلت اور نادانی سے اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کرتا ہی وہ اپنے لئے رنج اور دُکھہ کے سامان فراہم کر لیتا ہی۔ تو گویا نیچر سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہی کہ انسان کی بہبودی اور بہتری یا نقصان اور بربادی اس کے اپنے ہی افعال اور اعمال پر چھوڑی گئی ہی اور ساتھہ ہی اسکو یہہ بھی دکھایا گیا ہی کہ اگر وہ نیک چلنی سے عمر بسر کریگا تو اُس کے لئے خوشی کا باعث ہی۔ ورنہ بد چلنی سے دکھہ اور رنج شامل حال رہینگے جس سے یہہ مترشح ہی کہ نیچر میں خدا نے

انسان کے اعمال کے متعلق سزا وجزا کو شامل حال کر دیا ہی اور پھر ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ سوسائٹی میں بھی احکام اس وجہ سے نافذ کئے گئے ہیں کہ وہ پبلک کے حقوق کے محافظ ہوں۔ اس متذکرہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ ہر ایک فرد بشر جداجدا اور اجماعی حیثیت میں نیکی کے انجام کو پورا کرنے کے لئے مقرر ہی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہہ بندوبست اور انتظام خدا کی طرف سے مقرر ہی۔ کیونکہ خدا کا سلوک مخلوق سے نیک مطلوب ہی اور گو ابھی تک منزل مقصود دور معلوم ہوتی ہی۔ مگر گذشتہ میں ترقی کے سامان کو دیکھکر یہہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہی۔ کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ ترقی کے سامان مہیا ہونگے۔ حتّٰی کہ اُس اندازہ اور معیار تک پہنچینگے جس کی طرف تمام خلقت کا رخ ہی۔ پس جب خدا کی ایسی ربوبیت نیچر کے مطالعہ سے انسانی تواریخ میں مشاہدہ ہوتی ہی۔ تو نہ صرف ہم کو ایک صانع عظیم کا سراغ ملتا ہی جس کے تمام کاموں میں صنعت اور کاریگری مترشح ہو رہی ہی اور جو باہوش اور باشعور بھی ہی بلکہ ایسے وجود کا جو اِس موجودات کا زندہ حاکم اور ناظم بھی ہی۔

فصل سوم

عقل کا خود اپنا مطالعہ ذہنی

انسان میں علاوہ بدن کے روح بھی پائی جاتی ہی۔ جو اپنے وجود کا علم فی البداہت خود علمی سے رکھتی ہی۔ اور اُس میں ذہن وفہم اور احساس باطنی بھی شامل ہیں۔

عقل اپنے باطنی مطالعہ اور نظر اولیٰ اور قرآن سے وہی جواہر اور اوصاف ودیعت جو اپنے
میں ملاحظہ کرتی ہے۔ خالق کی طرف بھی کلیتہً منسوب کرتی ہے۔ واقعی موجودات میں عقل
کاملہ کے جواہر اور اوصاف نظر آتے ہیں عقل اپنے پہلے ذرائعہ معلومات سے موجودات
کو صول صنعت یا آئین نیچر گردان سکتی ہے۔ مگر جب ساتھ ہی بذریعہ مطالعہ ذہنی عقل
خود علمی اور شعور اور احساس ذہنی کا اپنے میں ادراک کرتی ہے اور نیچر میں بھی حکمت
اور دانائی اور آثار کریمانہ دیکھتی ہے۔ تو وہ نیچر سے فوق البنیچر کی تلاش کرتی ہے اور اُس
میں بھی اغلباً بلکہ یقیناً خود علمی کے موجود ہونے پر استدلال کرتی ہے۔ بلکہ کائنات
کی کل جو کہ روحانی حکمت اور دانائی اور نیکی کے ساتھ چل رہی ہے عقل کے براہین کی
تصدیق کرتی ہے جب انسان میں یہہ مادہ عقلی موجود ہے کہ وہ اپنے اور غیر میں تمیز
کرسکے۔ اور اُسی کی بنا پر اور غیر کی ہستی کا بھی قائل ہے تو خدا کو بھی ویسا ہی ماننا اُسکی
عقل کا لازمی تقاضا ہے یعنی یہہ کہ خالق ضرور اپنی ذات روحانی میں خودی کا جوہر رکھتا
ہے۔ خودی روح کا ایک ایسا لازمہ ہے کہ اگر وہ محو ہو جاوے تو روح کی کوئی خوبی باقی نہیں
رہتی ہے جب مخلوق مادہ کے خواص مشاہدہ کر کے یہہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یہہ مادہ بڑی
قدرت اور حکمت اور ہنر سے بنا ہے۔ تو کس قدر بڑھکر اُس صانع عظیم کا جو نیچر کا حاکم اور ناظم
بھی ظاہر ہے تصور دل میں قائم ہوگا جب اپنی روح کی خوبیوں کو دیکھکر یہہ استدلال کیا
جاویگا کہ خدا روح بھی ہے۔ فی الجملہ ہماری روح میں جو استعداد اور استطاعت مرکوز ہے۔
ہماری عقل اُسکا کوئی مناسب اور معقول بانی مبانی طلب کرتی ہے یعنی ایسی روح کے
وجود کو جو باوصف علیم اور دانا ہونیکے مخلوق کی روح کو پیدا بھی کرسکتی ہے۔ ہماری روح

میں بعض مدامی اور لازم اصول مرکوز ہیں۔ مثلاً بداہتًا یا بنظر اولی ہماری عقل کا یہہ تقاضا ہی کہ وہ معلول کا علت کے ساتھہ رشتہ قائم کرے۔ اور بطور جواب درحقیقت نیچر کے تمام حادثات میں یہہ رشتہ علت و معلول کا مشاہدہ میں آتا ہی۔ علیٰ ہذالقیاس مشاہدہ اور استقرار سے ہمارا علمی تجربہ بڑھتا ہی۔ اور واقعی نیچر کے کل ظہور میں قاعدہ استقرائی قائم اور موجود ہی۔ کل مادی اشیاء میں ایک ایسا باہمی رشتہ اور انجام پایا جاتا ہی کہ اُن کے عمل میں برابر علت معلول کا رشتہ قائم رہتا ہی۔ مثلاً کسان اسی اعتقاد کی بنیاد پر زراعت اور تخم ریزی کرتا ہی اور یہہ یقین رکھتا ہی کہ اُس کی محنت نیچر کے اصُول اور قاعدہ کے موافق رائیگاں نہیں جاویگی۔ یا یوں کہیں کہ نیچر اُسکو دھوکہ نہیں دیگا۔ اسی طرح فطرتًا ہم خوبصورتی کو پسند کرنے کا جوہر رکھتے ہیں اور اُس کے جواب میں نیچر درحقیقت ایک خوش پیرایہ میں ہم کو نظر آتا ہی۔ علاوہ ازیں خالی ازفائدہ بھی نہیں ہی۔ لہذا ہمیں لازمی طور سے ماننا پڑتا ہی کہ نیچر اور ہماری روح کا نہ صرف کوئی مناسب اور معقول اور سمجھہ رکھنے والا سبب ہی۔ بلکہ یہہ کہ وہ سبب نیک بھی ہی اور پھر یہہ کہ ہماری روح خودی کا علم بھی رکھتی ہی۔ جسکا بیان پہلے تمہید میں ہوچکا ہی اور اس خودی کا مفہوم یہہ ہی کہ وہ خود اور ناخود میں ما بہ الامتیاز کرتی ہی اور یہہ وصف روح میں لازم و ملزوم کا حکم رکھتا ہی۔ اس ہیں میں کا مفہوم مستلزم ہی۔ خدا بھی تعقلاً ایسے معنی پر مفہوم ہی۔ وہ بھی واجب الوجود کی حیثیت میں خودی بالذات اور بلانسبت رکھتا ہی کیونکہ ایسے وجود کا خیال یا تصور جو روح ہی اور جو علت العلل بھی ہی اور جس علت میں دوراندیشی اور حکمت بھی پائی جاتی ہی اور ترتیب اور ضابطہ اُس کے افعال

کا نتیجہ ہی۔مگر وہ خودی رکھتا ہوا نہ مانا جاوے یعنی اپنی ذات سے ناآشنا ہو تو یہہ محض خیالِ باطل ہی۔ ع این خیال است و محال است وجنون + ہم تو مخلوق ہوکر اپنی شخصیت سے آشنا ہوں اور اپنے اور غیر میں بخوبی تمیز کریں اور موضوع اور محمول میں جو باہمی تعلق ہو اُسکا بھی ادراک رکھیں۔مگر یہہ صفات خدا کی جانب منسوب نہ کریں۔ تو سراسر نادانی ہی کیونکہ ظاہر ہی کہ تب ہم نتیجہ میں سب سے زیادہ اوصاف بیان کرتے ہیں۔جو غیر ممکن اور غیر موزوں ہی پس خدا جو روح ہی وہ ضرور خودی بالذات اور بلانسبت رکھتا ہی اور جوکچھہ اُس کے افعال نیچر میں ظاہر ہو رہے ہیں وہ اُس کے ارادہ اور سمجھہ سے باہر نہیں ہیں۔ویدانت کا خیال مطلق لغو اور مغالطہ آمیز ہی۔جو خدا کو جہالت میں ڈالکر جگت کی بوقلمونیوں کو پیدا کرواتا ہی۔حالانکہ یہہ امر قرین قیاس اور مطابق عقل ہی کہ خدا نے جو باہوش اور باارادہ ہی حکمت اور دانائی کے ساتھہ اس دنیا کو پیدا کیا +

فصل چہارم

ہماری وضع اخلاقی

ہمیں یہہ جوہر لیاقت عنایت ہوا ہی کہ واجب و مناسب اور غیر واجب اور غیر مناسب میں تمیز کرسکیں۔تو ضرور خدا میں بھی اصلی اور حقیقی اخلاقی تمیز ہی جیسا کہ ضابطہ قائم کرنا اُس کی ذات کا خاصہ ہی۔ویسا ہی اخلاق بھی۔وہ فعل جو اُس کی

مرضی کے خلاف ہی غیر واجب ہی اور قوت تمیز جو ہمارے دلوں میں مرکوز ہی وہ اُس کے مطابق فیصلہ دیتی ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو فعل ہم سے صادر ہوتا ہی اُس میں ذمہ واری کا خیال بھی شامل حال ہی۔ تو خواہ مخواہ یہہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہی کہ ہم اپنے فعل کے جوابدہ کس کو ہیں؟ دنیا میں قانون شکنی کا نتیجہ دُکھہ اور مصائب نظر آتا ہی۔ گویا صریحاً یہہ پایا جاتا ہی کہ نیچری ضابطہ اور اخلاقی شریعت کا کوئی غیر مند محافظ ہی۔ لہذا جب وہ خود ہم سے شریعت طلب کرتا ہی تو خود آپ بھی اخلاق سے ملبّس ہی اور راستی کو پسند کرتا ہی۔ اس میں تو شک نہیں کہ کانشنس سے اعمال کا صرف واجب اور غیر واجب ہونا جانا جاتا ہی۔ اور خدا نہیں جانا جاتا مگر جب کانشنس شریعت کی خبر دیتی ہی اور شریعت کی ادائیگی کا فرض باسیاست ہم سے طلب کرتی ہی اور نیز ذمہ واری کا خیال ہر ایک فعل کے ارتکاب میں شامل حال رکھتی ہی اور یہہ مقصد بھی ظاہر کرتی ہی کہ ہم اپنے کل قواء کو راستی کے ساتھہ استعمال کریں تو ضرور یہہ خیال دل میں اُٹھتا ہی کہ ہم جوابدہ کس کو ہیں؟ تواریخاً انسان کی منفردی اور سوشل زندگی ظاہر کرتی ہی کہ ہر ایک زمانہ میں گناہ کے نتیجہ نے انسان کے دل میں خوف کو پیدا کیا ہی اور اُس خوف کے مٹانے کے لئے ہزارہا تدابیر اُس نے نکالی ہیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہی کہ وہ ایسا کیوں کرتا آیا ہی؟ یہی سبب ہی کہ وہ کسی اعلیٰ زندگی سے لرزاں ہے اور اپنے تئیں ذمہ وار اور جوابدہ ٹھہراتا ہی +

انسان میں جو اخلاقی صفت پائی جاتی ہی وہ کانشنس (قوت تمیز) سے موسوم ہی یہہ وہ قوت ہی کہ جس سے انسان کو اپنے باطن میں یقینی شہادت ملتی ہی

کہ واجب اور مناسب کیا ہی اور غیر واجب اور غیر مناسب کیا ہی۔ یہہ قوت انسان کے باطنی اصول پر محاصرہ کرتی اور نظرِ حکومت رکھتی ہی اور وہ ایک باطنی شریعت کی خبر دیتی ہی اور اُس کی اطاعت باسیاست طلب کرتی ہی۔ بد عمل پر فتویٰ مذمّت کا دیتی۔ اور نیک عمل پر مدح کا جس طرح ہم اپنی قوّت فہم اور ذہن کے ذرائع سے ہر ایک شئ اور مقدمہ کو تصور میں لاتے اور اُن کی تصدیق بالثبات یا بالنفی کرتے ہیں۔ اور جس طرح اپنے جذبات کے ذریعہ سے محسوس کرتے ہیں جس سے خوشی یا رنج یا امید یا خوف پیدا ہوتا ہی۔ اُسی طرح کانشنس کے ذریعہ سے نیکی اور بدی میں امتیاز کیا جاتا ہی۔ کانشنس کی مذمّت اور مدح اس امر پر دال ہی کہ ہم سے ایک اعلیٰ اور برتر وجود ہی۔ جو ہر وقت حاضر و ناظر ہو کر ہمارے اعمال اور افعال کا معائنہ کرتا رہتا ہی۔ بلکہ ہر حالت اور ہر ایک صورت میں اُس کا دخل ہماری زندگی میں رہتا ہی۔ گویا کانشنس ہدایتاً۔ عدالتاً اور محتاطاً اپنی منشا کا قائم کرنا ہم پر لازم ٹھہراتی ہی +

الحاصل ہمارے میں اخلاقی اصول موجود ہیں۔ جب کبھی کسی موقع پر انسان اپنی خواہشوں اور رغبتوں کو غیر واجب طور پر استعمال کرنا چاہتا ہی۔ تو اُس کو مقدم صورت میں ایک قسم کی باطنی مزاحمت پیش آتی ہی۔ گویا ایک دھیمی سی آواز اُسے غیر واجب فعل کے ارتکاب سے مطلع کرتی ہی اور جب فعل واقعی عمل میں آتا ہی تو ملامت اور مذمت کرتی ہی یہہ تو سچ ہی کہ بسا اوقات وہ خواہشات کی بیجا حرکات کو پورے طور سے روک نہیں سکتی۔ مگر ارتکاب فعل سے بیشتر آگاہ کرنے

اور بعد میں دھمکی دینے اور پھٹکارنے سے نہیں چوکتی۔ اُسکی موجودگی سے ایک قسم کا فکر اور خوف طبیعت پر طاری رہتا ہی اور جس کے رفع کرنے کی خاطر انسان کوئی نہ کوئی منت یا نذر مانتا ہی تاکہ وہ اُس کے بیجا حرکت کے خوف کے دور کرنے کا باعث یا ذریعہ ہو۔ ہر ملت و مذہب کے لوگوں کے دستور العمل سے پایا جاتا ہی کہ گناہ دنیا میں موجود ہی اور یہہ بھی کہ ہماری کانشنس خدائے عادل کی شہادت دیتی ہی۔ ظاہر نیچر میں تو ترتیب اور ضابطہ پایا جاتا ہی اور باطن میں شریعت۔ جو شارع کی ہستی کی اطلاع دیتی ہی جب انسان بُرے کو بُرے سے اور نیکی کو نیکی سے تعبیر کرنا جانتا ہی تو ضرور خدا بھی نیکی کو چاہتا ہی اور بُرائی سے نفرت کرتا ہی اور نیکی کے قائم رکھنے کے لئے انواع واقسام کے دُکھ اور رنج انسانی زندگی کے شامل حال رکھتا ہی تاکہ بنی نوع انسان برائی سے اجتناب کرے اور نیکی کی پیروی کرے۔ مگر یاد رہے کہ کانشنس خود کوئی اخلاقی شریعت نہیں ہی بلکہ ایک قسم کی مخبر ہی۔ اور نیکی یا بدی کا فتویٰ اُس موقعہ پر دیتی ہی جبکہ نیک یا بد فعل ظہور میں آئے جیسے عقل صدق و کذب کا آلہ دریافت ہی ویسے ہی قوتِ تمیز نیکی اور بدی میں ممیز ہی اور ان ہر دو قویٰ میں قوتِ فیصلہ پایا جاتا ہی۔

متذکرہ بالا وسائل معلومات عقل سے ہم نے خدا کی ہستی کو قائم کیا ہی۔ اور ساتھ ہی یہہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ دانا حاکم اور ناظم اور روح بھی ہی۔ اور یہہ بھی کہ وہ رحمٰن بھی ہی اور انسان کی حقیقی خوشوقتی اور بہبودی چاہتا ہی۔ اور اِسی مقصد سے موجودہ تیرہ و تار دنیا میں دُکھ کو بھی اذن کیا ہی۔ تاکہ انسان

قانون اور شرع کی پابندی سے مطلق العنان ہو کر خدا کے بندوبست اور انتظام کو
ضائع نہ کرے۔ اب یہہ دیکھنا چاہئے کہ ہر ایک جُدا جدا وسیلہ اپنی اپنی شہادتِ اثبات
پیش کرتا ہے خدا کے افعال جسمانی سے اُس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نظر آتی ہے
خدا کی ربوبیت سے خدا کا حاکم اور ناظم ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ہماری سرشتِ روحانی
سے خدا ایک زندہ اور روحانی اور خودی رکھتا ہوا ثابت ہوتا ہے اور ہماری وضع
اخلاقی سے خدا کا کارکٹر (سیرت و خصلت) نمایاں اور عیاں ہے۔ ہم نے نہ صرف یہہ
ظاہر کیا ہے کہ خدا ہے اور وہ کیا ہے بلکہ یہہ بھی کہ وہ مخلوق کی بہبودی اور خوشی چاہتا
ہے چنانچہ ہر ایک مناسبت نیچر نہ صرف خدا کے مقصد کو ظاہر کرتی ہے بلکہ اُس کی
نیک دلی کو بھی ثابت کرتی ہے مگر مخفی نہ رہے کہ اگر ان وسائل مذکورہ کی شہادت کو
علیحدہ علیحدہ پیش کیا جاوے یا باہم صرف ایک وسیلہ کو مدِ نظر رکھہ کر باقیوں سے قطع
نظر کریں تو ہماری علومات خدا کی نسبت تنگ اور کم وسیع ہو جاوینگے۔ مثلاً اگر ہم
خدا کے صرف جسمانی افعال متعلقہ نیچر پر ہی باستثنائے دیگر وسائل نظر دوڑائیں تو
اُس حالت میں خدا محض صنعت یا آئین نیچر کی صورت میں نظر آویگا۔ اسی طرح
اگر دوسرے وسیلہ کو چھوڑ دیا جاوے تو خدا کائنات سے جُدا نظر نہیں آویگا اور
اگر وسیلۂ عقل قطع نظر کیا جاوے تو خدا کی شان ایک باشعور اور زندہ وجود ہونے
کی مٹ جاویگی اور اگر اخلاقی وسیلہ کو نظر انداز کیا جاوے تو خدا کی راستی اور قدوسی
کا پتہ اور نشان نہ ملیگا۔ پس جدا جدا وسائل کے مطالعہ سے۔ کہ جنکو اگر باہم ربط وضبط
نہ دیا جاوے تو ہماری عقل اور خیالات مغالطہ آمیز ہو جاوینگے حقیقت میں دلیل

کو مضبوطی تب ہی حاصل ہوتی ہی جب تمام وسائل کو باہم ربط دیکر خدا کے وجود اور کارکٹر کو دریافت کیا جاوے۔ تواریخاً ہم اِس بات کو دکھائینگے کہ انسان نے واقعی یکطرفہ نظر دوڑانے سے خدا کی شناخت میں کیسی غلطیاں کھائی ہیں۔ اب ہم کانشنس کے بیان کی توضیح و تشریح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں +

توضیح بیان کانشنس

اوّل۔ کانشنس میں یہہ دیکھا جاتا ہی کہ وہ شریعت کی خبر دیتی ہی اور تعمیل اور اطاعت شریعت انسان پر واجب اور لازم قرار دیتی ہی۔ بُرے فعل پر اپنی ناراضگی ظاہر کرتی ہی اور نیک پر رضامندی۔ اس میں تین امور شامل ہیں +

اوّل۔ انصاف یا تمیز کرنا۔ دوم ہدایت کرنا۔ سوم نگرانی کرنا۔ کانشنس اخلاقی اصول تو جتاتی ہی مگر خود از قسم اصول نہیں ہی بلکہ جیسے ذہن اور عقل آلہ دریافت ہیں ویسے ہی کانشنس اخلاقی اصول کا آلہ دریافت ہی۔ قانون کا نافذ کرنا اُسکا کام نہیں ہی بلکہ قانون کی موجودگی کی اطلاع دیتی ہی جو ہم سے اعلیٰ اور ہم پر حکمران ہی اور جب شریعت واقعی موجود ہی تو اُسکا شارح سے منسوب کرنا ہمارا عقلی تقاضا ہی جب ہم اپنے اعمال کا اپنے تئیں ذمہ وار ٹھہراتے ہیں تو لاریب ذمہ واری کے ساتھ یہہ بھی خیال دل میں پیدا ہوتا ہی کہ ہم کس کے سامنے ذمہ دار اور اب دہ ہیں ؟ اور جب شارح کی طرف خیال دوڑاتے ہیں جس سے کہ شریعت صادر ہوئی تو ہماری عقل اس امر کی مقتضی ہی کہ ضرور وہ خود بھی شریعت پسند ہو۔ اِس لئے عدولِ شریعت اُسکی عدول حکمی ہی اور تعمیل اور تکمیلِ شریعت میں اُس

کی رضامندی اور خوشنودی ہی۔ دوسرا اصول کانشنس کا یہہ ہی کہ کل اختیاری افعال پر جو ہمارے دل کے ارادے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں واجب یا ناواجب کا فتویٰ لگاتی ہی تیسرا اصول یہہ ہی کہ اُس کے فتویٰ دینے کے وقت حرکات باطنی بھی عمل میں آجاتی ہیں۔ جو طبیعت میں جوش کو پیدا کرتی ہیں۔ مگر یہہ حرکات باطنی خودبخود متحرک نہیں ہوتی ہیں بلکہ فعل کے ارتکاب سے یہہ حرکت پیدا ہوتی ہی یعنی پہلے فعل کے ارتکاب کے لیئے ارادہ عمل میں آتا ہی اور بعدش حرکات باطنی بھی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مثلاً جب جوہر بہادری پر غور کیا جاتا ہی اور اُس کے اس جوہر کے دکھانے کا ارادہ کیا جاوے تو ساتھہ ہی اُس کے ایک قسم کے جوش کی حرکت بھی طبیعت میں پیدا ہوجاتی ہی۔ اسی طرح جب ہم کسی کو پیار کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُس کی بہبودی بھی چاہتے ہیں تو اُس موقع پر بھی طبیعت میں جوش کی حرکت پیدا ہوجاتی ہی۔ مگر یاد رہے کہ کانشنس معہ اپنے ہمرکاب حرکات باطنی ازخود کسی آدمی کو نیک یا بد نہیں بناتی تا وقتیکہ فعل اُس سے عمل میں نہ آوے۔ فعل کے ارتکاب پر کانشنس فی الفور اپنا فتویٰ باسیاست دیتی ہی اور تب حرکات باطنی بھی عمل میں آجاتی ہیں۔ اخلاقی عمل میں بھی تین امور شامل ہیں۔ عندیہ۔ فعل۔ انجام۔ ان ہرسہ کی جُدا جُدا تشریح و تاویل ہوسکتی ہی اور اس صورت میں اُن کے اخلاقی اوصاف میں اختلاف ہوسکتا ہی مثلاً عندیہ تو بالکل واجب ہو اور عمل غیر واجب۔ یا انجام واجب ہو مگر عندیہ یا دیگر وسائل انجام کی تکمیل کے لیئے غیر واجب ہوں۔ پھر جذبات بھی تین قسم کے ہیں۔ خواہشات۔ رغبات۔ قوت فیصلہ۔ خواہش محض چاہنے یا طلب

کے معنی ہیں۔ یہہ وہ قوت ہم میں پائی جاتی ہی جو اُس چیز کو تلاش کرتی اور اُسپر قبضہ کرنا چاہتی ہی جس سے ہماری خوشی متصوّر ہی۔ گویا خواہش کا ہونا یہہ جتاتا ہی کہ ہم محتاج ہیں اور محتاج ہونے کی وجہ سے ایک قسم کی بےچینی طبیعت میں آجاتی ہی اور ہم اس امر کے درپے رہتے ہیں کہ ہماری مراد میسّر ہو۔ جسمانی خواہشات کے علاوہ انسان میں عقلی خواہشات بھی موجود ہیں مثلاً خواہش علم۔ خواہش اختلاط باہمی۔ تحصیلِ ناموری و شہرت وغیرہ گو یہہ خواہشات اپنی ذاتی بھلائی کی تلاش و جستجو میں رہتی ہیں۔ مگر شامل خودغرضی نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنے مقاصد کو دوسروں کو ضرر اور نقصان پہنچا کر حاصل نہیں کرتی ہیں۔ خودغرضی البتہ گناہ میں داخل ہی کیونکہ وہ خواہش و غیر طبعی ہی +

رغبات یعنی طبیعت کا میلان دوسروں کی طرف۔ اِن میں ہم اپنے ساز و سامان کو دوسروں کی بھلائی یا بُرائی کے لئے عمل میں لاتے ہیں۔ یہہ رغبات یا تو محبّت کی صورت پکڑتے ہیں یا نفرت کی۔ محبت تو اُس حال میں ہوتی ہی جبکہ موضوع کی توقیر و منزلت متصور ہو اور نفرت اُس حالت میں ہوتی ہی جبکہ اُس کی تحقیر اور ذلت پیشِ نظر ہو۔ خواہشات اپنی بھلائی ڈھونڈتی ہیں اور رغبات دوسروں کا فائدہ یا نقصان +

قوت فیصلہ اِس میں جذبات یا تو حکمت عملی کی صورت پکڑتے ہیں تاکہ انسان اپنے حقوق قائم رکھے یا راستی کی صورت اختیار کرتے ہیں تاکہ احسانمندی اور ذمہ واری قائم رہے۔ جہاں ان جذبات کے ساتھ ارادہ کاربند ہوتا ہی وہاں

جذبات بھی کانشنس کی زیر نگرانی آجاتے ہیں۔ واجب فعل کے ارتکاب میں اولاً
تو دل کا ارادہ پیدا ہوتا ہے اور وجہ پیدا ہونے کی یہہ ہوتی ہے کہ فعل مذکور واجب فعل
ہے اور دوم یہہ کہ وہ خدا کو جوابدہ ہے۔ تمام نیکی یا بدی کا صادر کرنا ہمارا امر اختیاری
ہے کیونکہ ارتکاب فعل بوجہ ارادہ کے ہوتا ہے۔ پہلے پسند کرنا کسی خاص فعل کا اور
پھر اُسکو عمل میں لانا ہوتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ عندیات بھی ارادہ کو ترغیب
وتحریک دیتی ہیں مگر یہہ ہمارا اختیار ہے کہ اُن عندیات کے مطابق فعل کو عمل میں
لائیں یا نہ لائیں۔ ہمارا ارادہ عقل سے ہدایت حاصل کرتا ہے اور تمام خواہشات اور
رغبات پر وہ قابض ہے۔ محض خواہش کا ہونا بدی یا نیکی نہیں ہے۔ مگر خواہش کو
پسند کرکے ارادہ سے اُسکو تکمیل میں لانا بدی یا نیکی میں داخل ہے مگر شرط یہہ بھی
ہے کہ کانشنس کا فتویٰ بھی دربارہ مذمت و مدح اُس کے ساتھہ شامل حال ہو اور
اُس کی اطلاع کے موافق اگر فعل واجب سرزد ہوا ہے تو وہ نیکی سے تعبیر ہوگا اگر
خلاف سرزد ہوا ہے تو بدی سے۔ ہرایک اخلاقی فعل میں فرض کا لحاظ رکھنا ضروری
ہے اور ہرایک خواہش کی تکمیل میں خدا کو مقدم رکھنا لازمی امر ہے یعنی اُس کو افضل
پیار کرنا اور اُس کی مرضی اور اطاعت کو مقدم رکھنا اور اُس کے پابند رہنا لابدی
ہے اور علاوہ اِس کے واجب فعل میں شریعت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پہلے ہماری
کانشنس قانون کی اطلاع دیتی ہے اور پھر فرض یا پابندی قانون ہم پر واجب
ٹھہراتی ہے عقلی طور پر یہہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس شریعت کا نازل کرنے والا
ضرور کوئی ایسا شارع موجود ہے جو خود راستی پسند اور عادل اور منصف ہے۔ یاد رہے

کہ اخلاقی نیکی وہی ہے جس کی تعمیل و تکمیل خوشی سے ہو اور محض اسی نیت سے انجام کو مد نظر رکھے کہ ایسا کرنے سے نیکی اور سعادتمندی ہے مثلاً خداوند نے کہا "کامل اور پاک بنو جیسے تمہارا باپ جو آسمان پر ہے کامل اور پاک ہے" اس میں اندازہ اور معیار نیکی کا خدا رکھا گیا ہے اور پاک بننے کی غرض صرف پاکیزگی رکھی گئی ہے۔ نہ یہ کہ پاک بننے سے کسی خاص صلہ یا انجام کی امید خیال کی گئی ہے پس جس انسانی ارادہ کے فعل کے ارتکاب میں فرض کا لحاظ رکھا گیا ہے وہی حقیقی نیکی یا اصلی اخلاق ہے کسی کا خیر خواہ ہونا یا کسی کو پیار کرنا اخلاق میں داخل نہیں ہے کیونکہ یوں تو انسان اپنے پالتو کتّے سے بھی نیک سلوک کرتا ہے۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو اسکا معالجہ بھی کرتا ہے لیکن جب فرض کا لحاظ مقدم رکھا جاوے کہ فلاں شخص کو پیار کرنا اور اُس کا خیر خواہ ہونا میرے لئے واجب اور مناسب ہے تب واقعی ہم اخلاق پر کاربند ہوئے ہیں۔ خدا نے ہم کو مختارِ فعل بنایا ہے اور ساتھ ہی ہماری ہدایت کے لئے جوہر کانشنس کو بھی عطا فرمایا ہے تاکہ ہماری آزادی پابندِ شریعت ہو پس جب دونوں کا اتحاد ہوگا تو اصلی نیکی اور سعادتمندی ہے اور جب دونوں متضاد ہونگے تو نحوست اور بدی ہے اور جہاں بدی کا ظہور ہوگا وہاں ہماری کانشنس خفگی اور مذمت کا فتویٰ دیتی ہے اور نیکی کا مطالبہ کرتی ہے۔ پس محبت کے ساتھ راستی کا ہونا لازم اور واجب ہے تاکہ محبت انصاف کے ساتھ ہو+

سوم۔ فعل واجب جو مطابق منشاء کانشنس عمل میں آتا ہے اُس میں خدا کی اطاعت کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کیونکہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ جب باطنی

شریعت شارع کی طرف منسوب کیجاتی ہی تو یہہ ہمارا فرض اتم ہی کہ ہم اُسکی اطاعت بجالاویں اور اُس سے بڑھکر کسی شئے کو مرغوب خاطر نہ رکھیں۔ اس صورت میں جب خدا ہر ایک انسانی فعل میں مقدم رکھا جاویگا تب انسانی اخلاق ترقی کی صورت میں نمایاں ہوکر دین حقیقی قرار دیا جاویگا۔ جہاں خدائی انسانی معاملات سے منقطع کیجاویگی وہاں دین صرف نام ہی کو رہجاویگا مثلاً اگر ہم کسی دینی فرض کو محض ذاتی بھلائی یا ثواب کی خاطر ادا کرتے ہیں مگر خدا کی خوشنودی اور رضامندی کا لحاظ نہیں کرتے۔ تو وہ نیکی میں داخل نہیں ہوسکتا ہی فعل نیک میں فاعل کے عندیہ کیطرف لحاظ رکھنا چاہیے۔ اگر اُسکا دل خراب ہی تو اُسکی نیکی ناقص اور برباد ہی کیونکہ اُسکا دل شریعت کا پابند نہونے کی وجہ سے خطاکار اور قصوروار ہی۔ مسرف لڑکے کی تمثیل جو انجیل شریف میں درج ہی اُس سے یہی ظاہر کیا گیا ہی کہ جب تک وہ لڑکا اپنے باپ کے گھر واپس نہیں آیا قصوروار تھا یعنی جب سے وہ اپنے باپ سے جدا ہوا خطاکار تھا اور نافرمانی اور بغاوت کی حالت میں باپ کے گھر سے باہر خواہ وہ کتنا ہی اپنے احباب پر مہربان اور فیاض اور مدارات و مواسات کو ادا کرنے والا ہوتا اُس کی نیکیاں خدا پسند شمار نہیں کیجا سکتی تھیں جب تک کہ وہ کانشنس کی اُس مخالفت کو جسکا اُس نے ابتدا ہی سے بیڑا اُٹھایا تھا ترک نہ کرتا ؛

خدا نے انسان کی ساخت و بناوٹ میں بڑی بھاری بنیاد شریعت کی ڈالدی ہی اور اُس کی صحت و تندرستی کی یہی نشانی ہی کہ وہ پابندِ شریعت رہے۔ قوت تمیز کا یہی کام ہی کہ وہ باقی قوا انسانی پر محافظ رہے اور جہاں اُن میں فتور پڑا وہاں

کل اجزاء انسانی میں خلل واقعہ ہوجاتا ہے۔ کانشنس کا پایا جانا ہی نیکی کے ہونیکا ثبوت نہیں ہے وہ تو جیسے پہلے بیان ہوچکا ہے نیکی سے اپنی خوشنودی ظاہر کرتی ہے اور بدی سے اپنی ناراضگی کا فتوی دیتی ہے۔ مگر بدی کے دیر پا تسلط سے انسان کا کانشنس کی منشا کو دبا لیتا ہے یا اپنے حق میں اُس سے کوئی اچھا فیصلہ کروا لیتا ہے اور یہی صورت بگڑی ہوئی کانشنس کی ہوتی ہے جس کا ذکر آئندہ آئیگا ۔

اب جب ہم خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اُسکے جسمانی کام کو دیکھکر اُسکی قدرت اور حکمت نمایاں ہوتی ہے اور عقل کے رو سے اُسکی ذاتی شخصیت اور صفات مثلاً غیر متناہی اور ازلی ابدی ہونا وغیرہ ظاہر ہوتی ہیں اور از روئے شریعت ہم اُسے پاک اور راستکار قرار دیتے ہیں مگر یاد رہے کہ خدا کے کمالات اور صفات جامع میں نہ صرف عقل ہی کا دخل ہے بلکہ نیک جذبات کا بھی کیونکہ خدا محبّت ہے اور وہ گناہ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ایک غیور خدا ہے نیچر میں اُس کا حسنِ سلوک مشاہدہ میں آتا ہے اگر وہ محبّت نہیں ہے تو ہم اُسے ہرگز پیار نہیں کرسکتے حقیقت میں جسقدر اُسکی محبت دریافت ہوگی وہ محبّت جو راستی اور پاکیزگی کے ساتھ عمل میں آتی ہے اُسی قدر ہم اُسکی قربت اور نزدیکی کے آرزو مند ہونگے اور اُس کی اطاعت کو قبول کرینگے جیسے کہ ایک سعادتمند بیٹا اپنے والدین کی اطاعت خوشی سے قبول کرلیتا ہے۔ خدا محض عاقل اور حاکم و ناظم ہی نہیں ہے بلکہ پیدا کرنیوالا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنی سمجھ کے موافق بمصداق فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست ،، اُسکو رحیم و کریم مانتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر خدا میں محبت پائی جاتی ہے تو اُس محبّت کا میلان نیک مطلوب ہے یہ نہیں کہ وہ بدی کی رعایت کرکے ہم کو

پیار کرتا ہی کیونکہ اُسکی محبت راستی اور انصاف کے ساتھ ہی ہم میں کانشنس کا وجود اسلئے
خدا نے عطا فرمایا ہی کہ ہم خدا کو انصاف پسند جانیں یعنی یہہ کہ وہ اپنی محبت کا اظہار
راستی اور انصاف کے ساتھ کرتا ہی کیونکہ وہ پاک ہی اس میں تو شک نہیں کہ وہ رحیم و کریم
بھی ہی مگر انسان کی بہبودی اور خوشی کے علاوہ وہ اُس میں پاکیزگی کو بھی چاہتا ہی۔
چنانچہ مرقوم ہی کہ مُبارک وہ ہیں جو پاک دل ہیں کیونکہ وہی خدا کو دیکھینگے یعنی خدا کی ماہیت
اور مرضی سے واقف ہونگے۔ نیکی بجز دل کی پاکیزگی کے نہیں ہو سکتی اور پاکیزگی تب ہی
میسر ہو گی جب خدا کو ہر ایک شی پر ترجیح دیجاویگی اور جہاں دل میں خدا مقدم نہیں
ہوگا وہاں خدا کا عدل اور ہماری اپنی کانشنس گناہ اور سزا کا فتوی ہم پر عائد کرینگے
پس یاد رہے کہ جب خدا اپنی محبّت کو انسان پر ظاہر کرتا ہی تو اُسپر الٰہی پاکیزگی کی بھی
مہر ہوتی ہی اور جیسے پہلے بیان ہوا کہ خدا کی منشا صرف خوشی کو ہی پیدا کرنا نہیں ہی
بلکہ یہہ کہ وہ ایسے شخص کو خوشی عنایت کرتا ہی جو اپنے اعمال میں نیک ہی +

اب اگر انسان کا موجودہ حال دریافت کیا جاوے تو نظر آئیگا کہ الٰہی فتوی
اُسکے حق میں ہرگز اچھا نہیں ہی انسان کو کیا ہونا چاہئے ایک امر ہی اور انسان حقیقت
میں کیا ہی دوسرا امر ہی۔ کانشنس اپنا فیصلہ ہماری عندیہ پر دیتی ہی۔ وہ محض فعل ہی
کی طرف نہیں دیکھتی بلکہ فاعل کی اصلی نیت کو ملحوظ خاطر رکھتی ہی۔ یوں تو ایک فاحشہ
عورت کے بھی ظاہری اعمال شریعت کے مطابق ہو سکتے ہیں مگر خدا دل اور گردوں
کا جانچنے والا ہی +

دُوُم۔ کانشنس انسان کے ارادہ کی طرف دیکھتی ہی اور اُسپر اپنا فیصلہ دیتی ہی

کیونکہ ارادہ میں ذمہ داری شامل ہی۔ دو افعال پیش شدہ سے کسی کو پسند کرنا ارادہ سے
صادر ہوتا ہی اور جہاں ارادہ کاربند ہوا وہاں جوابدہی بھی ضرور ہی جب میں ایک
فعل کرنا چاہتا ہوں اور اُس فعل کے ارتکاب کا ارادہ کرتا ہوں تو اُس موقعہ پر کانشنس
اپنا فتوی مذمت یا مدح کا دیتی ہی۔ خاص چاہنا کسی امر کا داخل گناہ نہیں ہی کیونکہ
خواہش کا پایا جانا ہمارے ذاتی قویٰ سے ہی۔ اسی طرح رغبت کا پایا جانا بھی گُناہ عملی
نہیں ہی مگر یاد رہے کہ یہہ قویٰ عقل اور ارادہ کے زیر حکم ہیں چنانچہ جب خواہش
یا رغبت عمل میں آتی ہی تو یہہ ارادہ کے کاربند ہونیکی وجہ سے ہی یا تو خواہش کے پورا
کرنے کے لئے یا اُسکے روکنے کے لئے۔ مثلاً میں ایک فحش ناول پڑھنا چاہتا ہوں میری
رغبت بھی کتاب کے پڑھنے کے لئے رجوع ہی اور میری عقل اخلاقی خرابیوں کو جو
اُسکے پڑھنے سے ظہور میں آوینگی پیش کرتی ہی۔ اب اگر میرا ارادہ باوجود اطلاع یابی
کے اُس کتاب کے پڑھنے کے لئے خواہش اور رغبت کو عمل میں لاتا ہی حتیٰ کہ کتاب
مذکور کے پڑھنے سے خیالات فاسد میرے دل میں اُٹھے تو اُس وقت کانشنس میرے
خیالوں پر مناسب حال فتویٰ مذمت کا دیتی ہی کیونکہ میں نے ارادتاً کتاب مذکور کو
ایسے عندیہ سے پڑھا کہ ناپاک خیالوں کا تصور میرے دماغ میں گھر کر گیا مگر ایسا
بھی ہوتا ہی کہ ہم پاسداری سے دل کے متذکرہ بالا افعال کی حمایت کرتے ہیں
جو واقعی غیر مناسب ہیں۔ ایسے موقع پر کانشنس کی منشاء کو ہم مفقود کر دیتے ہیں
یا ایسے ہیر پھیر میں لے آتے ہیں جس سے بدی ہماری نگاہوں میں نیکی کی صورت
اختیار کر لیتی ہی اور ہماری نفسانی خواہشات اور رغبات اس حالت میں کانشنس سے

مطلق العنان ہوکر رفتہ رفتہ ایسی خوگر ہو جاتی ہیں کہ طبیعتِ ثانی اختیار کرلیتی ہیں۔ حتیٰ کہ کانشنس صحیح صحیح فیصلہ ایسے موقعہ پر نہیں دیتی۔ مثلاً ہندو بیوہ کو اپنے خاوند کی چتا پرستی ہونے دینا اس خیال پر کہ عورت کا یہہ فعل خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری ظاہر کرتا ہی یا غازی کا کسی کافر کو مار دینا اِس امید سے کہ اُسے بہشت نصیب ہوگا وغیرہ +

کانشنس کے فیصلے یہہ ہیں۔ اوّل بعض افعال کا لازمی طور سے صادر کرنا ناسپاس طلب کرتی ہی۔ دوم بعض کی فروگذاشت اور نہ ہونے پر اُن کی تعمیل کی تاکید کرتی ہی۔ سوم اُن افعال پر خوشی کا اظہار کرتی ہی جن کا واجب اور لازم طور سے صادر ہونا طلب کرتی ہی اور افعال مذکورہ کے عدم صدور سے یا اُنکے نامناسب طور پر صادر ہونے سے ناراضگی ظاہر کرتی ہی۔ چہارم اُن افعال کے ارتکاب کو جن سے وہ منع کرتی ہی غیر واجب اور مستوجب سزا قرار دیتی ہی۔ عموماً انسان مناسب اور نامناسب کی تمیز کرتا اور پسند کرتا ہی مگر خطاکار اور مستوجب سزا ہونا پسند نہیں کرتا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ خدا کو کریم اور رحیم کہنا ہمیشہ ورد زبان رکھتا ہی مگر خدا کو عادل اور راست اور پاک قرار دینے سے ٹلتا اور چوکتا ہی +

اصطلاحات متعلقہ کانشنس

جذبات

انسان میں بعض ایسی طاقتیں موجود ہیں جو بحالتِ تحریک فعل کی طرف متحرک

اور راغب کرتی ہیں۔ یہہ جذبات مختلف ناموں سے نامزد ہیں مثلاً بعض تو اُن کو اصول عمل بتاتے ہیں بعض سر چشمہ و منبع عمل اور بعض اصول عندیہ مگر ان سب کا مطلب ایک ہی ہی بعض جذبات تو نفسانی ہیں مثلاً بھوک پیاس اور خواہش نسل وغیرہ۔ یہہ جذبات ہماری عقل اور ارادہ کے مطیع اور زیر فرمان ہیں اور جس شخص میں یہہ جذبات محکوم اور متبوع نہیں ہیں۔ اُس میں اور محض حیوان میں کچھہ تفاوت نہیں ہی+

جذبات کی طبعی تفریق بندی۔ اوّل خواہشات۔ دوم رغبات یعنی میلان طبیعت۔ سوم قوت انصاف یا فیصلہ۔ خواہش کی تعریف پہلے گذر چکی ہی نفسانی خواہشات کا ایک معین وقت ہوتا ہی اور خواہش کے پورے ہونے پر وہ ساکت ہو جاتی ہیں۔ مگر ذہنی خواہشات متواتر اپنی مشق اور حرکت سے ہی خوش رہتی ہیں۔ مثلاً خواہش علم یا خواہش سوسائٹی وغیرہ۔ خواہشات طبعی گناہ میں داخل نہیں ہیں۔ مگر غیر طبعی خواہشات جیسے حرص و آز اور خود غرضی جو اپنا نفع و فائدہ دوسروں کے نقصان میں ڈھونڈتی ہیں گناہ میں داخل ہیں+

دوم۔ رغبت۔ یہہ طبیعت کا ایک میلان ہوتا ہی جس سے کہ دوسروں کی بھلائی یا بدی منظور ہو۔ اس میں یا تو وہ دوسروں کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہی یا محبت اور عزت کی نظر سے۔ مثلاً کسی انسان میں نیک اوصاف ملاحظہ کر کے پہلے طبیعت خوش ہوتی ہی۔ پھر رفتہ رفتہ اُسکو نیک سیرت سے منسوب کر کے اُسکی عزت و توقیر کرتی ہی اور یا محبت کی نگاہ سے اُسے دیکھتی ہی۔ اسی طرح کسی مصیبت زدہ کو دیکھہ کر ہمدردی اور غمگساری کا اظہار کرتی ہی۔ یا کسی حاسد کو دیکھنے سے اظہار نفرت کرتی ہی اور پھر بتدریج

اُسکو حقارت اور کراہیت کی نظر سے دیکھتی ہے ۔

سوم ۔ قوت انصاف ۔ اعمال کی اخلاقی خصوصیتوں کا ہم کو علم ہوتا رہتا ہے اور اِس علم کی تین صورتیں ہیں ۔ محسوس کرنا ۔ غور کرنا ۔ مقابلہ کرنا ۔ کسی عمل میں اخلاقی وصف یا جوہر کا دریافت کرنا بذریعہ انصاف ہو سکتا ہے ۔ کسی عمل کی نسبت محض علم کا ہی ہونا ایک امر ہے لیکن اس امر کا واجب یا غیر واجب قرار دینا دوسری بات ہے اور یہی فیصلہ انصاف کہلاتا ہے ۔ مثلاً زید بکر کو مارتا ہے ۔ مارنیکی اطلاع تو فعل مذکور کا صرف علم ہے لیکن جب مارنے کی مختلف صورتوں پر غور کیا جاویگا تو اُس وقت قوتِ انصاف عمل میں آتی ہے ۔ چنانچہ اگر مارنے کا فعل بغرض تنبیہہ و تادیب عمل میں آیا ہے یعنی زید بحیثیت پدری اپنے بیٹے بکر کو مار رہا ہے تو فیصلہ ایک ایسی قسم کا ہوگا جس میں جذبات بھی باپ کے حق میں عمل میں آوینگے ۔ برخلاف اِسکے اگر زید حسد یا کینہ کی وجہ سے بکر کو مارتا ہے تو فیصلہ دوسری قسم کا ہوگا اور جذبات بھی زید کے مخالف عمل میں آئینگے ۔ پس اس بیان سے مترشح ہے کہ اخلاقی وصف کا علم بذریعہ قوتِ انصاف پیدا ہوتا ہے مگر قوتِ انصاف کا ایک خاص معیار اور اندازہ ہوتا ہے ۔ جس کی کسوٹی پر ہر ایک عمل پرکھا جاتا ہے اور جیسا معیار قائم کیا جاویگا ویسا ہی فیصلہ عمل کی نسبت واجب یا غیر واجب ہوگا ۔

اِنصاف بحالتِ رغبت دو قسم کا ہوتا ہے ۔ ایک وہ ہے جو حکمتِ عملی اور مصلحت کو مدِ نظر رکھتا ہے تاکہ ذاتی فائدہ متصوّر ہو ۔ دوسرا راستی کو مقدم رکھتا ہے اور طبیعت پر نگراں رہتا ہے اور فرض اور ذمہ واری اور احسان کا لحاظ رکھتا ہے ۔

جذبات کی اخلاقی تفریق بندی

جذبات کے متحرک ہونے کی حالت میں اگر ارادہ بھی ساتھ دیتا ہی تو وہ اخلاقی صورت اختیار کرتے ہیں ورنہ جذبات طبعی اخلاقی وصف نہیں رکھتے ہیں۔ طبعی خواہش جو متواتر خودغرضی کی خاطر عمداً اجاری رکھی جاوے وہ بھی اخلاقی صورت اختیار کرلیتی ہی۔ اِسی طرح رغبت کے ساتھ جب ارادہ بھی شامل ہو تو وہ بھی اخلاقی صورت میں شمولیت اختیار کرلیتا ہی؎

حرکاتِ باطنی

یہہ جذبات میں ایک قسم کے جوش کو پیدا کرتی ہیں۔ رغبات طبعی مختلف ہیں۔ اگر ایک قسم کی رغبات عمل میں آتی ہیں تو دوسری قسم کی رک جاتی ہیں۔ جہاں محبّت ہی وہاں نفرت کو جگہ نہیں ہی اور جہاں نفرت ہی وہاں محبّت کا نام نہیں ہوگا۔ باطنی حرکت طبیعت میں ایک قسم کے جوش کو پیدا کرتی ہی۔ مثلاً متحیر ہونا خوف زدہ ہونا رنجیدہ ہونا وغیرہ۔ یہہ حرکات بعض اوقات طبیعت پر ایسے طور سے طاری اور حاوی ہوجاتی ہیں کہ عقل و ہوش کو بھی دبالیتی ہیں اور ایسی حالت میں ارادہ اپنر قابض نہیں ہوسکتا ہی۔ پھر ایک اور قسم کی حرکات باطنی ہیں جو شوق اور عظمت اور خوشی کو پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً ایک حسین اور خوبصورت شی کو دیکھکر انسان کی طبیعت خوش ہوتی ہی اور وہ اُس کی مناسب حال تعریف و توصیف بھی کرتا ہی۔ یا کسی باعظمت اور شاندار

شئ کو ملاحظہ کرکے اُس کی عظمت اور بڑائی کا خیال دل میں جاگزیں ہوتا ہی +

احساسِ اخلاقی

یہہ وہ خصائل انسان میں ہیں جو اخلاقی دائرہ میں اعمال کو اور اُن کے عامل کو مدنظر رکھتے ہیں۔ احساس اخلاقی سے اسواسطے نامزد کئے گئے ہیں کہ انہیں کے طفیل سے جب وہ عمل میں آتے ہیں ہماری اخلاقی سرشت محسوس کیجاتی ہی۔ جیسے اخلاقِ ذہنی ذہن کے عمل میں آنے سے محسوس کئے جاتے ہیں ویسے ہی احساس اخلاقی واجبات اور غیر واجبات کے امتیاز کرنے سے محسوس ہوتے ہیں اور یہہ اُس وقت عمل میں آتے ہیں جب کسی عمل کی نسبت اخلاقی فیصلہ کیا جاتا ہی۔ احساس اخلاقی اخلاقی فیصلوں کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہی کہ وہ صرف فعل ہی کے ہمرکاب ہوں یا فعل کے کرنیوالے کو خواہ وہ خود فاعل ہو یا کوئی دوسرا مدِنظر رکھتے ہیں اور ان صورتوں سے اُن میں اختلاف پڑجاتا ہی۔ جیسے زید اور بکر کی مثال میں اوپر بیان کیا گیا ہی۔ احساس اخلاقی خوشی پیدا کرتے ہیں یا رنج۔ اگر کانشنس کا فیصلہ رضامندی کا ہی تو خوشی اگر ملامت کا ہی تو رنج۔ اور احساس اخلاقی کی مختلف حالتیں ہیں اگر کل انسانی قوائے عملی پر کانشنس کا واجب اور مناسب تسلط ہی تو وہ چہرہ میں بشاشت کو پیدا کرتی ہیں اور انسان مطمئن رہتا ہی۔ اگر اس کے برعکس ہمارے کسی اخلاقی عمل پر فیصلہ مذمت اور ملامت کا ہوتا ہی تو انسان خود اپنی نگاہ میں گرجاتا ہی اور ایک قسم کی تشویش اور ملال چہرہ پر نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے کے فعل پر اگر فیصلہ اُسکے حق میں نیک

ہی تو توقیر اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہی اور قابل تعریف سمجھا جاتا ہی ورنہ اُس کی بےحرمتی
اور بےعزتی ہوتی ہی جب ہم سے کوئی واجب فعل ظہور میں آتا ہی تو ہم اپنے حق میں ایسا فیصلہ
دیتے ہیں جو مدح اور تحسین کا سزاوار ہوتا ہی اور اُس سے ایک قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہی
اگر ہم اپنے اعمال کو کانشنس کے مطابق برابر صحیح اور درست رکھتے ہیں تب اپنی ذاتی سیرت
کے بارہ میں خاطر خواہ فیصلہ دیکر اپنی مناسب قدر اور عزت کرنے لگتے ہیں۔ یا یوں کہیں
کہ ایسے خصائل ہم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ ہم اپنے تئیں وقر و حرمت کے ساتھہ دیکھنے
لگتے ہیں اور برعکس اسکے بےشعورے اور بےحرمت ہوجاتے ہیں اور جہاں اپنے
فعل پر فتویٰ ملامت کا ہوتا ہی تو طبیعت پر نہ صرف تشویش اور ملال چھا جاتا ہی بلکہ ہم
بےچین اور مضطر ہوجاتے ہیں۔ پہلے ہم خود اپنے آپسے شرمانے لگتے ہیں اور اگر بُرے
افعال کے عادی ہوجاویں اور کانشنس بھی اپنا سلسلہ ملامت کا جاری رکھے تو ہم
سخت نادم ہونگے اور جب یہہ باطنی حرکت ندامت کی عمل میں آتی ہی تو اسکی منشا یہی
ہوتی ہی کہ انسان فعل بد سے اجتناب کرے اور اگر وہ اُس حالت میں بھی اپنے بُرے
افعال پر غالب نہ آسکے تو یہہ حرکت باطنی اسقدر زور دیتی ہی کہ انسان اُسکا عادی
ہوکر رفتہ رفتہ مطلق العنان ہوجاتا ہی حتّٰی کہ انسانی رتبہ سے دور جا گرتا ہی اور نڈر اور
بےپروا ہوجاتا ہی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہی کہ ایک طرف کانشنس بُرے فعل کے ارتکاب
سے ملامت کر رہی ہی اور دوسری طرف انسان درپردہ ریاکاری اور دھوکہ سازی کو
کام میں لاتا ہی اور بےبنیاد معذرت پیش کرکے بُرے کاموں میں برابر مصروف رہتا ہی
حتّٰی کہ بےشرم اور بےحیا بن جاتا ہی اور ایسی ابتر حالت اور نکبت میں مبتلا ہوجاتا ہی

کہ واجب اور غیر واجب میں امتیاز کرنا ہی بھول جاتا ہے۔ یاد رہے کہ احساس اخلاقی کا انحصار ہمارے اخلاقی فیصلوں پر ہوتا ہے۔ اگر ہمارا فیصلہ صحیح نہیں ہے تو بموجب صادر شدہ فیصلہ کے ہمارے احساس بھی ہونگے۔ کیونکہ یہہ ممکن ہے کہ ہماری کانشنس تو قانون کی موجودگی کی صحیح خبر دے مگر ہمارا فیصلہ غلط ہو۔ عموماً مشاہدہ میں آتا ہے کہ لوگوں کے اخلاقی فیصلوں میں اختلاف پایا گیا ہے +

ارادہ

یہہ وہ طاقت انسانی ہے جو دیگر قوائے انسانی پر قابض ہے اور جسکا عمل ہمارے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور جذبات پر بھی اپنا قبضہ و تسلط رکھتا ہے۔ کیونکہ یہہ امر ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم میلان کی طبیعت کو جو جذبات کی تحریک سے ظہور میں آتی ہے کسی شی کیطرف مائل ہونے دیں یا روکیں۔ جیسے پہلے بیان ہو چکا۔ خواہش اُس چیز کی تمنا اور آرزو کرتی ہے جسکی ہم میں کمی ہے مگر ارادہ یا اختیاری عمل ہمارا اپنا قرار دادہ عمل ہے۔ حرکات باطنی اُس وقت محسوس ہوتی ہیں جب کسی طرف ہماری طبیعت کا میلان پایا جاتا ہے مگر ارادہ کا ظہور اُس باطنی طاقت سے پیدا ہوتا ہے جو حرکات باطنی اور رغبات پر حکم رکھتی ہے۔ جذبات خارجی اشیاء سے متحرک ہوتے ہیں مگر ارادہ جسکا تعلق باطنی ہے وہ اُن پر قابض ہے۔ ارادہ کا پایا جانا اس امر پر دال ہے کہ انسان مختارِ فعل اور ہیئت سے ممتاز ہے۔ عقل تو محض اخلاقی علم کا پتہ دیتی ہے مگر ارادہ اخلاق پر مسلط اور قابض ہے۔ اخلاق کے متعلق انسان کا مختارِ فعل ہونا لازمی امر ہے۔ ارادہ عقل کا محتاج ہے۔ گو وہ

ہر ایک باطنی قوت پر قابض ہی۔ مگر تاہم عقل کی ہدایت اور روشنی کا ہمیشہ محتاج ہی اس
لئے وہ جو خود اپنے پر قابض ہی عقل کو بھی اپنے ہمرکاب رکھتا ہی۔ کیونکہ عقل ہی کے
طفیل سے قانون کی موجودگی کا پتہ لگتا ہی اور عقل ہی تعلیم اور تربیت دیتی ہی۔ اور اس تعلیم
و تربیت کے موافق ارادہ عمل میں آتا ہی اور جب انسان میں عقل اور ارادہ دونوں کا کلی
اتفاق و اتحاد ہوتا ہے تب شریعت کی پوری پوری تعمیل و تکمیل عمل میں آتی ہی۔ ورنہ ارادہ
جذبات کا محکوم ہو کر اور عقل سے رہنموئی حاصل نہ کر کے انسان کو انسانی رتبہ سے
گرا دیتا ہی۔ ارادہ جذبات کی ہدایت اور ترغیب کا محتاج نہیں ہی۔ ہاں بے شک
وہ ارادہ کو کسی عمل کی طرف راغب کرتی ہیں۔ مگر ارادہ کو اختیار ہی کہ ترغیب پر
عمل کرے یا نہ کرے۔ جذبات بیشک ہدایت کے محتاج ہیں اور عقل اور ارادہ دونوں
کے زیر نگرانی ہیں۔ ہمارے ارادہ کا کام ہی کہ وہ اعلیٰ اور ادنیٰ نفسانی طاقتوں میں
پورا اور بامحل اندازہ قائم رکھے۔ تاکہ ادنیٰ اعلیٰ پر غالب نہ ہونے پائے۔ البتہ یہہ ہو سکتا
ہی کہ حرکات باطنی اور جذبات کو ارادہ کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہ آوے
مگر یہہ بھی ارادہ کا اختیاری عمل ہی۔ جسکا وہ ذمہ وار ہی اور یہہ بھی یاد رہے کہ ارادہ
میں کوئی نہ کوئی عندیہ ضرور شامل ہوتا ہی اور عندیہ وہ طاقت ہی جو انسان کو کسی
فعل کی طرف راغب کرتی ہی مگر ارادہ میں وہ طاقت ہی جسکا یہہ اختیار ہی کہ خواہ
وہ اس فعل سے جس کی طرف ترغیب دی گئی ہی اپنے آپ کو روکے یا نہ روکے
اسلئے عندیہ بھی ارادہ کو بری الذمہ نہیں کرتا ہی +

ہم احساس اخلاقی کے متعلق یہہ بیان کر آئے ہیں کہ باوجود کانشنس کی موجودگی

کے واقعی انسان کے فیصلوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ انسان فطرتی طور پر واجب اور غیر واجب کی صحیح تمیز کرتا ہے عموماً کل کا واجبات اور غیر واجبات میں مابہ الامتیاز کی نسبت اتفاق ہے مثلاً سچ بولنا کیا ہے۔ اس کیفیت اور حقیقت کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح انصاف کیا ہے۔ یا مہربان ہونا کیا ہے۔ ان کیفیتوں سے سب لوگ آشنا ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں ہے جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بتائیگا مگر اختلاف اِس امر کے فیصلہ میں پایا جاتا ہے کہ غیر واجب فعل کیا ہے؟ حق اور برحق کو تو واجب قرار دینے میں کسی کو تامل نہیں ہے مگر غیر واجب کو غیر واجب قرار دینا اس میں مختلف فیصلے دیئے جاتے ہیں حقیقت میں کانشنس ہم کو دھوکا نہیں دیتی ہے مگر فیصلہ کرنے کیوقت جب انسان کے اندر احساس اخلاقی اور جذبات بھی عمل میں آتے ہیں اور اُسکو کسی فعل کے ارتکاب کی طرف رجوع اور مائل کرتے ہیں تب وہ اُس فعل کی پاسداری کر کے کوئی نہ کوئی حیلہ تراشتا ہے اور اپنے ذاتی فائدہ کا فیصلہ کرالیتا ہے اور یوں غیر واجب فعل کو واجب قرار دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس قسم کے غیر واجب افعال جو واجب کی صورت میں روا رکھے جاتے ہیں ایسے خصائل خصائص پیدا کرتے ہیں جو واجب اور غیر واجب کی تمیز کو بالکل اُٹھا دیتے ہیں۔ دروغ مصلحت آمیز کا اصول جب انسان روزمرہ کے معاملات میں استعمال کرنے لگ جاتا ہے تو دروغگوئی وظیفہ کے طور پر وردزبان کرلیتا ہے اور رفتہ رفتہ اُسکا ایسا چسکا لگ جاتا ہے کہ یا جھوٹ نیرا ہی آسرا اُسکا دستور العمل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح دیانتداری یا وفاداری یا انصاف کی کیفیت کو کوئی بھی بُرا نہیں کہتا۔ مگر خیانت اور خود غرضی اور ظلم

کو جائز رکھنے کے بیسیوں عذرات پیش کئے جاتے ہیں۔ نکاح کو سب متبرک مانتے ہیں۔ مگر شہوت پرستی کے لئے بہت کچھ عذر خواہی کی جاتی ہے۔ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ اسکی وجہ اول یہہ ہے کہ قوت انصاف نفسانی آلائش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کمزور اور خستہ ہو جاتی ہے۔ واجب اصول تو کانشنس کے علم کے مطابق ویسے کے ویسے ہی قائم رہتے ہیں۔ مگر اُن کا عمل کے وقت خیال نہیں رکھا جاتا ہے کیونکہ اُس موقعہ پر طبیعت کا میلان اُن جذبات کی طرف رجوع ہوتا ہے جن کی خاطر اور جن کے حق میں فیصلہ دیا جاتا ہے۔ درحقیقت اِنسان میں بعض ایسے خصائل پیدا ہو گئے ہیں جو ایسے افعال کی طرف ترغیب دیتے ہیں جن سے کانشنس اتفاق نہیں کرتی۔ مثلاً حسد یا خودغرضی کا پایا جانا۔ جہاں یہہ خصائل طبیعت میں موجود ہیں وہاں کانشنس کے برخلاف اُن کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور اُن کے عمل میں لانے کے لئے انسان کوئی نہ کوئی حیلہ جوئی کرتا ہے +

دُوم۔ یہہ تو سہولیت سے مان لیا جاتا ہے کہ خیر خواہی ایک نیک کیفیت کا نام ہے مگر عملاً خودغرضی کو ہی مصلحت سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک انسان ایسا ہے جو صریحاً دنیاداری میں ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ خدا کا اور دوسروں کی خیر خواہی کا خیال تک بھی اُس کے دل سے مٹا ہوا ہے مگر تاہم وہ خودغرضی اور دنیاداری کو خود انکاری اور محنت اور جفاکشی کے اخلاق پسند نام سے تعبیر کر کے کانشنس سے اپنا پیچھا چھڑاتا ہے۔ یوں تو چور کو بھی جفاکش اور دلیر کہنا موزوں ہوگا۔ جو رات کی تکلیف کو اپنے اوپر گوارا کرتا ہے اور کمال بہادری اور جرأت سے گھر توڑ کر اندر داخل ہوتا ہے اور اپنی جان پر کھیل کر ہر ایک شے پر اپنا ہاتھ صفا کرتا ہے + حقیقت یہہ ہے کہ جب انسان کی طبیعت کا میلان کسی فعل کے ارتکاب

کے لئے بڑھا ہوا ہوتا ہی تو وہ کوئی نہ کوئی معذرت پیش کر کے فعل مذکور کو واجب قرار دینے لگ جاتا ہی +

سوم۔ لوگ عموماً فروغ یافتہ رائیوں کو یا آبائی خیالات کو جو نسلاً بعد نسلٍ رواج پا گئے ہیں اُن کو ذاتی تفتیش کئے بغیر سچ مانتے چلے آئے ہیں۔ یہہ فطرتی تقاضا ہی اور اس کی تواریخ بھی شاہد ہی کہ پہلے پہل انسان محکوم ہونا پسند کرتا ہی اور اُس حالت میں ہر ایک امر کو بلا ذاتی تفتیش باور کرتا ہی اور اس طرح پر سچائی کی سبیل نہ پاکر جھوٹ اور وہم پرست بن جاتا ہی +

چہارم۔ احساس اخلاق بھی اس حالت میں ایک غلط فیصلہ کو ویسا ہی آمنّا و صدقنا کر لیتے ہیں جیسے ایک صحیح اور درست فیصلہ کو۔ مثلاً بعض اقوام انتقام لینا ثواب میں داخل سمجھتی ہیں اور ایسے موقعہ پر تشدد سے پیش نہ آنے کو فرض کی عدولی سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں صدہا ہندو گنگا میں اشنان کرنا فرض واجب سمجھتے ہیں اور اُن کا فرض مذکور سے غفلت ورزی کرنا گناہ شمار کیا جاتا ہی۔ ایسی صورتوں میں ظاہر ہی کہ بداعمال بھی نیک اخلاق کے نام سے کئے جا سکتے ہیں +

انسان کی اخلاقی حالت

پہلے ضروری ہی کہ ہم اُن فیصلوں کی خصوصیتوں کا جو کانشنس کے نام سے کئے جاتے ہیں اجمالاً بیان کریں +

اوّل کانشنس اپنا فتویٰ ذہنی افعال پر دیتی ہی مگر کسی ظاہری فعل کو ہی دیکھکر

فیصلہ نہیں دیتی بلکہ عندیہ اور احساس ذہنی کو زیر نظر رکھکر اپنا فیصلہ دیتی ہی چنانچہ اگر
فعل مذکور نیک نیتی سے عمل میں آیا ہی تو اپنی رضامندی ظاہر کرتی ہی اور اگر بدنیتی
سے وقوع میں آیا ہو تو ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرتی ہی +

دُوم اُسکا فیصلہ اُن افعال پر ہوتا ہی جو بالارادہ صادر ہوتے ہیں تعریف
ارادہ پیشتر گذر چکی ہی۔ ذمہ واری کی اصل درحقیقت انسان کے ارادہ میں مرکوز ہی۔
اگر انسان کی مرضی پابند شریعت ہی تو اُس کے افعال نیک گردانے جاتے ہیں اور
اگر وہ شریعت کی اطاعت کو قبول نہیں کرتی ہی تو گناہ اور خطا میں داخل ہی۔ جہاں
شریعت سے دل کا بگاڑ پیدا ہوتا ہی وہاں بتدریج یہہ نتیجہ پیدا ہو جاتا ہی کہ وہ قوت
فیصلہ کو بھی اپنی طرف رجوع کر کے اپنا ممد و معاون بنا لیتا ہی اور جب قوت انصاف
خراب اور خستہ ہو جاتی ہی تو نتیجہ یہہ پیدا ہوتا ہی کہ ہم اُن افعال کو جو اچھے ہیں بُرا کہنے
لگتے ہیں اور بُرے کو اچھا۔ یہی وجہ ہی کہ بُرائی کا کوئی نہ کوئی فائدہ یا اُس کی کوئی
نہ کوئی تاویل بیان کیجاتی ہی حتّٰی کہ بُرائی بھی نیکی میں شامل کر لی جاتی ہی۔ اِس کے
علاوہ ایسا بھی ہوتا ہی کہ انسان باوجود گنہگار ہونے کے بھی اپنی خصلت اور سیرت
کو قدر اور وقعت کی نظر سے دیکھنے لگ جاتا ہی۔ اس کی وجہ یہہ ہوتی ہی کہ وہ اپنے
گناہوں کی طرف کم دیکھتا ہی اور اپنی کسی نہ کسی خوبی اور حسن عمل پر زیادہ زور دیتا ہی
اور اس طرح انسان اپنے گناہوں پر پردہ پوشی کر کے اور اپنی نیکی کو دکھاکر ایک دھوکہ
کی ٹٹی کی آڑ بنا لیتا ہی اور ریاکاری اور دھوکہ بازی سے کام لینے لگ جاتا ہی سقراط
کا یہہ مقولہ عام طور سے زبان زد خلائق ہی کہ "ای انسان تو اپنے کو جانچ" اور اگر دیکھا جاوے

تو فی الحقیقت انسان اپنا باطنی مطالعہ بہت کم کرتا ہے۔ وہ خارجی ذرائع کے علم کے حاصل کرنے میں ہر وقت درپے جستجوئے رہتا ہے کیونکہ اُس علم کی تحصیل سے اُسکا تکبر اور غرور بڑھتا ہے اور غیر لوگوں میں اُس کی عزت و توقیر ہوتی ہے مگر اپنے ذاتی مطالعہ سے اس لئے چوکتا اور کنارہ کش ہوتا ہے کہ ایسے مطالعہ سے اُس کی تحقیر اور ذلت ہوتی ہے۔ ہزارہا اشخاص ایسے موجود ہیں جو بڑے بڑے علما و فضلا مانے جاتے ہیں مگر وہ اپنے باطنی علم سے مطلق بےبہرہ اور ناآشنا ہیں کیونکہ وہ یہہ نہیں جانتے کہ اُن کا علاقہ خدا اور شریعت کے ساتھہ ہے ✝

یہہ بھی مخفی نہ رہے کہ انسان کا اپنے ذاتی مطالعہ سے کنارہ کش ہونا یہہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ قصوروار اور خطاکار ہے مگر جو انسان اپنے ذاتی مطالعہ سے ٹلتا ہے اُس میں سے رفتہ رفتہ گناہ کی شناخت کا مادہ بھی جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ گناہ اُس میں طبیعت ثانی اختیار کرلیتا ہے۔ حتّٰی کہ اُسکا دل اُسکو دھوکہ دینے لگ جاتا ہے جسکی تصدیق کتب مقدسہ سے بھی پوری طرح سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے کہ "انسان کا دل سب چیزوں سے زیادہ حیلہ باز ہے۔ ہاں نہایت فاسد ہے اُس کو کون دریافت کرسکتا ہے"۔ یہہ دھوکہ بازی انسان کی شرارت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جو کہ خود اپنے آپ کو اور نیز غیروں کو بھی دھوکہ میں ڈالنا پسند کرتا ہے۔ کیونکہ حیلہ بازی سے وہ اپنی کچھہ نہ کچھہ قدر و منزلت کرواتا رہتا ہے اور اپنے نیک خصائل اور افعال دوسروں پر ظاہر کرکے باوجودیکہ وہ نہایت ہی بدکار ہے اپنے تئیں نیک اور پسندیدہ جتاتا رہتا ہے اور حیلہ بازی کو حکمت عملی اور مصلحت کے نام سے موسوم کرکے کھوٹے شاہی سکہ کی طرح چلاتا رہتا ہے۔

اور خود غرضی کو دور اندیشی اور حکمت اور تدبیر سمجھتا ہی اور دنیاوی آسایش و آرام طلبی کے پیچھے لگے رہنا سوسائٹی کا عام دستور اور رواج تصوّر کر لیتا ہی اور اس طرح انسان دل کی حیلہ سازی کی بدولت رفتہ رفتہ اپنے تئیں ایسا عالی جاہ اور عالیشان سمجھنے لگتا ہی کہ ہیچوں دگرے نیست گویا اُس کی شان میں آسمان سے نازل ہوا ہی حالانکہ جو کچھ وہ حقیقی اور اصلی ہی اس دنیت اور رذالت پر ذرا بھی نظر نہیں کرتا۔ اگر عوام الناس میں وہ خود غرض اور حاسد مشہور ہی تو برعکس اس کے اپنے تئیں آزاد اور فیاض سمجھتا ہی اور یہی وجہ ہی کہ ایسے انسان کا آئندہ پیمانہ اور اندازہ لگانا صحیح نہیں ہوا کرتا چنانچہ اُنکے خیال میں یہی امر جاگزیں رہتا ہی کہ جو کام آج پورا نہیں ہوا وہ آئندہ کبھی نہ کبھی درجہ تکمیل کو پہنچیگا کیونکہ اُس کو اپنی لیاقت اور طاقت پر بڑا ناز اور فخر ہوتا ہی اور اپنے زعم میں یہہ تصوّر کر لیتا ہی کہ جو کچھ آج نہیں ہوا وہ تھوڑی سی ہی ہمت صرف کرنے سے کل سرانجام ہوگا۔ افسوس صد افسوس! کہ انسان دوسروں کی حیلہ سازی سے محفوظ رہنے کیواسطے تو بڑی چابکدستی سے کام لیتا ہی مگر اپنے دل کی حیلہ سازی سے بچاؤ کیواسطے کوئی تدبیر اور بندوبست عمل میں نہیں لاتا ہی ؎ برین عقل و دانش بباید گریست +

آخر الامر انسان اِس طرح گناہ کرتے کرتے اور شبانہ روز اُس میں مبتلا رہ کر بالکل تباہ اور خستہ حال ہو جاتا ہی۔ وہ شخص جو خدا کا پورا پورا مطیع اور فرمانبردار ہی وہ اپنے فیصلوں میں مطلقاً لغزش نہیں کھائیگا بلکہ غلطی اور سہو سے محفوظ رہیگا۔ مگر جس نے بغاوت کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہی اُس کے تمام قوائے ودیعی رفتہ رفتہ تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں اور اسی کا نام کتبِ مقدسہ میں روحانی موت رکھا گیا ہی +

باب دوم

فصلِ اوّل

اِس میں ہم یہہ ظاہر کرینگے کہ عقل اور ضمیر کے وسایلِ معلومات دربارہ خدا اور خود اپنی نسبت محدود ہیں اور تواریخاً ثابت ہوتا ہی کہ وہ اپنے اندازہ حد سے تجاوز کرنے میں گمراہ ہوئے ہیں اس لئے ہماری عقل اور ضمیر کو الٰہی ہدایت کی ضرورت ہی مگر الہام کی ضرورت بیان کرتے ہیں ہم نیچر کے وسایل معلومات کو برطرف اور رد نہیں کرتے ہیں اور نہ اس حقیقت کا ہم کو انکار ہی کہ الٰہی نیکی اور حکمت نیچر کے برابر شامل حال ہی چنانچہ جب یہہ کہا جاتا ہی کہ عقل اور کانشنس ہر دو قوائے انسانی میں مادہ فطرتی ترقی کا موجود ہی تو ہم اس امر کو تسلیم کرکے یہہ کہتے ہیں کہ مادہ ترقی کا اُس صورت میں قائم اور جاری رہیگا جب کوئی امر درمیانی حائل ہوکر ترقی کا مانع نہ ہو حقیقت میں گناہ وہ امر مانع ہی جو ہماری زندگی میں شامل حال ہوکر عنکبوتی جالے کی طرح تنا ہوا ہی جس کی وجہ سے ہماری قوتِ فہم سُست ہوگئی ہی اور ہمارا ارادہ خستہ اور تباہ ہوگیا ہی۔ بس اس سبب سے نیچر کی ہدایت عرفانِ الٰہی تک رسائی کے لئے اِنسان کے واسطے کافی نہیں ہی اور واقعی جس قدر ہم نے تحقیقات بذریعہ عقلِ مجرد اور کانشنس کے خدا اور خود اپنی نسبت کی ہیں وہ صحیح اور درست

نہیں۔ اس لئے ہمیں ایک ایسے آلۂ ہدایت کی ضرورت ہی جو قوا ر انسانی کی تحقیقات کا اعلان
معتبر اور مستند طور پر کرے حتیٰ کہ شک وشبہ کو اُس میں کچھ دخل نہ رہے بلکہ اُن کو ایسی منوّر
اور باخبر کردے کہ وہ اپنی حالت موجودہ سے آشنا اور بہرہ اندوز ہوجاویں اور خدا کی خصلت
وسیرت اور گہرے رازوں سے بھی معرفت اور وقفیت حاصل کریں۔ کیونکہ خدا درحقیقت
ایک ایسی روشنی میں رہتا ہی جہانتک کسی بشر کی رسائی ہونی ناممکن ہی۔ آلہی ہدایت کی
منشا یہہ ہرگز نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے نیچری ظہورات کو مٹا دے بلکہ اُسکی یہہ منشا ہی کہ
نیچر کی آواز کو جو ہمارے اور خدا کے حق میں شاہد ہی زیادہ زور اور تحقیق کے ساتھ اُس کو
گوش گذار کرکے ہمارے ذہن نشین کرے کیونکہ گناہ کی موجودگی کی وجہ سے ہمارے کان
اونچا سنتے ہیں اور ہماری آنکھیں مندھی ہوئی ہیں (متی ۱۳: ۱۵) ہاں اگر دنیا کی بیگناہی
کی حالت ہوتی تو نبوت اور معجزات کی چنداں ضرورت نہ ہوتی لیکن جبکہ دنیا کی موجودہ
حالت گناہ سے آلودہ اور ناپاک ہی تو نیچر کی آواز کے علاوہ زیادہ تر پرزور اور پراثر وسائل
کی ضرورت معلوم ہوتی ہی کہ جس سے دنیا کی صلاح اور فلاح ہوسکے۔ نیچر گو خدا کے جاہ و
جلال کو بدستور ظاہر کرتا رہے مگر گناہ نے انسان کی آنکھوں پر ایسا پردہ تاریکی ظلمت
کا ڈال دیا ہی اور اُن کے کانوں کو ایسا بہرہ بنا دیا ہی کہ وہ نیچر کے اعلان سُننے کے
لئے قاصر اور گمراہ ہیں۔ گو جلوۂ حق نیچر میں اپنی روشنی اور جلال کو اس ظلمت کدہ دنیا
میں بدستور چمکا رہا ہی مگر گناہ کی تاریکی اور ظلمت سے انسان اُس کے پہچاننے اور
جاننے سے عاری اور لاچار ہی۔ عموماً یہہ سمجھا جاتا ہی کہ ہماری عقل اور نیچر دونوں خدا
کا عرفان جتانے میں پوری پوری قابلیت اور استعداد رکھتے ہیں مگر موزوں اور زیبا

یہہ ہو کہ ہم تصورات سے قطع نظر کر کے حقیقت پر غور کریں۔ چنانچہ تواریخاً ثابت ہوتا ہو کہ عقل نے اپنی تحقیقات میں فلسفہ سے کام لیا ہو اور نیچر کو بھی لباس فلسفہ میں ظاہر کیا ہو اور اُن تحقیقات کو عوام الناس نے اپنا خضرِ راہ نہیں مانا ہو۔ مثلاً اہل ہنود کے فلسفی خیالات کے مطابق جہلا نے پوری پوری تقلید نہیں کی ہو۔ عرفان الٰہی کے متعلق جو جو شعاعیں ویدوں میں آشکارا ہیں وہ برہمنوں اور اپنیشدوں میں فلسفہ لباس میں ظاہر کی گئی ہیں۔ مگر جہلا جو عموماً احساس اور اوہام سے کام لیتے آئے ہیں وہ فلاسفر کے خدا کو چھوڑ کر دیوی دیوتاؤں اور بتوں کی سیوا کرتے رہے ہیں اور ریا فیلسوفوں کے ساتھ ویدانت کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں فیلسوفوں میں بھی خدا اور خود اپنی نسبت دریافت کرنے میں اختلاف پایا جاتا ہو۔ اہل ہنود کے بارہ میں اپنیشدوں اور مختلف کھٹ درشنوں کو دیکھ کر یہہ بات صاف ظاہر ہوتی ہو کہ متضاد خیالات اُن میں پائے گئے ہیں۔ ہاں یہہ مانا جا سکتا ہو کہ اگر انسان کی عقل اور کانشنس کامل ہوتیں اور ہم بیگناہ ہوتے تب وہ ہماری ہدایت اور رہنمائی پوری پوری کر سکتے مگر انسان کی حالت خستہ اور تباہ ہو اور اُسکی تصدیق میں پولوس رسول بھی کہتا ہو۔ کہ انسان نے اپنی حکمت اور عقل سے خدا کو نہیں جانا اور پھر فرماتا ہو اگر جانا بھی ہو تو اُس کے لائق بزرگی اور حرمت نہیں کی ہو۔ چنانچہ تواریخاً ثابت ہو کہ کوئی بھی فیلسوف ایسا نہیں گذرا ہو جس نے انسان کو گناہ کی زبونی سے پوری پوری نفرت اور کراہیت دلائی ہو۔ یا جذبات پر قابض ہونے کی طاقت عطا کی ہو۔ یا دل کو پاک اور صاف کیا ہو۔ یا خدا کی خصلت اور سیرت کے بارہ میں صحیح صحیح خبر یا اُس کی شان کے

شایاں بیان کیا ہو حقیقت میں جہلا حقیقی خدا کی جگہ بتوں کی پرستش کرتے چلے آئے
ہیں۔ یا خدا کو ایسا جنتا یا ہی گویا وہ ہمارے سے نفسانی خیالات رکھتا ہی اور فیلسوف خدا
کی توحید سے تجاوز کرکے ویدانت میں مبتلا ہوئے ہیں یا خدا کی ہستی سے منکر بن بیٹھے
ہیں۔ استقرائی دلائل جن کا بیان باب اول میں ہوا۔ اُن سے صحیح صحیح کام لیکر تحقیقات
نہیں کی ہی اور دماغی تصورات میں مبتلا ہوکر حقیقی خدا کو دریافت نہیں کیا ہی بلکہ نیچر
کے طریقِ اعمال کا بدستور جاری رہنا دیکھہ کر قانون پرستی میں مبتلا ہوئے ہیں۔
اُنھوں نے نہ صرف خدا کے تعلقات ربوبیت کو ہی نیچر سے نظر انداز کر دیا ہی بلکہ امکان
معجزات سے بھی انکار کیا ہی لیکن ہم کہتے ہیں کہ انسان کے معلومات درباره نیچر اب تک
اُس درجہ تک وسعت نہیں پا گئے ہیں کہ اُس کو اِس یقین پر آمادہ کریں کہ خدا کو
کمال جرأت اور شوخی کے ساتھہ اُس کی مخلوقات سے علیحدہ کر دیوے۔ جب یہہ
امر تسلیم کر لیا جاوے کہ انسان واقعی گناہ آلود ہی۔ اور علاوہ اس کے جب یہہ بھی
دیکھا جاتا ہی کہ ایک جاہل انسان کچھہ مٹی لیکر مورت بناتا ہی اور اُس کی سیوا اور
پرستش کرتا ہی اور ویسے ہی فیلسوف بھی نیچر میں ضابطہ اور قانون کا برابر جاری رہنا
دیکھہ کر خدا سے انکاری ہوتا اور قانون پرستی میں مبتلا ہوتا ہی۔ تو زیادہ تر خدا کی موجودگی
اور حضوری کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہی چنانچہ اس حقیقت کی نظیریں جا بجا کتب
مقدسہ میں مرقوم ہیں۔ ایک نظیر متعلقہ الیجاہ نبی بطور مشتے نمونہ از خروارے کے ہم
یہاں پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اُس زمانے میں نمایاں ہوا جبکہ اہل دنیا بحالت ابتری
مبتلا اور بغاوت پر کمر بستہ ہی۔ بلکہ بادشاہِ وقت اور مہ فقیہوں نے لوگوں کو بعل اور

گوسالۂ طلائی کی پرستش کی طرف مائل اور راغب کر دیا تھا۔ ایسے نازک اور پرخطر وقت میں
ایلیجاہ نبی تن تنہا خدائے حقیقی کی ذات اقدس کی شہادت دے رہا تھا اور اپنے
پُرزور اور متاثر اقوال و افعال سے بادشاہ اور اُس کے بُت پرست سر گروہ یعنی کاہنوں
کو حیران و ششدر کر دیا تھا اور اُن کی برائیوں اور افعال قبیحہ کو بخوبی ظاہر اور باہر کیا
اور خدائے حقیقی کی موجودگی اور حضوری کی براہین قاطع اور دلائل ساطعہ سے
شہادت دی اور اُسکے احکام نافذہ کو بیدریغ اور باسیاست سُنا دیا حتّٰی کہ جب
لوگ اپنے جرائم قبیحہ کے ارتکاب سے پھر بھی باز نہ آئے تب خدا سے مکرر ہدایت
یافتہ ہو کر اعجاز سے کام لیا اور بتوں کی خوب درگت بنائی۔ تاکہ بدی کی پوری
پوری بیخکنی اور استیصال ہو۔ اور خدائے حقیقی کی موجودگی پوری طرح سے ہویدا ہو
ہم نے یہہ نظیر بالخصوص اس واسطے پیش کی ہی کہ اُس زمانے کے لوگ ایک طرح
سے مائل بہ مذہب تھے۔ مگر حقیقی خدا کے عرفان اور پہچان سے بے بہرہ اور منحرف
تھے۔ یہی حال ہر زمانہ کے لوگوں کا چلا آیا ہی۔ بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ جن کو خدا کی
ہستی سے مطلق انکار ہی اور بہتیرے ایسے بھی ہیں کہ وہم پرستی میں مبتلا ہیں۔ اس
لئے ایک پہلو سے تو خدا کو چھوڑنا شاق گذرتا ہی مگر دوسرے پہلو سے حقیقی خدا
سے انکار کا حجاب ڈالکر اُس کی جگہ اپنا اپنا باطل خدا بنایا ہوا ہی۔ پس ایسی صورت
میں بھی ہم کو الہام کی ضرورت نظر آتی ہی"۔

پھر ہم نے یہہ بھی کہا تھا کہ آستک یعنی عرفانِ خدا کی تعلیم ویدوں کے
بعض سوتروں میں خال خال پائی جاتی ہی مگر وہ تعلیم مبہم اور پیچیدہ الفاظ میں

بیان ہوئی ہے جسپر نہ تو گذشتہ زمانہ میں جہلا نے عمل کیا ہے اور نہ مفسرین وقت نے تعلیم مذکور کی تشریح او تصریح میں تقریر متفقہ کی ہے حقیقت میں ویدوں کی وحدانیت کی اشاعت اور تلقین موجودہ زمانہ میں مطابق پنڈت دیانند صاحب کی تاویل اور شرح کے شروع ہوئی ہے قبل اس کے ویاس جی اور سبین اچارج اور شنکر اچارج جیسے سابقہ مفسرین نے ویدوں کی تعلیم آلہی سے کچھہ اور ہی سمجھا ہے اور بدھہ اور کاپیلا اور کناد نے کچھہ اور ہی +

علما تو ویدانت کے اصول کو مانتے چلے آئے ہیں اور سکھوں کے دس گروؤں نے بھی اپنے گرنتھوں میں وید کی بنیاد پر ویدانت کی تعلیم کو ہی مقدم رکھا ہے۔ اور جہلا دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے چلے آئے ہیں۔ حقیقت میں توحید کے مسئلہ کو فلسفہ نے ایسی توضیح کے ساتھہ عام فہم لفظوں میں بیان نہیں کیا ہے کہ جسپر عوام الناس نے عمل کیا ہو۔ البتہ یہہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک عام انسان کا وہم پرستی میں مبتلا ہو جانا تقاضائے جبلی ہے +

مگر جب یہہ دیکھا جاتا ہے کہ ویدوں کے مفسرین میں خود دربارہ تشریح و تاویل کتب مذکورہ اختلاف ہے تو ویدوں کی تعلیم توحید کے بارے میں صاف اور روشن نہیں معلوم ہوتی۔ جو اس امر پر دال ہے کہ اُس کی بنیاد عقلی ہے نہ کہ الہامی۔ یہہ تو سچ ہے کہ ویدوں میں ایسے جملے بھی موجود ہیں جن میں خدا کی بابت اعلیٰ خیال مترشح ہوتے ہیں مگر اُن جملوں کا مفہوم مفسرین اور علماء کے نزدیک عقیدہ ویدانت ہے نہ کہ توحید۔ علاوہ اس کے وید کے مقلدین و معتقدین آپس میں ایک دوسرے کے

مخالف ہیں۔ ویدانت درشن توسانکھ درشن کی تردید کرتا ہی اور بنائے ویدانت درشن کی
اور پھر سانکھ درشن ان دونوں کی تردید کرتا ہی وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہہ اخلاقی صورتیں
جو انسان کو حالت تذبذب میں ڈالتی ہیں اسکو ایسی ہدایت کی ضرورت جتاتی ہیں۔
جس سے اُسکو حقیقی عرفان حاصل ہو۔ عقلی اور نیچری توحید اور اُس توحید میں جو بذریعہ
الہام میسر ہوتا ہی یہہ فرق ہی کہ مقدم الذکر توحید میں یہہ مانا جاتا ہی کہ خدا اپنا اظہار عقل
اور نیچر میں کر رہا ہی اور انسان میں یہہ استعداد مرکوز ہی کہ وہ خدا کو خود بخود بلا امداد الہام
دریافت کرسکتا ہی۔ مگر مؤخر الذکر توحید میں خدا خود اپنا حقیقی مکاشفہ اور شراکت عنایت
کرتا ہی اور انسان کی معصیت کی تصدیق کرتا ہی اور اس امر کی بھی ضرورت ظاہر کرتا ہی
کہ خدا خود رحم کا سامان مہیا کرکے انسان کو نجات اور مخلصی بخشے ۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہمارا عقلی علم محدود ہی اور اُس کی ایک حد معین ہی۔ عقل
از خود علم پیدا نہیں کرتی بلکہ باطنی اور ظاہری ذرائع سے جو کچھ اُسکو میسر ہوتا ہی اپنے
ادراک اور فہم میں لاتی ہی۔ مگر خدا کے جاننے کے لئے اُس کے علم کے مدارج مختلفہ ہیں
چنانچہ کہیں تو خدا کی ہستی ہی کا انکار ہی اور کہیں فنا فی اللہ ہی کر دیا ہی حتّٰی کہ اُسکے
وجود اور ذات کا پتہ تک نہیں ملتا اور کہیں اُس کی خالقیت سے ہی اِبا ہی اور خدا
کے علاوہ دیگر اشیاء کو بھی ازلی قرار دیا ہی۔ علیٰ ہذا القیاس کانشنس کے فیصلوں کا
بھی یہی حال ہی۔ اُسکے مشاہدات میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہی۔ کہیں راستی اور
گُناہ کی تمیز کو ہی مٹا ڈالا ہی اور کہیں خدا کی مالکیت اور قدرت پر زور دیا گیا ہی اور
مہربان اور بخشندہ قرار دیکر اُسکی قدوسی اور راستی کا خون کرڈالا ہی تو اس حالت میں بھی

ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری ضمیر ہدایت اور روشنی کی محتاج ہے۔ فلاسفی نے اس مسئلہ کو حل نہیں
کیا ہے کہ انسان میں اخلاقی خلل کس طرح واقعہ ہوا اور کس طرح ہمارے اخلاق کی صحت ہو
اور کس طرح وہ خصائل جو کانشنس سے اتفاق نہیں کرتے ہم سے رفع کئے جاویں کہ
ہماری قوت عندیہ صحت یاب ہو کر زندگی کی اخلاقی علت غائی کو پورا کرے؟ یہہ مسئلہ
صرف بطفیل الہام ہی حل ہوسکتا ہے۔ حقیقت تو یہہ ہے کہ گناہ کا تسلّط ہمارے اعضاء
میں پایا جاتا ہے جو ہماری عقل وتمیز کو گمراہ کرتا ہے۔ شاید یہہ سمجھا جاوے کہ ہندوستان
کا ادباری زمانہ اُس کی ترقی کا مانع ہوا ہے جبکہ مغربی تعلیم کی شعاعیں جابجا منتشر ہوگئی
ہیں تو اس موجودہ روشنی کے زمانہ میں وہ بلا ہدایت الہام اور اپنی نور فطرت کے ذریعہ
اُس معراج تک پہنچ جاویگا کہ جسکے وہ ابتک درپے رہا ہے اور جب یہہ بھی دیکھنے میں
آتا ہے کہ کل مذاہب نے واقعی آجکل اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا ہے تو ظاہری صورتوں
میں منزل مقصود دور نظر نہیں آتی۔ مگر اس کے جواب میں تواریخی نظائر موجود ہیں
ہم پوچھتے ہیں کہ اگر قدیم یونان۔ روم اور مصر کی فلاسفیوں میں ذرا بھی مادہ مذہبی
ترقی کا ہوتا تو آج ہم کو اُن کے کچھ پرتوے نور نظر آتے۔ اُن کی فلاسفیاں ہندوستان
کی فلاسفی سے کم نہ تھیں۔ بلکہ بڑھکر تھیں۔ وہی مسائل اُن کے سامنے درپیش تھے جنکو
ہندوستان کے مذاہب نے حل کرنا چاہا۔ تواریخ اس امر کی شاہد ہے کہ خداوند
مسیح کا آنا اُس موقعہ پر ہوا جبکہ انسانی فلاسفی زندگی کے ادق مسائل کو بہت سے خوض
وفکر کے بعد بھی حل نہیں کرسکی۔ اسکے علاوہ قدیم فلسفہ کے صحیح خیالات بنیاد کی صورت
میں یورپ کی موجودہ مخترعات ذہنی میں استعمال ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہندوستان

موجودہ تہذیب اور روشنی کے زمانہ میں اپنے خیالات کو وسعت دینا چاہتا ہی۔ اُن کو یورپ کی ڈیڑھ ہزار برس کی اعلیٰ اور برتر ترقی نے اُن سے پہلے ہی وسعت دے رکھی ہی بلکہ اس بیان کی زیادہ تصدیق پنڈت دیانند صاحب کے اُس قول پر ہوتی ہی جو اُنھوں نے ویدوں کے گیان کے بارے میں کیا ہی کہ ویدوں میں عقلی۔ اخلاقی اور طبعی علم سب پایا جاتا ہی بلکہ موجودہ ایجادوں کا ذکر بھی ویدوں میں پایا جاتا ہی مثلاً دخانی کل۔ ریل گاڑی تار برقی وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں ممکن ہی کہ ویدوں میں ایجادوں کے اصول کا کسی قدر ذکر پایا جاوے کیونکہ رشی لوگ کسیقدر نیچر کے مطالعہ کے درپے تھے۔

پھر بالآخر انسان انسان ہی ہی خواہ کسی ملک کا باشندہ کیوں نہ ہو۔ ایک ہی کتاب نیچر کی سب ملکوں کے باشندوں کے سامنے کھُلی پڑی ہی کسی نے اُس میں سے زیادہ مطالعہ کیا اور کسی نے کم کسی نے دوسروں سے سبق لیا اور خود بھی مطالعہ کر کے علم کے میدان کو زیادہ وسیع کیا اور سابقین پر فوقیت لے گیا۔ اس امر کی تواریخ بھی شاہد ہی کہ اہل عرب نے بہت کچھ یونان سے سیکھا اور یورپ نے یونان اور روم اور تمام ممالک سے کچھ نہ کچھ سبق لیا اور سب پر فوقیت لے گیا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دینی امور اس قسم کے ہیں جو مشاہدات پر مبنی نہیں ہیں اور نہ ہی عقل سے اختراع ہو سکتے ہیں۔ ان میں تو فقط الٰہی ہدایت کی ضرورت ہی جس میں عقل کا یہہ کام ہی کہ وہ ہدایت مذکورہ کی صداقت کو تمیز کرے۔ یورپ کی فلاسفی کی تواریخ سے صاف ظاہر ہی کہ اخلاق اور مذہب کو ترقی دینے کے لئے اُس کے مختلف فلسفانہ

یا سوشل طریقے کبھی بھی عملاً کارآمد نہیں ہوئے ہیں۔ اگر کسی ایک طریق فلاسفی نے خدا اور انسان کے دریافت کرنے کے اصول قائم کیے ہیں تو دوسرے طریق نے اُس کی تکذیب کی ہی جس کی وجہ محض یہہ ہی کہ از روئے فلاسفی کوئی دینی یا اخلاقی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً خدا کیا ہی۔ مادہ کیا ہی؟ آیا اُن کا کوئی قیاسی وجود ہی یا عینی یا اصلی؟ خدا کا انسان کے ساتھہ کیا علاقہ ہی۔ عقل کیا ہی۔ روح کیا ہی۔ روح کا بدن کے ساتھہ کیا رشتہ ہی؟ ان مسائل کے حل کرنے میں یورپ کیا کسی ملک کی فلاسفی کا بھی اتفاق نہیں ہی اور نہ ہوا اور نہ ہو گا جبتک کہ فلاسفی حقیقی مذہب کی ہم رکاب ہو جائے ؛

اِسی طرح تحقیق الاشیاء کے محققوں نے بھی کوئی ایسا کارآمد اور عالمگیر طریق نہیں بتایا جس پر کل بنی نوع انسان متفق ہوں۔ اُن کا ذریعہ علم وہ حقائق ہیں جو مشاہدہ میں آتے ہیں۔ فلاسفر تو باطن میں نظر ڈالتا ہی اور محقق خارجی مشاہدات پر دولیل اصلیت کے جاننے کے لئے محتاج ہیں۔ اگر فلاسفر نے خدا اور اخلاق کو اپنے دماغ سے مستنبط کرنا چاہا ہی۔ تو محقق نے خارجی دنیا پر ملاحظہ کر کے اپنا تصور باندھا ہی۔ ایک نے یا تو یہہ مانا ہی کہ خدا دریافت نہیں ہو سکتا۔ یا یہہ کہ سب کچھہ خدا ہی ہی اور یا اس امر کا یقین قابل ہوا ہی کہ میرے اپنے قیاسی تصورات سے بڑھکر اور میرے دماغی خیالوں سے ضرور کوئی نہ کوئی اعلیٰ اور حقیقی خود آپ وجود ہی جس کا عکس میرے خیالوں پر پڑتا ہی اور دوسرے کو یا تو یہہ ماننا پڑا ہی کہ مادہ ہی سب کا اصل ہی۔ اور یا یہہ کہ موجودات مخلوق ہی اور اُس کا ضرور کوئی خالق ہی۔ یہی حال کانشنس کی تواریخ کا ہی۔ یہہ وہ قوت انسان میں مرکوز ہی کہ جس سے اُسکو باطنی شہادت ملتی ہی کہ واجب اور مناسب کیا ہی اور غیر واجب اور نامناسب کیا

ہی۔ مگر اس شہادت کا پایا جانا اس امر پر دال ہی کہ ہم سے ایک اعلیٰ ہستی ہی جو ہماری نگہبان ہی اور ہمارا محاصرہ کرتی ہی اور اپنی منشا ہم پر ہدایتاً اور محتاطاً اور عدالتاً قائم کرتی ہی۔ اخلاقی واجبات کا یقین کانشنس کی تحریک سے ہی ہم میں پیدا ہوتا ہی۔ مگر ہماری قوتِ ممیزہ جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہی روشنی اور ہدایت کی محتاج ہی۔ کیونکہ کانشنس کے متعلق بھی مختلف اصول اور اعتقادات مانے گئے ہیں۔ ایک فرقہ وہ ہی جو یوٹلٹی کے اصول کو مقدم رکھتا ہی یعنی یہہ کہ زندگی کا اصول فقط یہہ ہی کہ انسان حکمت عملی یا مصلحت کے دستور العمل کے مطابق اپنا شخصی فائدہ ڈھونڈے اور اپنی ہی خوشی اور آرام کا سامان مہیا کرے۔ دوسرا فرقہ وہ ہی جو راستی اور صداقت اور انصاف کو مقدم رکھتا ہی اور ہر ایک امر میں اپنا ہی نفع نہیں بلکہ غیروں کی فلاح اور خصوصاً خدا کی مرضی کو مدنظر رکھتا ہی اور بہت ایسے ہیں جو وہم پرست ہیں اور بعض خوف پرست اور کوئی حاکم پرست اور کوئی عادت پرست اور کوئی تعصب اور بطلان پرست اور بہت سے بُت پرست ہیں + کیا ان حالتوں میں کانشنس کو روشنی اور ہدایت کی ضرورت نہیں ہی؟ وہ تو اکثر غفلت میں پڑ جاتی ہی پر اُس کو بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہی۔ اُس پر تاریکی کا پردہ پڑ جاتا ہی تو اُس کو منوّر اور مجلّا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہی۔ وہ عموماً کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہی اور اُس کو توفیق اور طاقت کی حاجت محسوس ہوتی ہی۔ چونکہ گُناہ کی وجہ سے ہماری کانشنس میں تاریکی چھا گئی ہی اس لئے وہ اپنے فیصلوں میں واجب اور غیر واجب کا صحیح صحیح مابہ الامتیاز نہیں بتا سکتی۔ چنانچہ تواریخ اس کی شاہد ہی۔ ہندوستان کے مختلف

مذاہب کے مقلدوں کی روش پر ایک نظر دوڑانے سے یہہ معلوم ہوسکتا ہو کہ آیا قوت تمیز کے فیصلے اُن سب میں متفقہ ہیں یا مختلفہ۔ پولوس رسول کا قول اُن پر بالکل صادق آتا ہو کہ اگرچہ اُنہوں نے خدا کو پہچانا تو بھی خدائی کے لائق اُس کی بزرگی اور شکرگذاری نہ کی۔ اُن کے نافہم دل تاریک ہو گئے۔ وہ آپ کو دانا ٹھہرا کر نادان ہوگئے +

درحقیقت انسانی مذہبی تواریخ کجرو اور ٹیڑھی کانشنس کے ظہور کا ایک سلسلہ واقعات ہو۔ ہماری روح کی تمنّا اور آرزو خدا کی عقلی شناخت سے اور کانشنس کی تنہا ہدایت سے سکوت پذیر اور مطمئن نہیں ہوتی بلکہ وہ خدا کی ہدایت اور قربت اور خوشی حاصل کرنیکی محتاج ہو کیونکہ یہہ جاننا خدا کیا ہی ایک امر ابدی ہو اور خدا میرے لئے کیا ہو دوسرا امر ہو۔ اس طرح کانشنس کے واجبات کا دریافت کرنا ایک امر ابدی ہو مگر اُن کی تعمیل کی توفیق اور طاقت رکھنا دوسرا امر ہو۔ بالفرض میں نے جانا کہ نیکی کیا چیز ہو اور اخلاقی شریعت کس کو کہتے ہیں مگر نیکی کی انجام دہی کے لئے میرے پاس طاقت موجود نہیں ہو تو میرے جاننے سے میرے اخلاق درست نہیں ہو سکتے۔ کانشنس سے اگر کچھ صحیح پتہ لگتا ہو تو یہہ کہ ہمارے کاموں پر فتوی اور الزام جرم کا لگاتی ہو۔ ہم اُس کی مسند عدالت کے آگے ملزم ہیں اور بس کیونکہ ہم جانتے تو ہیں کہ نیکی ہم سے ہو مگر بدی جو ہم میں سکونت کرتی ہو کچھ پیش اور زور نہیں چلنے دیتی۔ (رومیوں ۷: ۱۸ ۔ ۲۱ ۔ ۲۵) نیچر کے مشاہدات اور اُن کے مطالعہ سے خدا کا ہونا تو تواریخاً ثابت ہو بلکہ اُن میں خدا کی بعض صفات بھی نظر آتی ہیں مگر خدائے عزوجل کے کارکٹر اور اُس کے اطوار اور طریقوں پر انسان نے

کم توجہ دی ہی یہہ تو سچ ہی کہ نیچر کی تحقیقات سے مشیت ایزدی و کار کٹر کسیقدر دریافت ہو سکتا ہی مثلاً ہم یہہ جان سکتے ہیں کہ ہمارا تعلق خدا کے ساتھہ کس قسم کا ہی مگر گناہ ایک ایسا امر مانع درمیان میں حائل ہی جو خدائے حقیقی کا پورا نقشہ ہمارے دلوں میں منقوش ہونے نہیں دیتا اور یہی وجہ ہی کہ باوصف اسکے کہ ہم تعقلاً اُسکو اعلیٰ اور برتر قرار دیتے ہیں اور عقلی صفات بیان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تاہم کانشنس کی عینک سے ہم اُس کو صاف صاف اور مکمل دیکھنے سے جی چراتے ہیں۔ اِس لیئے جیسا واقعی تواریخاً دیکھا جاتا ہی ہم نے اُسکے اخلاقی صفات کے بیان کرنے میں بہت کم توجہ دی ہی۔ بلکہ ان صفات کے بیان کرنے میں کسرشان سمجھا ہی +

مذہب اسلام کی طرف اگر دیکھا جاوے تو اُس کے عقائد میں اس حقیقت کا ذکر نہیں پایا جاتا کہ انسان کی گناہ سے مخلصی کس طرح ہو سکتی ہی؟ نہ اس حقیقت کا ذکر پایا جاتا ہی کہ انسان یہہ جانکر بھی کہ نیکی کیا شے ہی اُس کی تکمیل سے عاری و لاچار ہی (مطابق قول پولوس رسول کہ خواہش تو مجھہ میں موجود ہی پر جو کچھہ اچھا ہی کرنے نہیں پاتا کہ جو نیکی میں چاہتا ہوں وہ نہیں کرتا۔ بلکہ بدی جسے میں نہیں چاہتا سو ہی کرتا ہوں) ہم کو کوئی نجات کا رستہ نہیں بتایا ہی حقیقت میں محمد صاحب انسان کی اُس تہ تک نہیں پہنچے کہ جس میں ہم کو انسان کا اصلی اور حقیقی نقشہ نظر آوے خیر اس کا ذکر آگے آویگا +

یاد رہے کہ عقلی ذریعہ سے وہی حقائق دریافت ہو سکتے ہیں۔ جو عقل سے تعلق

رکھتے ہیں۔ مثلاً یہہ تو بدیہی امر ہی کہ اگر ہم صرف مادی اشیاء کی طرف توجہ دیں اور انہیں میں خدا کو ڈھونڈھیں تو اُس صورت میں ہم کو خدا کی قدرت اور حکمت مادہ میں نظر آویگی اور اپنی معلومات کے مطابق ہم اُس کو قادر یا قادر مطلق اور دانا حاکم قرار دینگے۔ اِسی طرح اگر ہم حیوانی دنیا کی طرف متوجہ ہونگے تو ہم کو آثار اُس نیک ارادہ کے نظر آوینگے اور اس بنیاد پر ہم خدا کو رحمٰن قرار دینگے علیٰ ہذا القیاس اگر خدا کی راستی اور قدوسی اور انصاف کی طرف خیال کیا جاوے تو یہہ انسب ہی کہ ہم خدا کے اُس سلوک اور برتاؤ کی طرف توجہ دیں جو ہماری موجودہ زندگی کے ساتھہ علاقہ اور نسبت رکھتے ہیں۔ مگر تواریخاً یہہ ثابت ہی کہ خدا کے پاکیزہ خصائل کی طرف بنی نوع انسان نے کم توجہ کی ہی۔ خدا کی ہستی کے تو عموماً لوگ قائل ہیں مگر یہہ بات کہ میری موجودہ زندگی کے ساتھہ اُسکا اصلی اور حقیقی علاقہ کیا ہی اس طرف نہایت ہی کم رغبت کی گئی ہی۔ حقیقت یہہ ہی کہ انسان اپنا مطالعہ کرنے سے گریز کرتا ہی۔ عقلی ذرائع سے اپنا اور خدا کا مطالعہ تو خوب کرتا ہی اور گو کانشنس کی آواز کو سنتا تو ہی مگر حکمت عملی اور خودغرضی اور حیلہ سازی کو کام میں لاکر قدرے اور قلیل خیرات سے اپنے گناہ کا بوجھہ کندھے سے اتارنا چاہتا ہی۔ خدا کا قائم کرنا تو خواہ وہ اپنا دماغی خیال کردہ خدا ہی کیوں نہ ہو انسان کا جبلی تقاضا ہی مگر خدائے حقیقی کے کارکٹر کی نسبت انسانی خیال صحیح نہیں ہی۔ کیونکہ حقیقی خدا کو خیال میں لاتیکے وقت کوئی نہ کوئی نفسانی آلائش سدّراہ ہوتی ہی مصری ہندی۔ یونانی اور رومی دیوتاؤں کا یہی حال ثابت ہوا ہی بلکہ محمد صاحب نے

باوجود کتب مقدسہ سے واقف ہونیکے اور اُن کو مُصدّقہ ٹھہرا کر بھی صحیح نقشہ خدا کا اپنے دل میں نقش ہونے نہیں دیا جس کا ذکر ذرا آگے چلکر کیا جاویگا۔ اگر یہہ سوال ہو کہ انسان نے صحیح نقشہ خدا کا اپنے دل میں اُترنے کیوں نہیں دیا ہی؟ تو اس کی وجہ گُناہ کی موجودگی کے ثابت ہونے کے سوا اور کچھہ نہیں ہی۔ الحاصل باوجود اس کے کہ نیچر کے ذریعہ انسان نے خدا کی ہستی کا یقین کیا ہی تاہم وہ حقیقی خدا کی پہچان سے بے بہرہ ہی اور خدا سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اصلی حالت کے عرفان سے بھی بے بہرہ ہی۔ خدا کے قائم کئے بغیر تو انسان ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا مگر گُناہ کے تسلّط کی وجہ سے جو اُس کے اعضا میں پایا جاتا ہی وہ حقیقی خدا کے عرفان سے برگشتہ ہو کر ایک اپنا دماغی بنایا ہوا خدا مانتا ہی خواہ وہ ایک گھڑی ہوئی مورت ہو خواہ انسانی خیال و تصور کے نفسانی ڈھانچے میں دل ہی دل میں سکونت پذیر ہو۔ پس مذکورہ بالا بیان سے بھی ثابت ہوتا ہی کہ انسان کو الہام کی ضرورت ہی +

خدا کی قدوسی اور راستی دریافت کرنے کے لئے یہہ انسب ہی کہ ہم خدا کے سلوک اور برتاؤ کی طرف جو ہماری موجودہ زندگی سے متعلق ہی توجہ کریں۔ یہہ روز مرہ مشاہدہ میں آتا ہی کہ خدا مخلوق کی نیکی اور خیر خواہی چاہتا ہی اور ایسا ہی سلوک بھی واقعی کر رہا ہی مگر یہہ بھی دیکھا جاتا ہی کہ ہماری زندگی کے ساتھہ دُکھہ بھی شامل ہی۔ گناہ کی وجہ سے خدا نے انسانی زندگی میں دُکھہ کو بھی اذن کیا ہی اور یہہ اسکا انتظام خالی از حکمت نہیں ہی۔ کیونکہ یہہ بات قابلِ یاد ہی کہ خدا کی نیکی

کے ساتھ عدالت اور انصاف بھی شامل ہی۔ گو انسان آزاد ہی۔ مگر آزادی کے بے طرح
استعمال سے اسکا سراسر نقصان ہی۔ گو وہ اشرف المخلوقات کے نام سے ممتاز ہی اور اُس
میں بے بہا ترقی کا مادہ اور امکان پایا جاتا ہی اور ذی عقل ہی تاہم وہ شریعت کا مقید
اور پابند ہی۔ حتّٰی کہ بسا اوقات اُس کے آزادانہ منصوبے پورے نہیں ہونے پاتے
بابل کا قصہ جو پیدائش کی کتاب میں مندرج ہی اس حقیقت کی عملی نظیر ہی "اور اُنھوں
نے کہا کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بناویں اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک
پہنچے اور جہاں اپنا نام قائم کریں۔ تب خداوند نے اُن کی بولی میں اختلاف ڈالا۔ تاکہ
وے ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔ تب خدا نے اُن کو وہاں سے تمام روئے زمین
پر پراگندہ کیا۔ سو وے اُس شہر کے بنانے سے باز آئے" یہہ حقیقت ہر ایک انسانی
تجربہ میں صادق آتی ہی۔ کیونکہ ہم بھی اپنی بیجا تدابیر کی انجام دہی سے روکے جاتے
ہیں۔ ہماری موجودہ حالت ایسی ہی کہ خدا کو ہمارا اعتبار نہیں ہی۔ خدا تو یک طرف
آدمی کو آدمی کا اعتبار نہیں ہی۔ خدا ہمارا محافظ معلوم ہوتا ہی اور اُس کا سلوک
ہماری زندگی کے ساتھ ناراضگی کا ہی۔ اس میں تو شک نہیں کہ خدا دنیا کی خبرگیری
بھی کرتا ہوا نظر آتا ہی اور نیچر اور انسان کا تمام انتظام حکمت اور دانائی کے ساتھ چلا رہا
ہی اور اس صورت میں وہ ہمارے نزدیک معلوم ہوتا ہی کیونکہ ہم سے نیک سلوک کرتا ہی اور
یہہ معلوم ہوتا ہی کہ ہماری زندگی سے اُسکا بھاری سروکار ہی مگر یہہ بھی دیکھا جاتا
ہی کہ وہ ہم سے بہت دور رہتا ہی۔ گویا دنیا سے اُسکو کوئی سروکار نہیں اور خواہ کتنا ہی
اس کی کھوج اور تجسس میں دربدر پھریں اور دست بدعا ہو کر اُس کو پکاریں وہ

ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا اور پکارنے سے ہماری آواز کا شنوا نہیں ہوتا۔ ایک طرف تو نیچر کے کاروبار میں اُس کی پروردگاری اور الوہیت ہویدا و عیاں ہی اور دوسرے پہلو سے وہ اپنے آپ کو انسان سے غائب رکھتا ہی۔ گویا بالکل قطع تعلق کیا ہوا ہی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ یہہ کیا رمز۔ یا معّما۔ یا نکتہ ہی؟ اس کا جواب یہی ہی کہ خدا انسان کی موجودہ گناہ آلود زندگی سے ناراض ہی۔ علاوہ اس کے انسان خود اس امر کا شاہد ہی کہ وہ عاصی ہی اور اُس میں شریعت پائی جاتی ہی جو نیکی کی شہادت دیتی ہی اور نیکی طلب کرتی اور اُسکو ذمہ وار ٹھہراتی ہی کہ وہ خُدا کے حضور جوابدہ ہی اور وقعی باطنی شریعت کی شہادت ہمارے حق میں اچھی نہیں ہی بلکہ زندگی کا دُکھ جو گناہ کا نتیجہ ہی اس امر پر شاہد ہی کہ انسان کی حالت ابتر اور خستہ ہی اور خود ہمارا دل شاہد ہی کہ چال وچلن اور رفتار وگفتار اور افکار میں انسان خدا کی مرضی کے تابع نہیں ہی اور نہ شریعت سے موافقت ومطابقت رکھتا ہی اور خدا بھی اپنے سلوک سے ظاہر کر رہا ہی کہ وہ ناراض اور خفا ہی۔ ہماری ضمیر فتویٰ دیتی ہی کہ ہم خطاکار اور مجرم ہیں۔ خدا تو بے شک وشبہ نیک وپاک ہی اور شریعت بھی بے نقص اور پاک ہی مگر ہمارا علاقہ دونوں کے ساتھ عداوت اور بغاوت کا ہی اور گو انسان شریعت کو نیک تسلیم کرتا ہی لگر شریعت پر کاربند نہیں ہوتا تو کیا اس صورت میں وہ زیر ملامت نہیں؟ اخلاق کیا ہی؟ یہہ تو وہ خوب جانتا ہی مگر اخلاق کی تعمیل سے کوسوں بھاگتا ہی۔ گویا تعمیلِ اخلاق سے عاری اور لاچار ہی۔ الحاصل جس پہلو سے انسان کا مطالعہ کیا جاوے یہہ ظاہر بلکہ اظہر ہوتا ہی کہ وہ بالائی توفیق و ہدایت کا محتاج ہی۔

فصلِ دُوم

دفعہ اوّل حقیقی مذہب اور الہام کی جانچ اور پڑتال کے لئے کوئی نہ کوئی معیار ہونا چاہئے اور گو چند الفاظ میں وہ معیار قائم نہیں کیا جا سکتا تاہم مذہب اور الہام کے متعلق چند حقیقتوں کے بیان کرنے سے ہم اپنے دلوں میں ایک معیار قائم کر سکتے ہیں اور وہ یہہ ہے کہ حقیقی مذہب میں کیا کیا حقیقتیں شامل ہونی چاہئیں؟ جب انسان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مذہب کی طرف مائل ہے تو اس سے کیا مطلب لیا جاتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ انسان طبعاً کسی اعلیٰ ہستی کے آسرے کا محتاج ہے۔ مگر یہہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی سرشت اور فطرت میں تین حقیقتیں موجود ہیں۔ خیال کرنا محسوس کرنا۔ ارادہ کرنا۔ اِس لئے خدا کے علم کے لئے یہہ تینوں حقیقتیں کام میں آنی چاہئیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی حقیقت کو نظر انداز کر کے صرف عقل ہی سے کام لیں اور جذبات کو کام میں نہ لاویں یا اُن کو غیر حقیقی تصور کریں تو ظاہر ہے کہ ہم نے انسانیت میں سے ایک بڑی طاقت کو مٹا ڈالا ہے۔ ایسی طاقت کو کہ جس پر انسان کی اطاعت اور تعظیم اور عبادت کی بجا آوری کی بنا ہے۔ اسی طرح اگر ہم نے عقل سے خدا کو اپنے تعلقات سے دور پھینک دیا ہے کیونکہ خُدا جاننے میں نہیں آسکتا یہہ سمجھ کر کہ خدا کا ہمارے ساتھ کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے خدا کو ہم قبول بھی نہیں کر سکتے پس مذہب میں تین باتیں کارآمد اور ضروری ہیں۔ اوّل علم اُس شے کا جس پر ہماری توجہ مبذول ہے۔ دوم جذبات۔ سوم ارادہ کا رجوع۔ محض علم مذہب قرار دیا جا نہیں سکتا جب

مذہب میں ہمارے محسوسات یا حرکات باطنی اور جذبات حامل نہیں اُس میں انسانیت کا خون کیا گیا ہی اور خدا محض نام کو ہی جانا گیا ہی۔ اِس لئے اصول ویدانت مذہب کے نام سے نامزد نہیں کیا جا سکتا ہی انسان ہیں دینداری ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی اگر اُسکے جذبات علم کے ساتھہ متحرک نہیں ہوئے ہیں جبکہ انسان کے دل میں خدا کی محبت اور عظمت اور اطاعت پیدا نہیں ہوئی تو اُسمیں امید کو جگہ نہیں جہاں شکرگذاری کی طبیعت پیدا نہیں ہوئی اور روح کی تمنائے حبّلی خُدا کی طرف سے مٹا دی گئی ہی تو وہاں مذہب جاگزیں نہیں ہی بلکہ دہریت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہی مگر جذبات کے ساتھہ جیسے پہلے بیان ہوا ارادہ یا دِلکا رجوع ہونا بھی ضروری ہی کیونکہ جس انسان کا ارادہ خدا کا علم حاصل کرکے اُسکی طرف رجوع ہوتا ہی تو اُس کے مقدور بھر جاننے اور عمل اختیار کرنے کے مطابق اُس کی سیرت اور خصلت خدا کی ہمشکل بنتی ہی اور جیسا بالیقین انسان کا خدا یا دیوتاؤں کی طرف ہوتا ہی ویسی ہی اُس کے کارکٹر میں تاثیر ہوتی ہی۔ یہہ ممکن ہی کہ ہمارا ایمان خدا کی نسبت صحیح نہ ہو۔ یا ظلمت آلودہ اور شان آلہی کے شایاں نہو اور یہہ بھی ممکن ہی کہ ہمارا ایمان و یقین صحیح اور درست ہو۔ ہر دو صورت میں انسان کا اتحاد اور تعلق اپنے خدا سے ہوتا ہی۔ پس مذہب میں جاننا محبّت اور دل کا سپرد کرنا شامل ہی۔ مذہب کوئی دماغ یا روح کی جُدا قوت نہیں ہی۔ جیسے عقل یا ضمیر قوت کے نام سے موسوم کیجاتی ہیں۔ بلکہ مذہب کا علاقہ انسان کی کل ذات سے ہی۔ کیونکہ وہ کل قوائے انسانی کو تحریک کرتا ہی۔ وہ عقل کی خدمات کو طلب کرتا ہی اور جذبات کو بھی تحریک دیتا ہی اور ارادے سے پوری اطاعت طلب کرتا ہی۔ جہاں تمام دماغ روشن ہوا اور ضمیر بھی منوّر ہوئی اور

دل پر حقیقی عظمت اور محبت قائم ہوئی حتیٰ کہ انسان سے شریعت عملی کی پوری پوری تکمیل
شروع ہونے لگی وہاں یقین جانو کہ مذہب حقیقی قائم ہوا۔ کیونکہ ایسا شخص خدا کو اپنی عقل
اور ضمیر سے بخوبی دریافت کرکے اُس کی تعظیم بجا لاتا ہی اور اُس کی اطاعت کو بدل و جان
قبول کر لیتا ہی اور اُس سے قربت حاصل کرکے اپنے تئیں اُس کا ہم خصلت بنانے
میں کوشاں رہتا ہی*

ہماری روح بذریعہ قوتِ ادراک اُن چیزوں کی جو زیر ملاحظہ ہوتی ہیں یا تو راغب
ہوتی ہی یا اُن سے متنفر ہوتی ہی یعنی حرکات باطنی سے انسان کا دل چیزوں کی
طرف مائل اور راغب ہوتا ہی یا اُن سے اُکتاتا ہی۔ حرکات باطنی میں درجات کا
بھی اندازہ پایا جاتا ہی۔ کہیں تو کسی قدر دل راغب ہوتا ہی اور کہیں میلان طبیعت
میں نہایت ہی شوق پایا جاتا ہی۔ اس قسم کے نمونہ حرکات باطنی کو خواہشاتِ دل کہنا
بیجا ہوگا۔ جن میں ارادہ اپنی خواہش کو تاکید کے ساتھ ظاہر کرتا ہی۔ ہماری خواہشات
ہمارے اعمال و افعال پر ایک قسم کی حکومت کرتی ہیں۔ اگر ہم کو کوئی چیز پسند آتی ہی
اور اُس کو حاصل کرکے خوش ہوتے ہیں تو جس قدر ہمارا شوق شئے مذکور کے
حاصل کرنے کے لئے بڑھیگا اُسی قدر ہم کو اُس شی کی تحصل سے زیادہ تر خوشی ہوگی
اور جس قدر ہم کسی چیز سے متنفر ہونگے۔ اُسی قدر ہم اُس سے پہلو تہی کرنے کے لئے
ساعی رہینگے۔ یہہ خواہشات دِل سے علاقہ رکھتی ہیں اور اُس وقت عمل میں آتی
ہیں جب ارادہ کے ساتھ جوش اور ولولہ بھی پیدا ہوتا ہی جن میں دل لگتا ہی اُن
خواہشات میں محبت اور امید۔ خوشی شکرگذاری۔ اور خاطر جمعی پائی جاتی ہیں اور جن

سے وہ نفرت کرتا ہے اُن میں نفرت خوف غصّہ و غم وغیرہ پائے جاتے ہیں حقیقی مذہب میں دل کی خواہشات کا عمل میں آنا لابدی ہے کیونکہ خدا ہم سے ایسا مذہب طلب نہیں کرتا جس میں بے فکری اور لاپروائی اور سرد مہری پائی جاوے بلکہ ایسا کہ جس میں انسان اپنے کمال شوق اور امنگ اور دلی جوش کو ظاہر کرے۔ خدا یہہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کی پوری پوری تعظیم و تکریم بجا لاوے اور اُس کا حقیقی خوف رکھے اور اُس کی تمام راہوں پر چلے اور اُس کو تمام دل سے اور ساری عقل اور سمجھ سے اور اپنے سارے زور سے پیار کرے (استثنا ۶: ۵ و مرقس ۱۰: ۳۰)۔ مذہب میں اگر شوق کا اظہار نہیں پایا جاتا تو وہ مذہب کس کام کا ہے؟ اگر مذہب میں ایسا زور و طاقت نہیں کہ دینی خدمات کی بجا آوری میں انسان کے کل باطنی قویٰ کو متحرک کرے تو وہ مذہب برائے نام ہے اور بس۔ دنیا کا کاروبار جو چلتا نظر آتا ہے اُس میں بنی آدم کا دل مصروف نظر آتا ہے۔ وہی شخص دنیاوی معاملات میں کامیاب نظر آتا ہے جس نے اپنا سارا دل کام میں لگایا ہوا ہے۔ وہی فوج غالب نظر آتی ہے جو جان توڑ کر میدان جنگ میں مصروف ہوتی ہے۔ اسی طرح مذہبی کامیابی میں اگر ہمارا تمام دل مصروف نہیں ہے تو ضرور بالضرور ناکامی کا مُنہہ دیکھنا پڑیگا۔ دین دنیا پر فوقیت رکھتا ہے اور دونوں کے ملانے کے لئے مسیح کے قول پر کاربند ہونا کامیابی کی صورت ہے یعنی یہہ کہ پہلے خدا کی راستی ڈھونڈو تو باقی چیزیں تم کو دیجاوینگی۔ خواہشات انسان کے اعمال کی بنیادی اصل ہے جب تک وہ محبت یا نفرت کو اشتعال نہ دے تب تک انسان عمل کی طرف رجوع نہیں ہوتا ہے۔ تمام دنیا کے کاروبار بے حس و حرکت پڑے رہینگے۔ اگر امید

شوق اور حوصلہ وہمت وغیرہ انسان میں نہ پائے جاویں۔ اسی طرح مذہب میں سے
اگر مذہبی خواہشات کو مٹا دیا جاوے تو مذہبی علم اور تجربہ کسی کام نہ آویگا۔ اس بیان
سے یہ بھی مترشح ہوتا ہی کہ جسقدر انسان خدا سے آشنائی اختیار کرتا ہی اسی قدر خدا
کی باتوں کی طرف اُس کے دل کا میلان ہوگا اور خدا کی محبت سے جتنا آشنا ہوگا اُسی
اندازہ سے نوع انسان کو بھی پیار کریگا۔ خدا کی کھوج اور جستجو کے وہی درپے رہیگا جو
اُس کا نہایت ہی طالب ہوگا۔ وہی حقیقی نادم اور خاکسار خدا کی حضوری میں بنیگا
جس نے خدا کی قدوسی میں اپنے حال پر نگاہ ڈال کر اُس کے غضب کو دیکھا ہی اور جس سے
خائف ہو کر اُس کے بدن پر ایک قسم کی کپکپی آگئی ہی۔ جب تک انسان کا دل بغاوت
نہیں چھوڑتا وہ خدا کے نزدیک آنا ہرگز پسند نہیں کرتا اور اگر مجبور ہوتا ہی تو خدا کو
اپنی سی نظر سے دیکھتا ہی اور اُس سے ایسا سلوک کرتا ہی گویا وہ بھی انسان سی غرض رکھتا
ہی۔ اگر انسان میں حقیقی خدا کی طرف محبت جوشزن ہی تو وہ اُن چیزوں سے نفرت
کریگا جن سے خدا نفرت کرتا ہی محبت سے امید پیدا ہوتی ہی اور امید سے ہمت اور
حوصلہ۔ محبّت ہی سے شکرگذاری کی طبیعت پیدا ہوگی۔ محبّت ہی سے خدا ترسی
اور دینی خوشی اور جذبات متحرک ہونگے اور ایسا غصہ پیدا ہوگا جو راستی ہی کی خاطر
ہو۔ اس کے برعکس اگر دل میں دینی خواہشات عمل میں نہیں آتیں تو سخت دلی
اُن کا نتیجہ ہوگا۔ سخت دلی ہی کی وجہ سے انسان میں حقیقی توبہ پیدا نہیں ہوتی اور
اُس کے دل سے ہمدردی اور خدا ترسی کافور ہو جاتی ہی اور وہ ایسی حالتِ ناگفتہ بہ
سے اپنے لیے غضب کا سامان مہیا کرتا رہتا ہی۔ نافرمانی اور بغاوت کی جڑ سخت دلی

ہی جب دل میں غرور و تکبر سماتا ہی تو پھر ندامت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں
رہتی۔ سخت دل میں خدا اپنا الہام ہرگز ظاہر نہیں کرتا۔ اظہارِ الہام کے لئے شرط
یہی ہی کہ انسان کا دل موم کی طرح پگھلا ہوا اور خدا کی باتیں سننے کے لئے مستعد ہو۔
بے ایمانی کی جڑ سخت دلی ہی۔ سخت دلی سے ایسا دل مراد ہی جو نیک خواہشوں کی طرف
لاپروائی ظاہر کرتا ہی۔ جو پتھر سا بے حس و حرکت اور غیر مجذوب ہو گیا ہو اور جس کے
احساس اخلاقی بالکل مُردہ سا ہو گئے ہوں۔ خدا کے عرفان کے لئے یہہ ضروری
شرط ہی کہ ہمارا دل موم کی طرح نرم ہو اور اسی طرح جذبات کی بجا آوری کے لئے بھی وہی
شرط درکار ہی کیونکہ نرم دلی ایک بچہ کا سا دل رکھنا ہی اور جب تک انسان کا دل ایک
چھوٹے لڑکے کا سا نہ ہو جاوے تب تک وہ خدا کی بادشاہت کو ہرگز نہیں دیکھ
سکتا۔ گناہ کی صورت سخت دلی ہی۔ ایسی حالت میں انسان نہ تو دوسروں کی
خدمات بجا لا سکتا ہی اور نہ ہی خدا کے ہمشکل اور ہم خصلت بننے کا خواہشمند ہوتا ہی۔

دفعہ دُوم۔ الہام کے متعلق ہمیں چند ضروری امور کو خوب ذہن نشین کر لینا
چاہیے۔ اول الہام کس کو مخاطب کرتا ہی؟ دُوم اُس کا مدعا اور مآل کیا ہی؟ پہلے
باب کی دوسری فصل میں ہم یہہ ذکر کر چکے ہیں کہ خدا کا اپنے تئیں ظاہر کرنا ممکن سے
ہی اور واقعی نیچر میں اُس کا ظہور پایا جاتا ہی اور دو الہامی وسائل کو کام
میں لا کر زیادہ تر اپنے کاریگر اور مرضی کو ظاہر کر سکتا ہی چنانچہ اُس نے ایسا کیا بھی
ہی۔ اب ہم اُن ضروریات کا جو الہام کے متعلق ہیں ذکر کرتے ہیں جن کے تسلیم کرنے
میں امید ہی کہ کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا۔ اول صحیح الہام کا مُلہَم حضرتِ انسان ہی

دُوم الہام کا مدعا یہہ ہی کہ جو تعلق انسان کا خدا کے ساتھ ہی اور خدا کا انسان کے ساتھ اُس کو بذریعہ وسائلِ الہام کمال صراحت اور وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کرے پھر حقیقی عرفان میں دو پہلو ہیں جن کو نظرانداز کرنے سے الہام ہمارے لئے بے سود اور بے مطلب اور غیر ضروری ہو جاتا ہی۔ وہ دو پہلو متعلقہ الہام یہہ ہیں۔ اول انسان خود اپنے سے یعنی اپنی حقیقت اور اصلیت سے آشنا ہو دُوم وہ خدا کی بھی حقیقی آشنائی حاصل کرے۔ جس انسان نے خدائے حقیقی کو جانا ہی وہ بلا تامل یقین کرے کہ خود آشنائی کی منزل پر بھی پہنچا ہی اور جس انسان نے اپنی اصلیت اور حقیقت کو جانا اور پہچانا ہی وہی شخص ایسا ہو سکتا ہی کہ جس نے خدا کی بھی حقیقی معرفت کو حاصل کیا ہی۔ یہہ امر مسلمہ ہی کہ انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا ہی جس سے یہہ مراد ہی کہ انسان میں خود اپنے اور خدا کے جاننے کا مادہ رکھا گیا ہی تا کہ وہ خدا کا جلال ظاہر کرے اور اُس میں خوشحال رہے۔ انسان میں لازوال ترقی کا مادہ موجود ہی بشرطیکہ اُس کے تعلقات خارجی و باطنی آپس میں اتفاق کلی رکھتے ہوں اور کوئی امر اُس کی ترقی کا مانع نہ ہو جس طرح ایک پودا جس کی اندرونی حالت قوائے کیمیائی تخم سے وابستہ ہو کر شبنم او گرمی اور پانی بقدر المحتاج الیہ نکال لیتا ہی حتّٰی کہ وہی عناصر اُس کے مطالب کو پورا کرتے ہیں اسی طرح اگر انسان کا تعلق خود اپنے اور خدا کے ساتھ صحیح ہی یا یوں کہیں کہ وہ روحانی طور پر زندہ ہی تو اُس صورت میں اُس کا مادہ ترقی روز بروز دن دوگنا اور رات چوگنا بڑھتا جاویگا اور جہاں کہیں اخلاقی و تمدنی صداقتوں سے اُس کا سابقہ پڑیگا اور جو

کچھ بذریعہ نیچر میسر ہوگا اُسکو بھی اپنی زندگی کے ترقی دینے کے لئے جذب کریگا۔ مگر جہاں انسان کی زندگی میں نفاق اور فتور پایا جاتا ہی وہاں انسان کے اندرونی تعلقات اشیاء خارجی سے ساتھ ہرگز باعثِ اتفاق نہیں ہوسکتے ہیں لہذا الہام میں الہی پہلو کے علاوہ انسانی پہلو کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ الہام اگر زندگی کا انسانی نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہی تو ساتھ ہی یہہ بھی قرین قیاس ہوگا کہ وہ اندرونی طاقت حاصل کرنے کے وسایل بھی ہم پہنچاوے تاکہ پیش کردہ نمونہ کی تقلید بھی کی جاسکے۔ اگر الہام انسانی پہلو کو نظر انداز کرکے اُسکو مطلقاً حساب میں نہ لاوے تو ایسے الہام سے ہمارا کیا واسطہ ہوسکتا ہی؟ یا اگر الہام محض ایک طومار احکام اوامر ولواہی کا باندھہ دیوے جس سے ہماری آزادی کا خون ہو۔ یا ظاہری اور رسمی شریعت کی زنجیروں سے جکڑبند ہوجاویں تو ضرور ایسا الہام ہماری ترقی کا مانع ہوگا۔ ہم الہام سے ایسے اصول کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں ترقی کو گنجائش ہو اور جو خصوصیت عامہ رکھتے ہوں جن میں یکبا اور غیر متغیر تدبیر کی جگہ زندہ یگانگت و اتحاد پایا جاوے۔ جن میں پابندی اور قیداور کوتاہ اندیشی کی جگہ آزادی کو گنجایش ہو اور ارادہ ازلی نظر آوے اور جس کا رخ انسانی تواریخ میں متواتر بجانب ترقی ہو۔

انسان کا باطن ایک وسیع اور عمیق سمندر ہی۔ اُس میں مختلف جذبات کی لہریں موجزن ہوتی رہتی ہیں۔ اُس میں ایسے باطنی احساس اور حرکات پائی جاتی ہیں جو نہ سے نکل کر ہوائی پرندوں کی طرح پرواز کرنا چاہتی ہیں۔ امدایسے ولولے اور آرزوئیں اور وساوس جو صورت جسم اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ شاید کوئی خیال

کرے کہ ہم محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ تو کیا فطرتاً یہہ سچ نہیں اور کیا تواریخ بھی اُس کی شاہد نہیں ہر کہ بنی نوع انسان میں سے بہت ایسے شعراء اُٹھا کئے ہین جنہوں نے غارت کرنیوالے زمانہ سے انسان کے قدرتی اور قابل یاد منتشر اور بے زبان اور غیر مجسم خیالات کو چھین کر الفاظ کا وہ بولتا لباس پہنایا ہی کہ جس کو انسان ایک اپنا ذاتی او حقیقی حصہ سمجھ کر ہرگز نہیں بھولتا؟ جب یہہ حقیقت نیچر سے تصدیق ہوتی ہی تو کس قدر زیادہ قرین قیاس اور ظن بہا تا یہہ امر ہی کہ الہام انسانی پہلو کے اظہار سے ہرگز گریز نہیں کرسکتا۔ پس حقیقی الہام میں جو انسان سے مخاطب ہی یہہ شرط ضرور پوری ہونی چاہئے کہ وہ انسان کو پاس خاطر اور ملحوظ رکھے۔ یعنے انسان کی اصلیت کا بھی انکشاف کرے اور اُس کے جواہر اور اوصاف کو اور خدا کے ساتھہ صحیح تعلقات کو اور موجودہ زندگی میں مختلف حالتوں رنج اور خوشی اور خطرہ اور امید وغیرہ کو بذریعہ انسان مگر الہٰی ہدایت کے ساتھہ تاکہ وہ غلطی اور سہو سے مبرا اور محفوظ رہے۔ بخوبی منکشف کرے۔ تاکہ حضرت انسان شفاف آئینہ کی طرح اپنی حقیقت سے آگاہی اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا پورا اور شافی اور تسلی بخش جواب پاوے۔ انسان پر گناہ کی وجہ سے ظلمت کا پردہ پڑا ہوا ہی اور خدا سے منحرف ہونے سے وہ اُس سے بے بہرہ اور ناآشنا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ نہ تو وہ اپنی اصلیت اور موجودہ خطرناک حالت سے آگاہ ہی اور نہ ہی وہ اس قابل رہا ہی کہ کس طرح خدا پر مستحکم اور پائدار ایمان رکھے اور اپنی آرزوؤں اور مطالب کا کس زبان سے اظہار کرے؟ کیونکہ بے ایمانی کی وجہ سے انسان میں

روحانی گویائی کی بھی طاقت نہیں رہی ہی - اب کیا یہہ قرین قیاس نہیں کہ الہامی شخص انسان کے لیئے ایک رہبر اور پیش خیمہ بنے؟ اور وہ یہہ بھی جتا وے کہ جو فضل اور توفیق اُسکو عنایت ہوئی ہی وہ ہر ایک آئندہ ایمان لانے والے انسان کا حصّہ و بخرا ہی - پس الہام حقیقی کا جو انسانی پہلو کو ملحوظ رکھتا ہی - یہی نشان ہی کہ وہ انسان کو اپنا موضوع بنا وے تاکہ انسان آلٰہی معرفت اور عرفان سے مستفید ہو کر اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نظیروں سے انسانی اصلیت اور حقیقت کو ظاہر کرے اور معرفت آلٰہی کو بھی ایسے موزوں اور برجستہ الفاظ میں بیان کرے کہ جسکو ہر ایک انسان جو خدا کا طالب ہی اپنا حصّہ سمجھے اور جو انسان کی زندگی میں ہر انقلاب اور دور زمانہ میں ہمیشہ مصدق ہوں - یہہ بھی یاد رہے کہ جس شخص کو الہام اپنا موضوع ٹھہرا وے وہ بشریت کے تقاضہ سے خالی نہ ہو بلکہ ایسا شخص ہو جو اپنی زندگی کے مختلف مواقع اور تجربات میں اصلی اور حقیقی انسان ثابت ہو نہ ریاکار اور گھمنڈی یا نرالا اور انوکھا - الحاصل ایسا انسان جس کو خود انہیں گذرگاہوں سے مسافت طی کرنی پڑی ہو جن سے ہر ایک فرد بشر کو گذرنا ناگزیر ہی - جن منزلوں میں کہیں سُکھ ہی اور کہیں دُکھ - کہیں آسانی اور کہیں مشکل کا سامنا - کہیں مزاحمت اور کہیں مقابلہ درپیش ہی - کہیں مایوسی کی ظلمت کا سایہ - کہیں امید کی روشنی نمودار - کہیں سخت دلی اور معصیت کی گھٹاٹوپ تاریکی درپیش ہی اور کہیں ندامت اور رقتِ قلب کی آہ وزاری ۔

یہہ بھی مخفی نہ رہے کہ حضرت انسان اپنی حالت موجودہ میں بیگناہ نہیں ہی

اِس حقیقت کا ہمارا اپنا تجربہ اور انسانی تواریخ دونوں شاہد ہیں اور اِس لئے الہام کا موضوع الہام سے شرف حاصل کرنے کی وجہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں! اگر عصمت سے مراد محفوظ رکھے جانے کی لیجاوے تو یہہ صحیح ہی۔ کیونکہ ہماری عقل یہہ مان سکتی ہی کہ الہام کا موضوع وحی یا القا کے بیان میں آلہی ہدایت سے محفوظ رکھا جاسکتا ہی اور خدا کا پیام یا کلام دوسروں تک پہنچا دینے کے لئے وہی شخص لائق ہی جسکو خدا کی پوری پوری اطاعت منظور ہی۔ جو الہام کے لینے کے وقت اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے پورا پورا تابع کر دیتا ہی اور دنیا کے تعلقات سے علیحدہ ہوکر صرف خدا ہی کی آواز سنتا ہی اور اُس کی مرضی کا غیر متمند ہوکر اس تیرہ و تار دُنیا میں ادنیٰ و اعلیٰ اور بادشاہ اور رعیت کے کانوں میں خدا کی آواز کو بلند کرتا ہی۔ مگر ہم یہہ نہیں مان سکتے کہ ملہم ہوگیا وہ بامعصوم ہی۔ اگر اُسکو ماں کی گود سے ہی معصوم مانا جاوے تو ظاہر ہو کہ تواریخ سوائے عیسیٰ کے کسی اور کی عصمت کی شاہد نہیں ہی کیونکہ عیسیٰ مرد کی خواہش سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ بتائیدِ روحِ پاک مریم کے رحم مطاہر میں انہوں نے ظہور پکڑا۔ باقی رہی مریم کی عصمت اُس کی نسبت ہم یہہ کہتے ہیں کہ جس حال اُس نے اپنے رحم میں قدوس کو لینا پسند کیا تو وہ نفسانی خواہشوں سے اُن ایام میں محفوظ رکھی گئیں جسطرح انبیا سلف کلامِ خدا کو لینے کے لئے محفوظ رکھے گئے جب وہ پوری اطاعتِ خدا اختیار کرکے اور دنیا کے سروکار سے علیحدہ ہوکر کلام خدا کو لینے کے لئے آمادہ ہوئے بعین اُسی طور و انداز سے مریم جو کنواری تھیں خدا کی اطاعت منظور کرنے پر محفوظ رکھی گئیں۔

چنانچہ مرقوم ہے "پسندیدہ سلام۔ خداوند تیرے ساتھہ" اور پھر فرشتہ نے کہا کہ "مریم مت ڈر کہ تو نے خدا کے حضور فضل پایا ہے" پھر مریم اُسے کہتی ہیں کہ "یہہ کیونکر ہوگا جس حال کہ میں مرد کو نہیں جانتی" پھر فرشتہ کا جواب سُنکر مریم خدا کی پوری پوری اطاعت منظور کرتی ہیں۔ یہہ کہکر کہ "دیکھہ خداوند کی باندی۔ مجھہ پر تیرے کہنے کے مطابق ہووے" لوقا ۱ : ۲۸ تا ۳۸

اس کے علاوہ ہم یقین کرتے ہیں کہ مریم جب تک اپنا پلوٹھا نہ جنی نفسانی خواہشوں سے بہ توفیقِ خدا محفوظ رکھی گئیں۔ وجہ اوّل خدا کے فضل کا اُس کے ساتھہ ہونا اور اُس کا متبرک کئے جانا۔ پسندیدہ سلام۔ خداوند تیرے ساتھہ۔ وجہ دوم۔ اُس کا خدا کی اطاعت منظور کرنا۔ پہلے اُسکا یہہ عذر تھا کہ جس حال میں مرد کو نہیں جانتی ہیں حاملہ کس طرح ہو سکتی ہوں؟ اِس کے جواب میں فرشتہ نے کہا کہ "روح القدس تجھہ پر نازل ہوگی اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا سایہ تجھپر ہوگا اور اس سبب سے وہ قدوس بھی جو پیدا ہوگا خدا کا بیٹا کہلائیگا" اور اپنے کلام کی تصدیق میں اُس کی رشتہ دار الیسبات کی نشانی دی اور یہہ حوصلہ دیا کہ خدا کے آگے کوئی بات اَن ہونی نہیں۔ یا جیسے اصلی عبارت میں ہے کہ جو کلام خدا سے صادر ہوتا ہے وہ قوت سے خالی نہیں ہے۔ یہہ سنکر مریم فرشتہ کے کلام پر یقین لائیں اور اُس کی اطاعت کے ساتھہ ہی وہ حاملہ ہوئیں۔ کیونکہ مریم نے کہا "دیکھہ خداوند کی باندی مجھپر تیرے کہنے کے موافق ہووے" اور جب تک اپنا پلوٹھا جنی نہ مرد نے اُس کو جانا اور نہ نفسانی خواہش کی وہ شکار بنیں۔ اور یہہ متی کے بیان سے

بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب یوسف کو فرشتہ کی معرفت یہہ پورا اطمینان ہوا کہ وہ نفس کی شکار نہیں ہیں بلکہ اطاعتِ خدا کو منظور کر کے اُسکے قدوس کو رحم میں رکھتی ہیں۔ مطابق اُس نبوّت کے جو پہلے ہی سے اُس کے حق میں یسعیاہ نبی کی معرفت بیان ہو چکی تھی تو یوسف نے مریم کو اپنے گھر میں لانا قبول کیا اور اُس کو نہ جانا جب تک کہ وہ اپنا پلوٹھا نہ جنی۔ پس ثابت ہوا کہ پیدایش سے سوائے عیسیٰ کے کوئی اور معصوم پیدا نہیں ہوا۔ سوائے اِس کے کہ اُسکے پہلے حضرت آدم باغ عدن میں۔ اگر یہہ مانا جاوے کہ کسی شخص کو الہام کا موضوع بنانے کے لئے وہ بذریعہ معجزہ معصوم بنایا گیا ہو تو ہم ایسے وقوعہ کو خلاف عقل مانتے ہیں۔ معجزہ کے امکان سے ہم کو ہرگز انکار نہیں ہے اور نہ ہی معجزات کے تواریخی واقعات سے۔ مگر ہم یہہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ معجزہ کسی اصول نیچر کو معطل کر کے اپنے ظہور کے لئے کسی دیگر نو ایجاد قاعدہ کو قائم کرے۔ مثلاً اگر کوئی بیجان بچّہ بذریعہ معجزہ زندہ کیا گیا ہے تو یہہ نہیں توقع کیجاویگی کہ وہ بچہ عادت کے خلاف بصورت ایک بالغ آدمی کے زندہ کیا جاوے بلکہ یہہ کہ وہ بچّے ہی کی صورت میں زندہ کیا جاوے تاکہ آئندہ نیچر اُس کے نشو و نما کے لئے اپنا دستور جاری رکھے۔ اسی طرح اگر موجودہ انسان گناہ آلودہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ روحانی زندگی میں نشو و نما پانے کی طرف سے مردہ ہے۔ جیسے ایک اندھا بینائی کی طرف سے مردہ اور عاری ہے۔ اسی طرح گنہگار کی حالت ہے۔ اور اِس لئے اُس کو روحانی طور پر زندہ کرنا یا نئی پیدائش عطا کرنا صورت معجزہ ہے۔ مگر اُس کی روحانی ترقی ایک دن کا کام نہیں ہے بلکہ اُس میں نیچری طریق بدستور جاری رہیگا یعنی روحانی زندگی

میں تولید پاکر وہ بتدریج پاکیزگی کے رتبہ میں نشو ونما پاویگا جس طرح درخت موسم بہار میں از سر نو تازہ ہوکر نئی طاقت کے آجانے سے سوکھے پتوں کو پھینکنے لگ جاتا ہی اُسی طرح انسان مردہ پن کو روحانی زندگی کے زور پکڑنے سے روز بروز دور پھینکتا جاویگا اور اپنی نفسانی خواہشوں پر غالب ہوکر سیرتِ پاکیزہ اختیار کریگا +

یاد رہے کہ معجزہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک معجزہ تو وہ اصلی معجزہ ہی جس سے خدا عزّ وجل نے مخلوق کو وجود بخشا یا نیچر کو معہ اُس کے اسباب کے ظہور بخشا۔ دوسرے معجزے کا ظہور وقتاً فوقتاً خود مخلوق نیچر میں پایا گیا ہی تاکہ نیچر میں فوق النیچر کا تعلق اور تسلط ظاہر کیا جاوے۔ خیر یہہ تو جملہ معترضہ کے طور پر بیان کیا گیا ہی اب پھر ہم اصلی مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہمارا بیان عصمت کے متعلق تھا اور اس بات پر ہم نے زور دیا تھا کہ ملہم اپنی موجودہ حالت میں حقیقی انسان ثابت ہو۔ ہمارے جیسا ہی ہمجنس انسان مگر فضل کا بندہ ہوکر اور خدا سے توفیق پاکر اپنے گناہوں پر فتحیابی اور خدا میں اپنا فخر ظاہر کرتا ہو تاکہ اُس کے نمونہ زندگی اور قول و فعل سے ہر ایک فرد بشر کو پاکیزہ زندگی بسر کرنے اور خدا کی قربت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ میسر ہو۔ ہمارے بیان سے یہہ ہرگز نہ سمجھا جاوے کہ ملہم کو ایک باغی اور ملحد تصور کیا ہی جس میں پارسائی اور دینداری کی بو تک پائی نہیں جاتی اور جو خدا کو اپنے خیالوں میں جگہ تک بھی نہیں دیتا بلکہ یہہ کہ اُسکا ایمان سچے خدا پر حقیقی اور صادق ہو اُس کی دینداری میں بے ریائی اور صدق دلی پائی جاوے

اُس کی خضوع اور خشوع کمال عجز اور انکسار کے ساتھ ہو۔ اُسکا ایمان پایدار اور مستحکم ہو۔ اُس کی دعائیں اور اقرار اور نیک ارادے ایسے ہوں جن سے ہم کو ایک اصلی اور حقیقی انسان کا نقشہ نظر آوے۔ اس کی سیرت اور خصلت ایسی ہو جس میں ہم کو مرد اور عورت دونوں کے نیک خصائل نظر آویں۔ اُس کا ایمان ایسا ہو جو نہایت ہی پست حالی اور مصیبت میں بھی لغزش کھانے والا نہیں۔ جس کی محبت ایسی ہو جو تمام دلوں کو متحرک کرنے والی ہو۔ اور حمیتِ قوم اور عزت و آبرو بھی اُس پر لے درجہ کی رکھے جس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا ہو۔ اُس کی نفرت خدا کے دشمنوں سے ویسے ہی پرجوش ہو جیسے اُس کی محبت خدا کے پیاروں سے۔ فی الجملہ ایسا ہیرو یا بہادر جو اپنی زندگی کے واقعات میں اپنے کیرکٹر کو عالی درجہ تک پہنچانے میں کوئی ثانی نہ رکھتا ہو۔ جو عدیم المثال اور یگانۂ روزگار ہو اور جسکے زندگی کے نمونہ کی تقلید ادنیٰ سے اعلیٰ انسان از ابتدا تا انتہا کر سکے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو ملہم سے تعبیر کیا گیا ہے وہ خدا سے ہدایت پاکر ہو کر ایسے جواہر اور اوصاف انسانی ظاہر کریگا جو کسی خاص ایک زمانہ یا قوم سے مختص نہیں کئے جا سکتے بلکہ حضرت انسان سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ایسے الہامی شخص کا کلام جو خدا کے مخالفوں اور نیکیوں اور مصائب اور اذیتوں اور گناہوں کو الٰہی نظر سے دیکھتا ہے درجہ عمومیت رکھتا ہے*

پھر عقل اس حقیقت کی بھی مقتضی ہے کہ جیسے نیچر میں ہر ایک چیز کا شروع ہے ترقی بھی ہے اور انجام بھی۔ ویسے ہی الہام میں بھی انسان کے لئے وہی قاعدہ

ترقی کا پایا جانا چاہئے کیونکہ نیچر اور فضل کا خدا ایک ہی ہے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ نیچر میں بقا کے ساتھ فنا بھی لاحق ہے۔ جس کا شروع ترقی اور کمال ہوا ہے اُسکا زوال بھی ہوا ہے۔ بہار کے ساتھ خزاں بھی موجود ہے بقول شخصے ہر ابتدائے را انتہائے مقرر است۔ و ہر آغاز را انجامے معین۔ جبکہ دنیا میں بے ثباتی نظر آتی ہے اور اُس میں کوئی جزو ثبات کا نہیں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک فرد بشر کا ایام طفولیت ہے شباب ہے اور کمال بھی لیکن کمال کے ساتھ زوال بھی بڑھاپے کی صورت میں سامنے آکھڑا ہوتا ہے حتیٰ کہ بقا کو فنا نگل لیتی ہے اور جبکہ اسی طرح ہر ایک سوسائٹی کا شروع ترقی و کمال ہے۔ اور کمال کے بعد زوال تو اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے بحال رکھنے کے لئے ایسی پائدار زندگی کی اُس کو ضرورت ہے جس کو زوال نہیں اور جس کی جسمانی موت محض ایک حالت لا ر و اختیار کرنا ہے جو کایا پلٹ کر فنا کو بقا کا لباس پہنا دیتی ہے۔ واقعی ہر ایک انسان کی موجودہ الفرادی زندگی سے ثابت ہے کہ اُس کا ایک غایت درجہ تک پہنچکر بھی یہی ارمان رہا ہے کاش میری آرزوئیں پوری ہوتیں۔ جو کچھ زندگی کے بڑھانے کے لئے مینے سامان مہیا کئے وہ کافی ہوتے اور اُن سے میری تمنا بر آتی +

عموماً سوسائٹیوں کا بھی یہی حال دیکھا جاتا ہے کہ اُن کا ابتدا ہوا۔ ترقی ہوئی اور کمال بھی ہوا۔ مگر آخر الامر زوال نے آدبایا اور وہ ترقی کے مرحلوں کو طے کرنے سے عاجز آئے حتیٰ کہ اُنکے نادرۂ روزگار بھی نقش برآب کی طرح چند سے مہمان رہکر کالعدم ہوئے۔ کہاں گئیں یونان و مصر اور روم اور ہندوستان

اور اسلام کی قدیم اور زبردست حکومتیں جن کو تجمل شاہانہ اور تہذیب اور علم و دولت سب کچھ نصیب ہوا؟ آخرش اُن کے حق میں وہی صادق آیا جو شیخ سعدی سلاطین کی نسبت کہتا ہے۔ ؎

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند + کز ہستیش بروئے زمیں یک نشاں نماند

کہاں ہے اہل یہود کی داؤدی دنیاوی سلطنت؟ جس دودمان کو اُنہوں نے بابل کی اسیری کے بعد زروبابل کی معرفت از سر نو پھر بحال کرنا چاہا مگر وہ زمین کی پابوس اور پایمال ہوئی اور مسیح کے آنے پر بھی کتب مقدسہ کی غلط تاویل و تشریح کر کے یہی توقع رکھی کہ مسیح کی آمد داؤد کی دنیاوی بادشاہت کو مکرر بحال کریگی۔ نہ یہہ کہ مسیح کی پہلی آمد ایامت کے لئے اور روحانی بادشاہت جسکو کبھی زوال نہیں ہوگا قائم رکھنے کے لئے تھی۔ اب کیا اس صورت میں یہہ اغلب نہیں کہ انسان کو ایسی آلہی توفیق اور ہدایت کی ضرورت ہے جو نئی زندگی کا دم اُس میں پھونکے اور اُس کو ایسے تعلقات سے وابستہ کرے جن کو فنا نہیں بلکہ قیام اور ثبات ہے؟ اسی طرح حقیقی سوسائٹی کے لئے بھی وہ صورتیں الہام کی ہم کو نظر آنی چاہئیں جس میں شروع سے آخر تک ایک متواتر سلسلہ تعلیم و تربیت اور روشنی و ہدایت کا پایا جاوے اور جنکا رخ انسانی تواریخ کی بنیاد پر پایہ بہ پایہ جانب ترقی ہو اور انجام ابدی چشمۂ زندگی کا حصول ہو۔ ایسا الہام جو قوم کی طفولیت میں دودھ کا کام دے۔ یعنی خصوصیت قوم کو بھی ہدائتاً مدِ نظر رکھے اور آئندہ پر ایما کر کے عمومیت کو صادر کرے جو ہر زمانہ کے لئے مفید اور کارآمد ہو۔ الحاصل

حفظ مراتب بھی ہو اور یگانگت اور اتحاد کے رشتہ کو بھی قائم رکھے۔

اس میں تو شک نہیں کہ خدا کے نزدیک ازمنۂ ثلاثہ حال اور موجودہ کی مثال ہی مگر الہام خدا کے مقاصد اور اغراض کو زمانہ میں منکشف اور منتشر کرتا ہی جو تواریخ میں پورے ہوتے رہتے ہیں۔ گویا خدا کل انتظام دنیا کا مالک اور ناظم حقیقی ہی اور جو واقعات میں گذرتا ہی اُس میں الہام بطور روشنی کے یہہ ظاہر کرتا ہی کہ اُسکا انجام کیا ہوگا اور گو الہام کا ظہور بہ واقعات انسانی پورا ہوتا ہی لیکن تواریخ اُس کا مبدا نہیں ہی بلکہ خدا ہی۔ پس تا دیل الہام میں جس میں خدا کی ربوبیت کا دخل ہی انجام کو مقدم رکھنا لابدی ہی۔ یہہ امر مسلمہ ہی کہ خصوصیت تعلیم دل کو عموبیت کے لئے تیار کرتی ہی۔ اس لئے تقاضائے عقل یہہ ہی کہ ہر دو حصص الہام ناکمل اور کمل انسانی زندگی میں در پیش ہونے چاہئیں۔ کیونکہ انسانی تواریخ میں انقلاب زمانہ پایا جاتا ہی۔ نیچر ہی پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے انجام تک نہیں پہنچا ہی۔ اس میں سچ اور جھوٹ رنج اور خوشی شیر و شکر ہوئے نظر آتے ہیں مگر ہم یہہ جانتے ہیں کہ نیچر کا انجام نیک ہی اور گو فی الحال ظاہرًا بدی کا غلبہ نظر آتا ہی مگر اُس کا تسلط دیرپا نہیں ہی بلکہ چند روزہ ہی۔ بٹلر صاحب نے اپنی کتاب مماثلت مذہب میں یہہ مثال پیش کی ہی کہ فرض کرو کسی میدان میں معدودے چند انسان پائے جاتے ہیں اور اُسی میدان میں ہزارہا جنگلی حیوانات بھی موجود ہیں اور اگر اُن کا مقابلہ ہو تو اغلب یہی ہی کہ حیوانات ضرور کثرت تعداد و جسمانی زور کی وجہ سے انسانوں پر غالب آئینگے۔ مگر چونکہ انسان ذی عقل ہی اس لئے

عقل کو کام میں لا کر کچھ عرصہ کے بعد اُن پر غالب ہونے لگیگا بلکہ مغلوب کریگا۔
اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی سوسائیٹیوں میں جبر اور ظلم اور بدی اور گناہ کا تسلط
پایا جاتا ہی اور اگر دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی موجود ہی جو نہ صرف تہذیب اور
تمدن اور معاشرت اور اخلاق میں باقی سوسائیٹیوں سے کہیں بڑھکر ہی بلکہ
اپنی ذات میں اجزا، قیام اور ثبات کے رکھتی ہی تو یہہ اغلب ہی کہ وہ سوسائٹی
باقی جماعتوں کو بتدریج اپنے تحت میں لاویگی اور جس حال کہ دنیا کی حالت
موجودہ میں نیک و بد ملے جلے رہتے ہیں اور بُروں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہی
تو ظاہرا بدی کی صورت نظر آتی ہی اور اگر خدا جو دُنیا کا محافظ اور نگراں ہی ایک
جماعت نیکوں کی قائم کر رہا ہی تو یہہ اغلب ہی کہ آئے دن وہ جماعت کُل
جماعتوں پر غالب ہوتی جائیگی کیونکہ فی الآخر انسان دغا اور دروغ کی نسبت
سچائی اور راستی کا تابع ہونا طبعاً پسند کریگا۔

سائنس بھی یہی جتاتی ہی کہ نیچر کی موجودہ صورت قائم نہیں رہیگی کیونکہ
وہ کشش یا مرکز ثقل جو تمام اجسام ارضی اور اجرام فلکی کو اپنی اپنی جگہ میں بدستور
قائم رکھتی ہی آخر اُن سب کو باہم فراہم کریگی جس سے تمام مخلوق مکرر ایک صورت
ہیولا اختیار کریگی۔ مگر سائنس یہہ نہیں جتا سکتی کہ آیا اُس میں سے ایک ایسی
صورت دنیا کی برآمد ہوگی جس کو زوال کا مُنہہ نہ دیکھنا پڑیگا۔ پس اگر نیچر کا انجام
نیک ہی تو وہ منزلِ مقصود ابھی تک دہلی ہنوز دور است کی مصداق ہی۔
لہذا ہم ایسی کتابِ الہام ڈھونڈھیں جس میں از ابتدا تا انتہا صورت ترقی

نظر آوے اور اس میں ثبات و قیام کے اجزا پائے جاویں +

مگر یہاں تک الہام میں ہم نے انسانی پہلو کا وہ جزو لیا ہی جس میں انسان اپنی موجودہ حالت میں ہدایت یافتہ ہو کر حقیقی اور اصلی نظر آوے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ انسان وہ صورت نہیں رکھتا ہی جو اصلی اُس کو میسر تھی اور باوجود اس کے کہ نیچر میں وہ کچھ سامان اُس کے لئے مہیّا کئے گئے ہیں جو عین اُس کی شان کے شایاں ہیں مگر تاہم یہہ بھی نظر آتا ہی کہ نیچر میں اُسکو پوری پوری آزادی میسّر نہیں ہی۔ گویا کسی اعلیٰ وجود نے اُسکا محاصرہ کیا ہوا ہی۔ حتّٰی کہ اگر وہ ذرا سا بھی اپنی آزادی کی واجب حد سے تجاوز کرے تو فی الفور زیر عتاب آتا ہی مصداق ذٰلِكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَهُوَ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ ایک پہلو سے تو خُدا اُس کے نزدیک معلوم ہوتا ہی۔ کیونکہ وہ اپنی لغمار اور عنایات کو انسان سے ہٹا نہیں لیتا اور دوسرے پہلو سے بہت دور۔ کیونکہ خدا کو انسان کے گُناہ کی وجہ سے اُس کا اعتبار نہیں رہا ہی۔ وہ اُسکو زنجیروں سے جکڑتا ہی کہ مبادا وہ مطلق العنان ہو کر خدا کے انتظام میں مخل ہو۔ کیونکہ خدا نے اُسکو آزاد پیدا کیا ہی اور بے شک اُس کے افعال و اعمال بالارادہ ہیں۔ اب اس صورت میں بھی ہم کو الہام کی ضرورت پڑتی ہی تاکہ انسان کی نسبت جو خدا کا منشا ہی وہ معلوم ہو۔ الہام کے ایک انسانی پہلو کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہی اور یہہ دکھایا ہی کہ انسان کو خدا کے سامنے اپنی موجودہ حالت میں کونسا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔ مگر دوسرا پہلو الہام کا انسان

میں وہ ہونا چاہیئے کہ جس میں ہم اُس کو اُس صورت میں دیکھیں جو اُسے اصلی اور ابتدائی حالت میں حاصل تھی۔ تاکہ وہ موجودہ انسان کے لئے نیکی اور پاکیزگی کا اعلیٰ معیار ہو +

اِنسان خدا کی صورت پر بنایا گیا تھا اور معصوم یا بیگناہ پیدا کیا گیا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ انسان کی سرکشی اُس کے گُناہ کا باعث ہوئی اور خدا نے بھی اُس کو اُسی حالت میں چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ انسان گمراہی میں مبتلا ہو کر ایک طرح سے تو خدا کے حضور سے بھاگا اور آزادانہ منصوبے باندھنے لگا۔ اور دوسری طرف یہہ دیکھکر کہ خدا پھر بھی اُسکا بدستور نگراں ہے اور اُس کی کوئی پیش نہیں جاتی بلکہ انواع و اقسام کی مزاحمتیں پیش آتی ہیں۔ گناہ کے ساتھ تکالیف و مصائب اپنا سیاہ مُنہہ دکھاتی ہیں اور موت بھی لاحق ہے جو اُسکی تمام اُمیدوں اور ارادوں کو پامال کر کے ملیامیٹ کر دیتی ہے تو اُس صورت میں انسان نے کوئی نہ کوئی اپنا ہی خدا دماغ میں تصور کر کے اُسکو راضی اور خوش کرنا چاہا ہے اور حقیقی خدا سے بھاگتا بھی ہے۔ ہم نے جو کچھ یہانتک لکھا ہے تواریخ اُسکی شاہد ہے۔ اب دیکھئے کہ اگر انسان کی موجودہ گمراہی کی حالت میں اُسکو الہامی ہدایت کی ضرورت ہے تو کیا یہہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ پہلے اِنسان اپنی موجودہ حالت سے واقف ہو اور خدائے حقیقی سے بھی آشنائی حاصل کرے اور اس سے بھی کہ خدا کے سامنے وہ کونسا پہلو اختیار کر کے حاضر ہو اور کس طرح خدا اور شریعت کی روشنی میں چلے ؟ مگر اس کے علاوہ انسان کو یہہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اُس کا حقیقی اور اصلی منصب

خدا کی نظر میں کیا ہی؟ بیشک انسانی مرتبہ نہایت ہی افضل ہی۔ مگر انسان نے اپنی اصلی
شان وشوکت کے سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہی۔ یہانتک کہ یا تو اُسنے اپنے آپکو ہی خدا
بنایا ہی یا اپنی حشمت کو کسی نبی یا پیغمبر کے حوالہ کردیا ہی اور اپنی ذات کو حقیر سمجھا ہی چنانچہ
الہام کے دوسرے انسانی پہلو میں یہہ انسب ہی کہ ہم انسانی عصمت کو دیکھیں جس
میں خدا نے ہم کو پیدا کیا تھا۔ مگر عصمت انسانی کوئی نیکی کا درجہ نہیں ہی بلکہ مرتبۂ امکان
رکھتا ہی۔ عصمت کا مفہوم سالباً بیگناہ ہی اور عصمت کا تعلق انسان کے ارادہ سے ہی جب
اِنسان کی نسبت یہہ کہا جاوے کہ وہ معصوم ہی تو اُسکا مطلب اثباتاً یہہ ہی کہ اُس کا
پاکیزگی میں شرف حاصل کرنا امکان سے ہی۔ یا یوں کہیں کہ عصمت پاکیزگی کی
ابتدائی صورت ہی۔ وہ گویا آئندہ کا ادھورا نقشہ کھچا ہوا ہی۔ مگر خدا کو معصوم نہیں کہا
جاسکتا اِس لئے کہ جو انسان میں ابتدائی ہی اور مرتبۂ امکان رکھتا ہی وہ خدا میں
ازل سے کمال کی صورت میں موجود ہی۔ پس ظاہر ہی کہ الہام کے انسانی پہلو میں
ہم نہ صرف عصمت کو دیکھیں بلکہ عصمت کے امکانی عمل کو بھی دیکھیں جو اس تیرہ و
تار دُنیا میں ہر ایک مشکل اور آزمائش پر غالب آتا ہی۔ جو اطاعت خدا کو موت کی زنجیر میں
بھی جکڑے جاکر نہیں چھوڑتا۔ جو انسان کی غمی میں مناسب جواب دیتا ہی اور انسان
کی خوشی میں شریک ہوکر اُسکو اعلیٰ اور روحانی بناتا ہی۔ جو دنیا میں رہکر زہد کا نمونہ
بھی دکھاتا ہی اور اپنی طرف کھینچ لیتا ہی۔ جو دنیا کی ادنیٰ محنتوں کو عزّت کا رتبہ دیتا
ہی اور انسان کے کسی رتبہ کی حقارت نہیں کرتا بلکہ توقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہی۔ جو
مخرّب الاخلاق دُنیا میں نمک کا کام دیتا ہی اور از پا اُفتادہ اِنسان کو مایوسی اور

نکبت کے گڑھے سے نکال کر اُس کی زندگی میں امید اور حوصلہ کا دم پھونکتا ہی۔ جو نفاق اور عناد کو مٹاتا ہی اور صلح کی بنیاد ڈالتا ہی اور رحم اور ہمدردی اور غمگساری کے چشمہ کو کھول دیتا ہی اور خودغرضی کو محو کر کے دوسرونکی خدمات بجالاتا ہی۔ الحاصل جو شریعت کو ریت و رسم کی پابندیوں اور غلامی کی قیود سے چھوڑا کر اُسکو روحانی بناتا ہی اور عبدیت کے جوئے سے نکال کر فرزندی کا رتبہ بخشتا ہی اور شریعت کو انسان کے دل کی تختی پر کندہ کر دیتا ہی۔ اب اس بیان کے متعلق ضرور ہمارے دل میں شک پیدا ہوگا کہ جب انسان معصوم نہیں رہا اور اُس کی ترقی بالکل ٹیڑھی اور کج واقع ہوئی ہی تو یہہ کیونکر ہوسکتا ہی کہ الہام کے دوسرے الہامی پہلو کی تقلید ہو سکے؟ بے شک یہہ مسئلہ نہایت ادق پیش ہوا ہی اور اس کا حل کرنا بھی الہام کے ذمہ ہونا چاہیئے۔ لہذا واضح ہو کہ جب حضرتِ انسان عصمت کی حالت میں قائم نہیں رہا ہی تو یہہ قرین قیاس ہی کہ ایسا شخص روحانی زندگی کی طرف سے مردہ ہی۔ کیونکہ عصمت کی حالت میں نہ رہکر اُس نے نیکی کی جگہ بدی کمائی ہی۔ دوم اس وجہ سے انسان کو نئی پیدائش کی ضرورت ہی اور جب پیدائش کا عطا کرنے والا وہی خدا ہی جس نے ابتدا میں انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا۔ یہہ بھی مخفی نہ رہے کہ اس نئی پیدائش کی تحصیل کے لئے وہی شرائط قائم ہونے چاہیئیں جو ہر ایک ملہم نے پوری کی ہیں یعنی خدا سے ہدایت یافتہ ہونے کے لئے یہہ ضروری ہی کہ انسان سرکشی اور روگردانی کو چھوڑ کر خدا کی پوری اطاعت قبول کرے تاکہ خدا کی روح قلبِ انسانی کو اپنی ہیکل یا سکونتگاہ بناوے

اب اگر یہہ فرض کر لیا جاوے کہ خدا کی طرف سے کسی انسان کو نئی پیدائش حاصل ہوئی ہی تو عیاں ہی کہ اُس کو روحانی زندہ کرنا یا اُس کے دل میں روحانی زندگی کا بیج ڈالنا ایک صورتِ معجزہ ہی۔ اور جیسا ہم نے معجزہ کے تعلق میں بیان کیا ہی کہ نیچر میں اُس کا ظہور گو فوق العادت ہی مگر بعد میں وہی سلسلہ بدستور جاری رہتا ہی۔ اِسی طرح نئی پیدائش کا عطیہ انسان کو روحانی زندگی بخشتا ہی جو بعد میں نیچر کے دستور کے مطابق نشو و نما پاتی ہی +

لیکن علاوہ انسانی پہلو کے الہام میں آلہی پہلو کی بھی ضرورت ہی۔ کیونکہ ہر دو پہلوؤں سے الہام کا باہمی ربط و وصل و میل ہی۔ صرف یہی کافی نہیں ہی کہ انسان اپنی موجودہ حالت سے آگاہی پا کر مناسب حال پہلو خدا کے سامنے اختیار کرے اور اُس کو اپنی تقلید کے لئے ایک کامل معیار انسانی حاصل ہو بلکہ یہہ بھی ضروری ہی کہ انسان حقیقی خدا کو جانے اور اُس سے قربت حاصل کرے۔ یوں تو ہر ایک کے مُنہہ میں خدا وردِ زبان ہی۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا بندہ ہی جسکو خدا کی ہستی سے مطلق انکار ہو۔ نیچر جیسا ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں بہت کچھ شہادات نہ صرف خدا کی موجودگی کے بارہ میں بلکہ اُس کی صفات حمیدہ کی نسبت پیش کرتا ہی۔ تمام وہ لوگ جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں جانتے ہیں کہ خدا نیک ہی۔ مگر خدا کی ہستی کا قائل ہو کر بھی انسان نے حقیقی خدا کو نہیں جانا ہی بلکہ عقل کے گھمنڈ میں ہو کر اور اُسکو صفت عالمیہ قرار دیکر اپنا اپنا خدا دماغ میں تصور کیا ہی اور ضمیر کو پردہ میں ڈالکر اپنا اپنا سا خدا بنا لیا ہی چنانچہ رومیوں کے خط کے پہلے باب کی ۲۱ ویں آیت

سے ۲۳ ویں آیت تک یوں مرقوم ہی کہ اُنھوں نے اگرچہ خدا کو پہچانا تو بھی خدائی کے لائق اُسکی بزرگی اور شکرگذاری نہ کی بلکہ اپنے خیالوں میں بیہودہ ہو گئے اور اُن کے نافہم دل تاریک ہو گئے۔ وہ آپ کو دانا ٹھہرا کے نادان ہو گئے اور غیر فانی خدا کے جلال کو فانی آدمی اور چڑیوں اور چوپایوں اور کیڑے مکوڑوں کی مورت سے بدل ڈالا۔ نیچر جو علامات و شہاداتِ خدا پیش کرتا ہی اُن سے اُس کا خاص مقصد یہہ ہی کہ وہ اُن علامات و شہادات کے ذریعہ سے ہم کو خدا کی درگاہ کے آستانہ تک پہنچادے تاکہ ہم دروازہ کھٹکھٹائیں اور وہ کھولے اور اُس کے عرفان سے جسکا سراغ نیچر میں ملا ہی مستفید او مستفیض ہوویں۔ خدا کے جتانے میں نیچر کا بڑا حصہ ہی بلکہ یوں کہنا انسب ہوگا کہ نیچر خدا کا صحیح پتہ دیتا ہی یعنی جو علامات و نشانات خدا کے وہ ظاہر کرتا ہی بالکل صحیح اور درست ہیں۔ پر ساتھہ ہی ہم یہہ اصرار بلیغ کرتے ہیں کہ جو کچھہ نیچر صاف صاف لفظوں میں جتاتا ہی اُسپر ہماری عقل اپنا حاشیہ چڑھا کر اور مختلف تاویل و تشریح کر کے انسان کو گمراہ کر ڈالتی ہی۔ آجکل کے زمانہ میں علم جیالوجی نے بہت فروغ پایا ہی۔ محققانِ وقت زمین کی تہوں کی کھوج کرتے پھرتے ہیں اور بعض اوقات کھنڈرات میں سے ایسے سراغ و نشانات گذشتہ زمانوں کے بعض حیوانات کے سطح زمین پر نصب کئے ہوئے ملے ہیں جن سے وہ اُن جانوروں کی عادات اور قطع وضع کا بہت کچھہ پتہ و نشان لگا سکتے ہیں۔ اِسی طرح بعض پنجر بھی تمام نہیں تو اُن کا کوئی کوئی حصہ دستیاب ہوا ہی مگر اُن عالی دماغ محققوں نے تصورات سے کام لیکر جزو سے پنجروں کا دہ

کل نقشہ اُتارا ہی اور اُن کو وہ پوستین پہنایا ہی جس سے جزو کل کی صورت میں دکھائے گئے ہیں۔ مگر کیا اصلی جانور کی عدم موجودگی میں کوئی یہہ دم مار سکتا ہی کہ محقق کا تصوّر جانور مذکور کی نسبت عین صحیح ہی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ عقل کا تقاضا یہہ ہی کہ وہ ہرگز تسکین نہیں پاتی جب تک کہ وہ اصلی سراغ اور نشان کی حقیقت کا مشاہدہ نہ کر لیوے۔ اسی طرح خدا کے نشانات و علامات جن میں حکمت اور دانائی اور مقصد اور انجام کے آثار نظر آتے ہیں نیچر میں مشاہدہ کر کے اِنسان کا فرض ہی بلکہ اُس کی فطرت اِس امر کی متقاضی ہی کہ وہ خدا کے دیدار کا طالب ہو تا کہ اُس سے آشنائی حاصل کرے۔ نہ یہہ کہ جب نیچر نے اپنا فرض تمام کیا اور ہم کو خدا کے آستانہ پر لا کر کھڑا کیا تو اُس وقت ہم تصورات سے کام لیکر خدا کا عقلی نقشہ اتاریں جس حال کہ وہ اصالتاً عقل کی تسلیم کے لئے موجود ہی۔ ہاں بیشک ہم کو الٰہی الہام کی ضرورت ہی۔ نیچر نے تو تمام دنیا کے نشیب و فراز دکھا کر اور پہاڑوں اور میدانوں کا سیر کرا کے خدا کی ہیکل کے دالان پر لا کر کھڑا کیا ہی۔ اب خدا کے دیدار کے لئے اپنا دعائی قربانگاہ یا معبد قائم کرنا ضروری ہی تا کہ خدا خود اپنے مکالمات اور مخاطبات سے شرف بخشے۔

عقل انسان محض ایک آلہ دریافت ہی۔ گو اُس میں بعض اصول ایسے موجود ہیں جو نہ تجربہ سے حاصل ہوئے اور نہ کسی اور ذریعہ سے بلکہ از قسم قواعد ہیں جن کے مطابق عقل کا عمل ہوتا ہی۔ مگر یہہ نہیں مانا جا سکتا کہ عقل خود حقیقتوں کی ماخذ ہی۔ اگر عقل میں فی البداہت اصولی قاعدے موجود ہیں تو استقرا اُن کا جواب نیچر

میں موجود ہی۔پس ظاہر ہی کہ عقل خود کچھہ اختراع نہیں کرتی بلکہ جو کچھہ مشاہدہ کرتی ہی اُسپر نظر غور ڈالکر اُسکو رد یا قبول کرتی ہی۔ اگر میری عقل کو یہہ یقین ہی کہ کوئی اصلی ہستی میرا محاصرہ کرتی ہی جسکے بدون میرا کوئی تکیہ اور سہارا نہیں ہوسکتا اور اپنے اصولی قاعدوں کو کام میں لاکر میری عقل اُسکو حاضر و ناظر۔ ہمہ دان و نیک۔ المطلق اور الواحد وغیرہ گردانتی ہی تو کیا ایسی حجج و براہین سے مینے خدا کی حقیقت کو دریافت کرلیا ہی؟ کیا ایک انسان دوسرے کی حقیقت کو بلا ربط وضبط اور بلا اسبادلہ خیالات دریافت کرسکتا ہی؟ اگر یہہ ہوسکتا ہی تو یوں وہ بیسیوں بلکہ سینکڑوں اور من گھڑت اور بھیانک انسانی صورتیں اپنے تصور سے پیدا کرسکتا ہی۔ یا وہمی شکلیں بناکر من مانا گھوڑہ ہانک سکتا ہی جسکا اصلی انسان کی شکل و شباہت کے ساتھہ کچھہ بھی علاقہ نہیں ہی۔ واقعی انسانی مذاہب جن کی بنیاد عقل پر ہی وہ بھی انسان کو خدا کی دہلیز پر لاکر کھڑا کرتے ہیں مگر وہاں پہنچکر بھی عقل چکراتی ہی اور تصورات سے کام لیتی ہی اور قوت ایمان کو جو کہ مرتبہ عقل سے کہیں برتر اور اعلی ہی کارگر ہونے نہیں دیتی۔ بفرض محال اگر میں یقین بھی کرتا ہوں کہ خدا حاضر و ناظر ہی تو کیا اس یقین سے میری تمنا ساکت ہوتی ہی جو خدا کی نزدیکی اور قربت طلب کرتی ہی؟ کیا ایک بیدانتی جو دوئی کو مٹاکر وحدانیت قائم کرتا ہی اپنے اِس عقیدہ میں قربت و وصالِ خدا کی دلی تمنا اور آرزو کو ڈنکہ کی چوٹ ظاہر نہیں کررہا ہی؟ پھر اگر میں نے جانا کہ خدا نیک ہی اور اس یقین کے مطابق میں اُس کی حمد بجالاتا ہوں تو کیا اس یقین سے کل خدائی کا مسئلہ حل ہوگیا ہی؟ کیا میری دلی تمنا اور آرزو یہہ نہیں ہی کہ میں خدا کی محبت میں سے جو بے پایاں ہی کچھہ حصہ لوں اور

شکرگذاری کے علاوہ اُس میں خوشحال رہوں اور اپنی محبّت کے چشمے کو جو نفسانی آلایش سے مملو ہوکر مختلف نفسانی خواہشوں میں بےچین اور مضطر ہوکر بہ رہا ہے خدا کی طرف انڈھیلوں ؟ جہاں تک انسان کو رسائی کی وسعت ہے اگر وہ میدان تنگ کر دیا جاوے تو اس میں شک و شبہ ہی نہیں کہ اُس کی تمنائیں اور آرزوئیں ہرگز مقصد کو نہیں پاسکینگی۔ کیا انسان کے عقیدوں میں جو قدرت پرستی واقعہ ہوتی ہے کہ کسی ہیرو یا بہادر یا پیر و پیغمبر کی وہ تعظیم و تکریم کرتا ہے جو صرف ذاتِ خدا کو ہی زیبا اور بجا ہے اس حقیقت کی شاہد نہیں کہ وہ واقعی اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے مٹانے کے ہر وقت درپے رہتا ہے ؟ میری روح میں وہ کچھ مرکوز ہے جو اُن وسایلِ معلومات سے جن کا ذکر بابِ اول میں ہوا سیر نہیں ہوتی وہ تو خدا کے دیدار کی طالب ہے۔ نیچر میں جبکہ حکمت اور دانائی کے آثار نظر آتے ہیں اور اُس کا انجام نیک دکھائی دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُس کا بنانے والا کوئی بیجان چیز نہیں ہے اور نہ ہی کوئی طاقتِ محض۔ بلکہ کوئی ایسا وجود ہے جس کے دانا اور نیک آثار نیچر میں مشاہدہ کرکے میں اُس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور اُس کی قربت اور رفاقت کا محتاج ہوں۔ کیونکہ نیچر واقعی خدا کی ہیکل کی دہلیز تک مجھے پہنچاتا ہے آگے درگاہِ الٰہی کے دروازہ کا کھٹکھٹانا میرا کام ہے اور دروازہ کھولنا اور ہیکل میں داخل کرنا خدا کا کام ہے۔ نیچر خود الہامِ خدا ہے جو ہر ایک انسان پر ظاہر کیا گیا ہے تاکہ وہ اُس میں خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر کمال فروتنی اور اطاعت والی طبیعت اور دلی ارادت کے ساتھ اُس کی جستجو اور تلاش کے زیادہ درپے ہو۔ تاکہ خدا خود اپنی قربت اور

نزدیکی سے اُس کو شرف عنایت کرے +

جب خداوند مسیح دنیا پر تھا وہ دوست اور دشمن دونوں پر ظاہر ہوا۔ اہل یہود جو اُس کے مخالف تھے اُن کے سامنے اُس نے اپنے دعووں کی تصدیق میں بہت مضبوط نشانیاں دکھائیں مگر سخت دلی کی وجہ سے وہ نشانیوں پر نشانیاں طلب کرتے رہے۔ مسیح خداوند نے اپنے جی اُٹھنے کی نشانی کا پتہ اُنکو دیا اور جب وہ اُنہی کے ہاتھوں سے مصلوب ہوا اور قبر میں رکھا گیا اور مُہر لگا دی گئی اور رومی سپاہیوں کے پہرے کھڑے کئے گئے تو بھی وہ اپنے قول کے مطابق تیسرے دِن مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ اُس وقت اہلِ یہود اگر ذرا بھی نرم دل ہوکر اور اطاعتِ خُدا قبول کرکے اُس کے جی اُٹھنے کے نشان کے درپے رہتے اور کُھلی گور کو دیکھکر یہہ پکارتے کہ بے شک اے خداوند یہہ گور کے تمام ماجرے تیرے نشان کو ہمپر ظاہر کرتے ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ تو مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے اپنا دیدار ہم کو عنایت کر تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مسیح خداوند ویسا ہی اپنے تئیں اُنپر ظاہر کرتا جیسا اُس نے اپنے شاگردوں پر ظاہر کیا۔ نیچر بھی خدا کی درگاہ تک ہم کو پہنچاتا ہے مگر تواریخ دیکھا جاتا ہے کہ انسان نے دروازہ تک پہنچکر سر تسلیم خم نہیں کیا ہے بلکہ دماغی تصور اور قیاس اور میلان نفسانی کو کام میں لاکر بدستور سرکش و منافق رہا ہے اور دنیا کے جنجالوں میں اُلجھکر اندھیرے میں چلتا رہا ہے۔ خدا اپنا دیدار ایسے شخص کو عنایت نہیں کرتا جو اپنے گھمنڈ اور غرور پر نازاں ہے۔ بلکہ ایسے شخص کو جو حقیقی تائب ہوکر اور دلی ارادت سے بلکہ خاکساری اور فروتنی کا لباس پہنکر اُس کے دیدار کا

طالب ہوتا ہی اِس لئے الہامی اشخاص ہمارے لئے نمونہ ہیں جن کے نقشِ قدم پر چل کے ہم حقیقی خدا کی آشنائی سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ نیچر ظہورِ خدا اُس حد تک ہی جہاں تک اس میں ہم کو خدا کے نشانات ملتے ہیں اور اُن علامات کی منشا اور مقصد یہی ہی کہ خدا کی درگاہ کی دہلیز تک پہنچکر ہم اُس کے دیدار کے خواستگار ہوں نیچر خدا سے وصل کرانے کے لئے ہمارے دِل کو تیار کرتا ہی مگر ایک سخت دل اُس کی آواز کو نہیں سُنتا اور وہ جو سُنتا ہی سو خدا کے آستانہ پر کھڑا ہو کر تصور سے کام نہیں لیتا بلکہ بالائی معرفت وعرفان کا طالب ہوتا ہی اور خدا کا مطیع اور منقاد ہو کر صحیح الہام کو فوراً قبول کر لینے پر آمادہ ہوتا ہی +

واضح رہے کہ خدا کے الہام کے حق میں ہم یہہ طلب نہیں کرتے کہ وہ اپنی ہستی کے لئے نیچری دلائل اور شہادات پیش کر کے اپنا پیچھا چھڑائے بلکہ یہہ کہ جو نیچر میں اُس کے نشانات وعلامات موجود ہیں انکی وہ خود با اختیار اور مستند تصدیق کر کے یہہ مزید جتائے کہ نیچر کا خالق ومالک کون ومکان جو ہی سو میں ہوں۔ تم میری ہی کھوج میں ہو۔ اِس لئے تم میری سُنو۔ اور میں وہ نہیں ہوں جس کو ایک گھمنڈی انسان اپنے تصورات میں کچھہ اور ہی سمجھے بیٹھا ہی کسی نے تو مجھے مادی چیزوں میں دیکھکر مادہ کی سی میری صورت بنا دی ہی کسی نے دماغی تصورات سے مجھے ایسا ظاہر کیا ہی جس میں میرا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا اور کسی نے اپنی ضمیر کو دبا کر اور غلط فیصلہ کر کے مجھے انسان کی سی روشوں میں ظاہر کیا ہی۔ سچ ہی کہ انسان نے اپنی حکمت سے بھی خدا کو نہیں جانا ہی۔ وہ نیچر کا ظہور باقاعدہ جاری دیکھہ کر اُس کی عادت میں

خرقِ عادت کا واقع ہونا غیر ممکن سمجھتا ہی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا نیچر کا ضابطہ یا اتحاد
از قسمِ موجد ہی یا از قسمِ اسباب یا از قسمِ مفاعل یا از قسمِ قدرت؟ ہرگز نہیں! قانون سے
مقدم قدرت ہی جس کا ظہور با ضابطہ قانون دکھا رہا ہی اُس کو طریقِ عمل کہو یا
مظہرِ اعمال نیچر کہو جو کہو بجا ہوگا۔ پس عادت میں خرقِ عادت کا داخل ہونا
مُمتنع الامکان نہیں ہی۔ مثلاً عادتاً مادہ میں خصوصیت جان کی نہیں پائی جاتی
تاہم جان کے دخل کا امکان اس میں بذریعہ اُس حکومت کے ہی جو اُس پر
فوق رکھتی ہی۔ نباتات اپنا ظہور روزمرہ کے مشاہدہ میں جمادات میں پیدا کرتی
نظر آتی ہی تو کس صورت میں معجزہ کا صادر ہونا غیر ممکن ہی؟ معجزہ کا مقصد خدا
کا وجود قائم کرنا نہیں ہی بلکہ معجزہ یہہ ظاہر کرتا ہی کہ خدا نیچر کا نہ صرف خالق ہی بلکہ
نیچر کا مالک بھی ہی اور اُس نے اپنا تعلق نیچر سے منقطع نہیں کیا ہی بلکہ بدستور جاری
رکھا ہی۔ کیونکہ انسان گناہ کی وجہ سے گمراہ ہوگیا ہی اور خدا کی نسبت شہاداتِ
نیچر اُسکے لئے کافی نہیں ہیں وہ راہ پر لائے جانیکا محتاج ہوگیا ہی اور معجزہ اُس کی
رہبری کے لئے یقین کی ایک صورت پیدا کرتا ہی +

یاد رہے کہ حقیقی علمِ خدا وہ زندگی بخش علم ہی جو فقط خدا کی قربت ہی سے حاصل
ہو سکتا ہی جس میں ہماری روح اعلےٰ و برتر رویا سے مستفیض ہوتی ہی اور اُس رویا سے
فیضیاب نہ ہونا روحانی موت اور ظلمت کا منہہ دیکھنا ہی۔ مذہب تصورات میں سے
نہیں ہی بلکہ حقیقی خدا کے مکالمات و مخاطبات سے قربت حاصل کرنا ہی لیکن ایک
کوتاہ اندیش انسان کا عقیدہ نیچر ہی۔ ہم ایسے شخص کو یاد دلاتے ہیں کہ فوق النیچر

نیچر کی اصل ہے۔ نیچر فوق النیچر کا ظہور ہے اور اس ظہور کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں فوق النیچر نیچر سے مقدم ہے اور اُس پر فوق رکھتا ہے۔ نیچر پر اُس کی اصل او حقیقت موقوف نہیں ہے بلکہ وہ نیچر کا خالق و مالک ہے +

معجزہ کے اظہار سے فوق النیچر ایک نئی طاقت کو نیچر میں داخل کرتا ہے۔ مثلاً جس جگہ تعلقات اندرونی و بیرونی مسدود ہو گئے ہیں اُن کو وہ نیچر میں از سرِ نو قائم کرتا ہے تاکہ نیچر کو غائت مطلوبہ کی تکمیل کا پورا موقع ملے۔ اگر فوق النیچر کا وجود یقین کے قابل ہے تو یہہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنا ظہور نیچر میں کر سکتا ہے اور درحقیقت علت و معلول کی صورت میں اُس کا ظہور نظر آتا ہے اور جب وہ علت العلل بھی ثابت ہے تو نفس الامر یہی ہے کہ وہ نیچری اسباب پر قابض ہے۔ ہاں اگر اُس کا ظہور معجزہ کی صورت میں بے سود اور بے مطلب ہو یعنے نہ تو وہ نیچر کے مقصد کو اور نہ روح کے کسی تقاضے کو پورا کرے تو مانا جاویگا کہ وہ بیجا طور پر مخل ہوا ورنہ نہیں۔ فرض کرو کہ ہمارے سامنے ایک لاش پڑی ہے جب تک اس میں جان موجود تھی وہ بدن حل ہونے نہیں پاتا تھا۔ اب مُردہ حالت میں اُس میں حلول کی صورت نظر آتی ہے۔ درحقیقت تو عین حیات ہی میں بدن کے عناصر ہر وقت حل ہونے کے لئے متحرک تھے۔ وہ مرحوم اپنی زندگی میں فنا کا لباس پہنے ہوئے تھا مگر اُس کی فنا پر جان فوق رکھتی تھی جو عناصر کو ترکیب دیتی رہی۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب پودا بڑھتا ہے تو زمینی کشش کا دباؤ اس میں برابر جاری رہتا ہے مگر پودے میں بھی جان کشش پر فوق رکھتی ہے یہہ

صورت معجزہ کی ہی- فرق فقط یہہ ہی کہ اُس کا دخل وہاں ہوتا ہی جہاں یہہ رشتہ
قائم نہیں رہا ہی تاکہ اُس رشتہ کو پھر قائم کرے- الحاصل فوق النیچر نے نیچر کو پیدا
کیا ہی- وہی اُس کی اصل ہی اور یہی بڑا قائم معجزہ ہی- پھر یاد رہے کہ فوق النیچر ہی نیچر
میں قائم رہتا ہی یعنی علت العلل نیچری اسباب کے ثبات کا باعث ہی سوم- فوق النیچر
ضرورت کے وقت نیچر میں نئی صورت میں داخل ہوتا ہی جس سے ایسی طاقتیں وقوع
میں آتی ہیں جو نیچر میں معدوم تھیں- پہلے الہام اور اُسکی تصدیق کی صورت ہی جب
نیچر خود ایک صریح معجزہ ہی اور مطابق اُس حرکت کے جو اُسے دی گئی متحرک ہی تو فوق النیچر
کے لئے دوسری صورتوں میں پھر ظہور پکڑنے کا کونسا امر مانع ہی جس حال کہ نیچر کے
انجام اور تکمیل کے لئے اُسکا موجود ہونا نہایت ہی ضروری ہی کیونکہ ترقی کے قائم
کرنے اور تکمیل انجام کے لئے وہی سبب قیام اور ثبات ہوسکتا ہی- اگر یہہ اعتراض
ہو کہ نیچر میں تو توحیدی ضابطہ پایا جاتا ہی اور اس لئے فوق النیچر کی مداخلت اُس
میں بیجا متصور ہی تو ہمارا سوال یہہ ہی کہ کیا توحیدی ضابطہ کوئی انجام کی صورت
ہی؟ ہرگز نہیں ضابطہ مذکور سے یہہ مراد ہی کہ وہی اسباب اور اُن کے افعال کی
وہی بدستور حالتیں وہی بدستور نتایج پیدا کرتے ہیں مگر جب دنیا میں گمراہی ہی
اور نیچر میں بے ثباتی نظر آتی ہی تو کونسا امر مانع ہی کہ اعلی سبب کا دخل نیچر میں پایا
جاوے جس حال کہ اُس کے مناسب مداخلت سے انسان گمراہی سے راہ پر
لایا جاتا ہی- اور نیچر مقیم اور مثبت قرار پاتا ہی*

معجزہ کے متعلق ضروری ہی کہ کتب مقدسہ کے چند معجزوں کی خاص صورتوں کا

ذکر کیا جاوے + **صورت اوّل** - خدا تعالیٰ کی اعلیٰ طاقت کو جو نیچر پر فوقیت رکھتی ہی ظاہر کرتی ہی- اُس کی پہلی صورت پُرانے عہدنامہ میں پائی جاتی ہی جس میں خدا کا قہر ظاہر کیا گیا ہی جو انسان کہ منصوبوں پر غالب ہی- مثلاً خدائے قادر کے اعجاز موسیٰ کی معرفت فرعون بادشاہ کے روبرو- **دوسری صورت** نئے عہدنامہ میں پائی جاتی ہی جس میں خدائے رحیم و کریم کا فضل ظاہر کیا گیا ہی- مثلاً مردوں کا جلانا کوڑھیوں کا پاک صاف کرنا جنم کے اندھوں کو آنکھیں دینا وغیرہ- ان میں اُس کی طاقت ظاہر کی گئی ہی جو نیچر پر قابض ہی- پھر ایک اور صورت ہی جس میں مسیح خداوند کی عالم الغیبی ظاہر کی گئی ہی مثلاً قیصر کو جزیہ ادا کرنے کے لئے مسیح کا پطرس کو دریا پر بھیجنا تاکہ وہ وہاں پہنچکر اپنی بنسی دریا میں ڈالے اور جو مچھلی آوے اُس کے پیٹ میں سے سکہ نکالے + پھر ایک اور صورت ہی جس میں وہ نیچر کے اسباب کے استعمال میں پورا حاوی اور نیچر کی خبر اور معلومات میں علم محیط و کل رکھتا ہوا ثابت ہوتا ہی- اِس میں اُس کی ہمہ دانی ظاہر کی گئی ہی- ایسے معجزات کے حوالے پیش کرکے منکرانِ معجزہ اکثر مسیحائی معجزوں کو طبابت سے منسوب کرتے ہیں- یوں ہی سہی- مگر اُس کی طبابت ایسی واقع ہوئی ہی جو نیچر کے ہر ایک برگ بوٹے سے واقف- ہر ایک مجرب نسخہ سے آشنا اور ہر ایک مرض کی تشخیص میں دسترس کامل اور علاج میں یدِ بیضا کا حکم رکھتی ہی- اُس کی طبابت وسائل نیچر کو صحیح عمل میں لانے کو پورا اور کامل حکم رکھتی ہی- دُنیا کے تمام اطبا آجتک بھی اپنے آلاتِ سائنس و معلومات سمیت اُسکے مقابلہ میں ابجد خوانی کے مدرسہ

ہیں مبتدی ہیں جس کی طبابت موجودہ بیسویں صدی کی طبابت کے مقابلہ میں
شروع ہی سے کمال درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اگرچہ یہ ترقی میں زینے ہیں تو مسیح خداوند
اپنی انسانی ذات میں شروع ہی سے ترقی کے انجام تک پہنچا ہوا تھا اور اگر مسیح
کے تیسرے قسم کے اعجاز ہمہ دانی کو انسانیت سے منسوب کریں تو یہ بات قابل یاد
ہے کہ وہ کامل انسان بھی تھا اور اپنے آپ کو بجا ابنِ آدم سے منسوب کرتا رہا۔
اس قسم کے معجزوں میں اس نے پیش خیمہ کے طور پر حضرت انسان کا وہ مرتبہ امکان
دکھایا ہے جو وہ ترقی کے زینہ پر خدا کا بندہ ہو کر متواتر حاصل کرتا رہیگا۔ دیکھو
زبور ۸ کیونکہ اگر دیکھا جاوے تو انسان واقعی خدا کا ہم خدمت ہے۔ مگر ابتدا میں
عصمت کے امکانی مرتبہ پاکیزگی کو حاصل نہ کرنے کی وجہ سے اُس کی ترقی
ٹیڑھی واقع ہوئی ہے۔ ورنہ اُسکا اصلی منصب نہایت ہی اعلیٰ ہے چنانچہ
مرقوم ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے انسان کو نر ناری پیدا کیا تب ان کو برکت
دی اور کہا کہ "پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو اور اُس کو محکوم کرو اور سمندر کی
مچھلیوں پر اور آسمان کے پرندوں پر اور سب چرندوں پر جو زمین پر چلتے
ہیں سرداری کرو" اِن الفاظ میں انسان کا سرتاج ہونا ظاہر کیا گیا ہے اور
صفحاتِ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس درجہ تک مختلف اقوام نے اس مرتبہ
امکان کو عمل میں لاکر ترقی یا تنزل کو حاصل کیا ہے مسیح کامل انسان اور کامل
خدا تھا۔ اُس میں ہم نہ صرف اُس کو انسانی عصمت کے ترقی کے مرحلوں کو پورا
پورا طے کرتے دیکھتے ہیں بلکہ ہم اُس میں ایک ایسے انسان کو دیکھتے ہیں جو حاکم

اور سرتاج ہی جب کا کلام با اختیار اور با سیاست تھا جس کا قدم دریا پر رکھا ہوا تیپی کشش پر غالب تھا جس کا حکم ہوا کی تندی اور موجوں کے تھپیڑوں کو دھیما کر دیتا تھا جس کی قدرت نے اسباب نیچر کو استعمال کر کے انسانی حکومت کی مُہر کو جو انسان عدن سے لیکر نکلا تھا قائم کیا +

اب یہہ جاننا چاہیئے کہ حقیقی خدا کی شناخت کس طرح ہو سکے؟ ایک طرف تو خدا کی علامات نیچر میں مجھے نظر آ رہی ہیں۔ اور دوسری طرف میری آرزوئیں اور تمنائیں دھوئیں کی طرح دل کے قربانگاہ سے اُٹھتی رہتی ہیں کہیں تو نیچر پرستی ظاہر ہو رہی ہے کہیں دماغی گنبد میں اپنی ہی صدا سُنکر انسان فنا فی اللہ ہوا جاتا ہے اور کہیں دیوی دیوتاؤں کی آڑ میں ہو کر خدا سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ کہیں قبروں کو جھانکا جاتا ہے اور کہیں پیرو پا بھاروں کا دامن پکڑ کے خدا خدا پکارا جاتا ہے۔ اس صورت میں خواہ مخواہ دل میں یہہ سوال اُٹھتا ہے کہ میں خدائے حقیقی کو کس طرح دریافت کروں؟ ہاں! جس جگہہ نیچر نے لا کر مجھے کھڑا کیا ہے وہ زمین متبرک اور پاک ہے اور اسرار و نکات سے محصور ہے اس سے آگے طائرِ عقل کے پر جلتے ہیں ؎ اگر یک سر موئے برتر پرم + فروغ تجلی بسوزد پرم +

وہانتک پہنچکر ہم کو یہی زیبا ہے کہ سرِ تسلیم خم کریں اور خدا کی تعظیم بجا لاویں۔ چنانچہ موسیٰ جب جلتی جھاڑی دیکھ کر نزدیک پہنچا اور دریافت کیا کہ ضرور اس جھاڑی میں خدا موجود ہے تو پاؤں سے جوتی اُتاری اور تعظیم بجا لایا تب خدا نے اپنی حقیقی پہچان معجزہ سے تصدیق کر کے اپنے بندہ کو عنایت کی۔ اسی طرح

خداوند مسیح کی پیدائش کے وقت مجوسی نیچر کی علامت کا ملاحظہ کرکے اور اُسی کی ہدایت سے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے یروشلم میں آئے اور خدا نے بھی اُن کو گمراہ نہیں رکھا بلکہ نیچر ہی کی علامت کے ذریعہ سے اُن کو خداوند مسیح تک پہنچایا اور وہ لوگ بچہ کو ماں کی گود میں دیکھتے ہی تعظیم بجا لائے اور اُنھوں نے نذریں پیش کیں اور خوشی سے اپنے ملک کو واپس لوٹے۔ کاشکہ انسان نیچر میں اُن علامات خدا کو دیکھکر جن میں اسرار نظر آتے ہیں اپنے تصوّر کو کام میں نہ لاوے بلکہ سر تسلیم جھکاوے اور تعظیم خدا بجا لاوے اور اُس کی درگاہ کے دروازہ پر کھٹکھٹاوے تاکہ وہ کھولے اور اپنا درشن دے۔ الہام میں اسرار کا پایا جانا اس امر پر دال ہے کہ اُس کی بنیاد عقل پر نہیں ہے بلکہ خدا پر جو کہ بے پایان و بے کران ہے۔ اُس کی بنیاد انسانی حکمت اور احاطۂ بشری سے برتر ہے۔ یاد رہے کہ جس مذہب میں کشف الٰہی کے ساتھ اسرار موجود نہیں ہیں اُس کی بنیاد خام ہے۔ وہ ہرگز قائم نہ رہیگا اگر اسرار اور نکات کو نیچر سے محو کر دیا جاوے تو انسان خدا کے مرتبہ کو چھین لیتا ہے۔ بابا آدم نے بھی یہی کیا تھا۔ اُس نے اُس پھل میں سے کھایا جسکا کھانا منع تھا۔ اُس نے پھل میں کچھ نہ کچھ بھید تو دیکھا ہوگا مگر شیطان کے دھوکے میں آکر یہہ سمجھا کہ اُس کے کھانے سے اُس کی آنکھیں کھل جاوینگی اور وہ ہرگز نہ مریگا بلکہ خدا کے برابر ہو جاویگا۔ یہی حال دنیا کا شروع سے چلا آیا ہے انسان خدا کی قربت حاصل کرنے کے بجائے ساری خدائی کو سمیٹنا چاہتا ہے۔ گویا کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت میں مذہب کے پرکھنے

کا معیار یہی افضل ہے کہ آیا اُس میں اسرار کی جگہ ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو وہ الہام
کے پایہ سے گرا ہوا ہے کیونکہ اُس کی بنیاد انسانی عقل پر ہے۔ اسرار سے یہہ
مراد نہیں ہے کہ جو بعید از عقل و فہم ہے بلکہ یہہ کہ وہ عقل کی ایجاد نہیں ہے گو عقل
اُس کو تسلیم کرتی ہے جس میں سے کچھ اُس کے ادراک میں آتا ہے اور باقی راز کے
طور پر معلوم کرتی ہے۔ اگر اُس کو خدا کی حکمت نظر آتی ہے تو اُس کی حکمت کا کوئی انتہا
نظر نہیں آتا۔ اگر الٰہی اظہار محبت ہے تو بے پایاں نظر آتی ہے۔ اگر اظہار خدا ہے
تو اُس کو دیکھ تو لیتی ہے مگر اُس کو محسوب یا اُس کی تحدید نہیں کر سکتی بلکہ سر تسلیم
جھکاتی ہے اور اُس کے زیادہ دریافت کرنے کے درپے رہتی ہے +

بابِ سوم

اِسلام

اِسلام کے متعلق عیسائیوں کی طرف سے بہت کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ہم نے یہہ دیکھنا ہی کہ محمد صاحب نے خدا کو کہانتک پہچانا اور کس قدر اُن کو خود اپنی ذات سے آشنائی تھی؟ آیا قرآن الہام کے مدعا کو پورا کرتا ہی یا نہیں؟ جب یہہ دیکھا جاتا ہی کہ مسلمانوں کا ایمان اور عمل صرف قرآن ہی پر مبنی نہیں ہی بلکہ سنّت محمدی پر بھی اور اِس سنّت کا اطلاق دین کے اُن کاموں پر ہی جو محمد صاحب کے اقوال و افعال پر مبنی ہیں جو سنتِ قولی سنت فعلی اور سُنتِ تقریری کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا منشا یہہ ہی کہ جو کچھہ محمد صاحب نے کہا اور کیا ہی وہ سب کچھہ خدا کی ہدایت سے تھا اور اُس پر ایمان لانا اور عمل کرنا اتباعِ سُنت ہی اور کلمہ لا الہ الا اللہ کی شہادت دینا ایمان مکمل کی نشانی نہیں ہی جب تک کلمہ کے ساتھہ رسالت کی شہادت بھی نہ دیجاوے۔کیونکہ جو کچھہ محمد صاحب نے دین اور دنیا کی نسبت خبر دی اُس سب کا ماننا لازم ہی۔ علاوہ ازیں بہت سی احادیث معتبرہ میں بھی بیان کیا گیا ہی کہ جماعتِ اہلِ سُنت بہشتی قرار دیجاویگی بلکہ مدارج النبوت میں بھی جب مومنوں کو یہہ نصیحت کیجاتی

ہی" کہ خدا کی اطاعت کریں اور نبی کی محبت کا اقرار کریں کیونکہ خدا کی محبت نبی کی فرمانبرداری سے مشروط ہی" تو ظاہر ہی کہ محمد صاحب کے اقوال و افعال ایسے اصول اسلام ہیں جن میں تغیر و تبدل کو مطلق دخل نہیں ہی - اجتہاد وہی جائز ہی جو خلفائے راشدین کی بنیاد پر جو سینہ بسینہ قائم چلی آئی ہی جاری کیا جاوے کیونکہ سنت اجماع اور قیاس کے اسناد صرف صحابۂ کرام اور تابعین اور تبع تابعین ہی قائم کر گئے ہیں - چنانچہ آجتک قرآن کے مکلفوں میں کوئی ایسا اجتہاد جاری نہیں ہوا ہی جو اُن کی تقلید سے خارج ہو کیونکہ اجتہادوں کی بنیاد جو قائم ہو چکی ہی وہ تو مجموعۂ سنت میں منضبط ہی +

مسلمانوں میں عموماً یہہ بات بھی پائی جاتی ہی کہ الاول ما خلق اللہ نوری - نورِ محمدی ایک عام روایت چلی آتی ہی اور شیعوں میں یہہ اعادہ کرکے مانا جاتا ہی کہ وہ نور علی میں منتقل ہوا تھا اور علی سے باقی اماموں پر اِس لیے اُن کے عقیدہ میں صرف وہی مستحق خلافت ہیں - مذکورہ بالا بیان سے یہہ ظاہر ہی کہ محمد صاحب کا وہ منصب اور رتبہ ہی جو کسی دوسرے مخلوق کا حصہ اور حق نہیں ہو سکتا چنانچہ بہت سی اس قسم کی روایتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ اصحاب سنت نبوی کو کیسا عزیز رکھتے تھے اور محمد صاحب کا ہر ایک قول و فعل اُن کے سر اور آنکھوں پر ہوا کرتا تھا صحابہ میں سے ایک نے تربوز کھانے سے دریغ کیا کیونکہ اُس کے کھانے کی شرح کی نسبت اُس کو کوئی مستند حدیث نہیں پہنچی تھی - اُن کی تعظیم و تکریم کی صحابہ میں یہہ نوبت تھی کہ جب آنحضرت تھوکتے

تھے تو وہ اُسے اپنے ہاتھوں پر لیکر منہہ پر ملتے تھے۔ جب کسی کام کرنے کو کہتے تھے تو گو وہ ادنیٰ لوگوں کے کرنے کا ہوتا تو بھی بڑے بڑے آدمی نہایت شوق و ذوق سے اُسے خود کرتے تھے۔ جب آپ بولتے تھے تو سب چپ چاپ نہایت ادب سے اُن کی بات سُنتے تھے اور اُن میں یہہ مجال نہ تھی کہ اُن کے منہہ کی طرف دیکھ بھی سکیں ۔ ۔ ۔ جب آپ وضو کرتے تھے تو اُن کے مستعمل پانی کو تبرک کے طور پر لینے کے لئے بڑی جد و جہد ہوتی تھی۔ جب اُن کی داڑھی یا سر سے کوئی بال گرتا تھا تو بڑی احتیاط سے اُٹھا لیتے تھے۔ اگر صحابہ کی نظر میں محمد صاحب کی یہہ توقیر تھی تو صحابہ کا اتباع باقی مسلمانوں پر فرض اور واجب ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہی تعظیم جو مذہب کا ایک اہم اور ضروری حصہ انسان کے دل میں پایا جاتا ہے خدا کی جگہ ایک مخلوق کو دیجاتی ہے۔ یہہ تو سچ ہے کہ توحید کی شہادت دینا ہر ایک مسلمان پر شرعاً فرض ہے اور یہہ بھی سچ ہے کہ محمد صاحب نے اپنے آپ کو خدا نہیں کہا بلکہ عبدہٗ و رسولہٗ لیکن قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور اس لئے قرآن کے علاوہ سنّت نبوی کی اطاعت پر زور دیا جاتا ہے۔ اطاعتِ الٰہی پر زور نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ اطاعت نبوی پر۔ مسلم میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی تو مقرر اُس نے خدا کی اطاعت کی دیکھو مشارق الانوار صفحہ ۱۴۹۔ تمام مسلمانی دین اور ایمان کا اطلاق محمد صاحب کی اطاعت پر مبنی ہے مسلمانوں کی تواریخ محمد صاحب کی تقلید اور اطاعت کی تواریخ ہے کیونکہ مطابق مدارج النبوت نبی کی محبت کا اقرار کرنا

الوہیت کی شہادت دیتا ہی۔ جب یہہ حال ہی تو ظاہر ہی کہ اللہ نام ہی نام کو مسلمانوں کے زبان زد ہی درحقیقت اُن کے دلوں میں محمد صاحب کی عظمت تسلط کر رہی ہی چنانچہ اس قسم کے کلمات محمد صاحب کے حق میں کہے جاتے ہیں۔

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر

من وجہک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثنا ء کما کان حقّہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

خدا کی تعظیم میں مخلوق کو شریک کرنا شرک ہی مگر اس میں تو عظمت کا وہ حصّہ جو خدا ہی کو زیبا ہی مخلوق پر چسپاں کیا جاتا ہی۔ اس کی کیا وجہ بتائی جاتی ہی کہ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھہ کلمہ رسالت بھی پڑھا جاوے۔ اگر محمد صاحب سلسلہ انبیا سابقین میں سے تھے اور توراة اور زبور اور صحائف انبیاء وغیرہ کے مصدق تھے۔ تو بمصداق اَنَا مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَکُمْ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَھُمْ اول نبی کے درجہ سے بڑھہ کر اپنے آپ کو رسول کیوں کہا اور کیوں نبوت اور رسالت میں وہ حقوق اپنے اوپر جمائے جو کسی نبی اور رسول برحق کے خیال وخواب میں بھی نہیں گذرے کہ اُس کا ہر ایک قول و فعل الہامی درجہ رکھے ہ کیوں محمد صاحب کے قریب اور بعید معتقدین نے قرآن کے علاوہ محمد صاحب کے ہر ایک ذاتی قول وفعل اور تقریر کو ایسا رتبہ اور پایہ بخشا جس حال کہ انبیاء سلف کے کلامِ الہامی کے ساتھہ اُن کے پیرؤوں نے اُن کے ہر ایک ذاتی قول و فعل

کو الہامی تصور نہیں کیا؟ اور کیوں محمد صاحب نے اپنی ذاتی اطاعت پر زور دیا جبکہ سابقین نے اپنے اظہار الہام کے ساتھ اپنی ذاتی اطاعت کو شریک نہیں کیا بلکہ خدا کی طرف سے جو کچھ اُن کو ہدایت پہنچی وہی سُنادی اور اپنے کلام و ہدایت میں خدا ہی کو مقدم رکھا اور اپنی ذاتی تعظیم و تکریم کی طرف اشارہ تک نہ کیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ خدا پرستی کے ساتھ نبی پرستی بھی واقع ہو۔ اُن کی ہدایت میں صاف صاف خدا نظر آتا ہے۔ نبی کی ذات نظر نہیں آتی اور نہ ہی وہ اپنی اطاعت مومنوں سے طلب کرتا ہے۔ بلکہ یہہ تاکید کی جاتی ہے کہ خداوند یوں فرماتا ہے۔ سنت نبوی کی طرح اہل یہود ہرگز یہہ نہیں کہتے کہ ہم سنت ابراہیمی یا سنت داؤدی یا سنت موسوی کے پیرو ہیں۔ یہی صورت مسیح کے رسولوں کی بھی نظر آتی ہے۔ وہ بھی اپنی اطاعت طلب نہیں فرماتے بلکہ انہوں نے اپنی اطاعت کو منع فرمایا ہے اور مسیح خداوند کو مقدم رکھا ہے۔ جو گواہی یوحنا نے مسیح کے حق میں دی اُس پر سب کا عمل ہے۔ یہہ کہ میں گھٹوں اور وہ بڑھے۔ مگر محمد صاحب کی نبوت اور رسالت نے استثنائی صورت اختیار کی ہوئی ہے حتٰی کہ خدا کی ذات پر تصرف کیا ہے +

محمد صاحب کی سرگذشت سے صاف صاف عیاں ہے کہ پہلے پہل جب وہ مکہ میں تھے انہوں نے اپنی رسالت پر مطلق زور نہیں دیا بلکہ بت پرستی کی تردید اور خدا تعالٰی کی وحدانیت کے خیالات میں مصروف رہے (دیکھو سورۂ نحل اور سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح وغیرہ) ابتدا میں وہ اپنے آپ کو نذیر اور مبشر

اور ڈر سنانے والا وغیرہ ناموں سے یاد فرماتے رہے مگر مدنی سورتوں میں زیادہ تر
رسالت کا دم مارا ہی۔ جب ایک سالار قوم کی حیثیت میں آنحضرت کی طاقت
قائم ہوگئی تب اپنی فوقیت کا دعوی کیا (دیکھو سورہ نور کا ۹ واں رکوع) اب اس
قسم کے فقرات بھی نازل ہونے لگے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول
کی۔ حتی کہ وہ اوصاف جو قرآن کے اور مقامات میں خدا کے لئے مخصوص ہیں
ان کو اپنی طرف بھی منسوب کیا۔ چنانچہ یوں ارشاد ہی کہ اٰمِنُوا باللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
وَالنُّوْرِ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مشتاق ہیں ان کو عالم
آخرت میں اجرِ عظیم کا وعدہ دیا گیا ہی چنانچہ سورہ احزاب کی ۲۹ ویں آیت میں
مرقوم ہی کہ ان کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار ہی۔ جو لوگ اللہ اور اس کے
رسول کو ستاتے ہیں ان کو ہر دو جہان میں لعنت و پھٹکار ہی وغیرہ وغیرہ دیکھو کتاب
کشف القرآن از صفحہ ۱۹ تا آخر۔ جب محمد صاحب نے خود اپنی اطاعت پر زور
دیا تو کچھ عجب نہیں کہ ان کے اصحاب اور مقلدین کی نظروں میں محمد صاحب
کی عظمت اس درجہ تک پہنچی کہ محمد صاحب کے اعمال قبیحہ بھی خصائص حسنہ
سمجھ کر محامد قرار دئے گئے اور سنت میں داخل کئے گئے خلیفہ عمر نے سنگِ
اسود کو پتھر جان کر بھی باوجودیکہ دل نہ چاہا کہ پتھر کے آگے ساجد ہو کر اسکو چومے
مگر سنت نبوی کے اتباع نے اس پتھر کے چومنے کے لئے اسکو مجبور کیا چنانچہ
خلیفہ عمر نے اس فعل سے اپنی کانشنس کی صحیح اور واجب تحریک کو دبا لیا اور
محمد صاحب کی اطاعت کو مقدم سمجھا۔ ذرا اس کے کلام پر غور کیا جاوے بخدا

میں جانتا ہوں کہ تو محض پتھر ہی نہ نفع پہنچا سکتا ہی نہ نقصان۔ اگر مجھے یہہ معلوم نہ ہوتا کہ نبی نے تجھہ کو بوسہ دیا ہی تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا۔ صرف اس سبب سے کہ نبی نے ایسا کیا ہی میں بھی ایسا کرتا ہوں۔ ان کلمات سے صاف مترشح ہی کہ پتھر کی تعظیم بجالانا خلیفہ عمر کے دل میں نہایت ہی شاق اور ناگوار گذرتا تھا بلکہ ایک قسم کی کراہیت اُس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اُس کی ضمیر نے صاف صاف اس فعل کے ارتکاب سے باز رکھنے کے لئے اس کو تحریک دی مگر اُس نے نبی کی اطاعت کو گو نفس قلبی اس کے مخالف تھا مقدم سمجھا +

تواریخاً دیکھا جاتا ہی کہ ہر ایک زمانہ کے مسلمانوں کی افراط محمد صاحب کی تعظیم میں قریب بت پرستی کے پہنچی ہوئی ہی۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے ہی بعض ایسے فرقے اسکی مخالفت میں اُٹھہ کھڑے ہوئے ہیں جن کے دل ایک مخلوق کی بیجا تعظیم و تکریم سے متنفر ہوکر اور شرک سمجھہ کر خدا کی طرف رجوع ہوئے پر افسوس عرفان خدا کی کوئی صحیح صحیح حقیقت قرآن میں نہ پاکر اُنہوں نے تصور سے کام لیا اور اس لئے بطالت میں مبتلا ہوئے۔ چنانچہ ایک فارسی شاعر کہتا ہی کہ میں نے تمام مذاہب کی جستجو کی اور اسلام نے بھی مجھہ کو کوئی تسکین نہیں دی اور جب کہیں بھی محبوب نظر نہ آیا اور الوہیت کا کچھہ پتا نہ قلم اور نہ لوح محفوظ نے دیا تو پھر میں نے اپنے ہی باطن پر نگاہ کی اور دیکھو اپنے ہی سینہ کے اندر اُسے پایا اِس قسم کے لوگوں کے اول فرقہ کا عقیدہ تصوف ہی۔ جس میں قرآن کے اوامر

دنیاوی اور شرع کی سخت پابندیوں سے آزاد ہونا مقصود ہی اور انسان کو الہی ذات سے قربت حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا گیا ہی یا اُس میں فنا فی اللہ ہو جانا ملحوظ ہی۔ گو تصوف کا عقیدہ ہمہ اوست ہی مگر اس فرقہ کا قائم ہونا اول تو اس بات پر شاہد ہی کہ انسان طبعاً خدا کی نزدیکی چاہتا ہی اور دوم یہہ کہ مسلمان عموماً محمد صاحب کی اطاعت پر قائم ہیں اور خدا نام ہی نام کو اُن کے زبان زد ہی چنانچہ ایک مولوی ثنا اللہ صاحب امرتسری جو اسی فرقہ کے دلدادہ ہیں ایک اپنے درس میں جو اُنھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور میں دربارہ تہذیب و شائستگی دیا فرماتے ہیں "کہ یہہ بڑا ضروری امر ہی کہ ہم اپنے کلمہ طیبہ کے دو حصوں لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کو الگ الگ سمجھیں" اس سے ثابت ہوتا ہی کہ عموماً مسلمانوں میں یہہ دونوں حصے الگ نہیں سمجھے جاتے۔ پھر فرماتے ہیں "کہ مگر سمجھے تو کون ؟ عوام الناس کو تو تاش اور شطرنج سے ہی فرصت نہیں۔ پڑھے لکھوں کو سول اور پابو نیر سے فرصت کہاں ؟ وغیرہ" مولوی صاحب نے اصلی وجہ کو دبا رکھا اور ظاہر کرنا مصلحت نہ سمجھا کہ درحقیقت مسلمانوں کے دلوں میں فقط محمد صاحب ہی کی عظمت قائم ہی اور کلمہ لا الہ الا اللہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور صرف ایک تسبیح کا وظیفہ ہی گو صوفیوں کے حق میں بڑے فخر سے کہا جاتا ہی کہ وہ وحدۃ الشہود ہیں مگر صوفی خود محمد صاحب کی طرف ایسے اقوال منسوب کرتے ہیں جو اُن کے اپنے رویہ کے خلاف ہیں۔ وہ بھی اپنے پیشوا اور ملجا و ماوا کو رب الارباب سمجھے بیٹھے ہیں اور یہہ کہتے ہیں کہ یا محمد

انت عرب بلا عین اور احمد بلا میم اور اسے حدیث قدسی بتلاتے ہیں جو سینہ بہ سینہ خاصانِ خدا کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ دوسرا فرقہ جس نے ایک اپنا جدا مسلک جاری کیا وہ وہابیوں کا ہے۔ اس نے بھی جب دیکھا کہ محمد صاحب کی عظمت کے علاوہ لوگ اُن سے شفاعت کی امید رکھتے ہیں اور ولیوں سے مرادیں مانگتے ہیں اور حجاج نبی کی قبر اور علی کی زیارت اور ولیوں کو پوجتے اور ان کے مزاروں کا طواف کرتے ہیں اور خالق کے ساتھ مخلوق کی تعظیم بھی شامل کی جاتی ہے تو فتویٰ شرک کا دیا۔ اور اپنے فرقہ مواحد کے علاوہ باقی مسلمانوں کو مشرک کہتے ہیں۔ وہ خاصکر چار قسم کے شرک مانتے ہیں۔ شرک العلم۔ شرک التصرف۔ شرک العبادت اور شرک العادت ان کے مطابق ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہلِ اسلام کس حد تک شرک میں مبتلا ہیں حقیقت میں محمد صاحب کو وہ رتبہ اور منصب حاصل ہے جو خدا کی قدرت پر تصرف کرتا ہے اور انسان کی عبادت کا وہ حصہ تعظیمی جو خدا کو ہی زیبا اور موزوں ہے ایک مخلوق کو دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مسلمان کے نزدیک نہ صرف قرآن کی پیروی کرنا فرض ہے بلکہ محمد صاحب کی اطاعت کرنا بھی لازم و واجب ہے۔ کیونکہ نبی کی محبت کا اقرار کرنا الوہیت کی شہادت دینا ہے (دیکھو مدارج النبوت) مگر مواحدوں یا وہابیوں نے بھی توحید کو ایسا سخت پکڑا ہے کہ گویا وہی نفسِ حقیقت ہے اور اگر ہم وہابیوں کے اصولِ توحید کو ہمہ اوست سے تعبیر نہ بھی کریں تو بھی وہابیوں کی توحید کی صورت تھی ایزم نہیں ہے بلکہ ڈی ایزم رہجاتی ہے یعنے ایسا خدا باقی رہجاتا ہے جس کا مخلوقات سے کوئی تعلق و سروکار نہیں ہے +

یہہ غور کرنے والی بات ہی کہ اتباع قرآنی سے مومنین یا تو محمد صاحب کو مقدم کرتے ہیں اور خدا کو مؤخر اور یا خدا کو مقدم کرتے کرتے خود آپ ہی اُس میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ اپنی ذات کا کچھ پتا ہی نہیں رہتا اور یا خدا کے وجود کو مخلوقات سے ایسا علحدہ کر دیتے ہیں کہ گویا مخلوقات سے اُسکا کچھ بھی تعلق نہیں ہی اور یا خدا کو اُس انسانی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے محمد صاحب نے خود دیکھا +

پھر قرآنِ عربی کا خود وہ منصب ہی کہ اُس کے بجائے اُس کا ترجمہ قرآن متصور ہی نہیں ہوتا ہی۔ نماز ترجموں کے مطابق نہ صرف غیر واجب بلکہ حرام قرار دی گئی ہی۔ اِنَّآ اَنزَلنَاہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا۔ تمام علما متقدمین کی یہی ہدایت ہی کہ نماز قرآن عربی کے مطابق ہونی چاہئے۔ ہزار ہا جہلا مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں جو دعائے قنوت اور رکوع اور سجود وغیرہ کو بغیر سمجھے عربی عبارت میں حفظ کر کے پڑھتے ہیں اور اپنا پڑھنا ثواب میں داخل سمجھتے ہیں۔ وضو کئے بغیر قرآن پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ لفظ پرستی قرآن پرستی متصور ہی۔ خدا پرست تو خود غرضی اور حرص و آز کو شستہ کرتا ہی اور اپنی دعا میں بلکہ ہر ایک معاملہ میں خدا کی رضا ڈھونڈھتا ہی مگر لفظ پرست خود پرستی کا شکار بنتا ہی۔ قرآنی استغفار کے کلمہ کے استعمال سے شیطان کو کوسوں بھگاتا ہی مگر خدا کی درگاہ میں حقیقی تائب اور نادم ہونا نہیں جانتا۔ چنانچہ محمد صاحب خود بھی ایام مکہ میں سحری تاثیر کے ضرر سے بچنے کے لئے بعض سورتیں پڑھا کرتے تھے (دیکھو سورہ فلق اور سورۂ الناس جن کو سورۂ المعوذتین بھی کہتے ہیں اور جو تعویذ کے طور پر کسی چیز پر لکھ کر ہمیشہ سے مسلمان

پہنتے چلے آئے ہیں) اسی طور پر بہت سے درود اور وظائف اور کئی قسم کے اعمال و افعال کی نسبت حدیثوں میں لکھا ہے کہ فلانے حکم بجا لانے سے اور فلانی آیت پڑھنے سے انسان کے بیشمار گناہ معاف ہوتے ہیں اگرچہ سمندر کے جھاگوں کے برابر بھی شمار میں ہوں۔ یہی حال ملاؤں کا ہے جو کہ متن۔ شرحیں۔ اور حواشی پڑھتے پڑھاتے ہیں اور لغت عربی کے سیکھنے سکھانے میں تمام عمر اُن کی صرف ہوتی ہے۔ اگر کسی عام نمازی سے پوچھا جاوے کہ یہہ جو تو پنج وقتی نماز مقررہ کو ادا کرتا ہے اُس کا مطلب بھی سمجھتا ہے؟ تو اُس کا جواب یہہ ہوتا ہے کہ نماز کا پڑھنا ہی کا حکم ہے اور ثواب میں داخل ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ عام مسلمانوں کو نہ تو اپنا ہی صحیح عرفان ہے کیونکہ وہ گناہ کی حقیقت سے بے خبر رہکر گناہ کے مقابلہ میں نیکیوں کا ایک ذخیرہ بٹورتے ہیں اور نہ ہی خدا کا عرفان ان کو حاصل ہے کیونکہ اطاعتِ رسول اُن کے لئے سب کچھہ ہے۔ جو لوگ محمد صاحب کو ہر قول و فعل میں اپنا ملجا اور پیشوا مانتے ہیں اُن کو خدا کی قربت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی وہ اُس کے جویاں رہتے ہیں۔ خدا کی شہادت دینا صرف زبانی جمع خرچ رہجاتا ہے اور مطابق حکم قرآن بھی داخل ثواب ہے۔ مگر اپنی تقلید کے لئے مسلمان سنّت نبوی کو اپنے سامنے ہمیشہ رکھتا ہے اور نتیجہ یہہ ہوا ہے کہ وہ خدا کے حقیقی عرفان سے بہت دور جا گرا ہے۔ محمد صاحب کی عدم موجودگی میں نہ صرف اُن کی سُنّت کو زندہ کیا جاتا ہے بلکہ حج کرنا۔ قبر کی زیارت کرنا۔ درود و فاتحہ پڑھنا سفر میں نحس و سعد کو ماننا وغیرہ عمل میں آتا ہے۔

اگر محمد صاحب کی سرگذشت کی طرف خیال کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی تلاش کرتے کرتے رفتہ رفتہ خدا کی وحدانیت کی شہادت دینے لگے اور پھر خدا کی اطاعت کے ساتھ اپنی اطاعت کو بھی واجب قرار دیا۔ ابتدائی سورتوں میں وہ ایک متلاشی دین کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ زمانہ فاطر میں آنحضرت کی حالت نہایت تذبذب کی تھی اور مرسلانہ بلاہٹ کی نسبت بہت سے شکوک دل میں پیدا ہو گئے تھے قبیلہ قریش کے لوگ تو اُن کو ایک دیوانہ سمجھتے تھے اور اس زمانہ میں وہ صرف نصیحت اور وعظ اور قیامت کا ذکر اذکار کرتے رہے۔ ایسی حالت میں امید ہو سکتی تھی کہ وہ انسان جو سچائی کا طالب ہوتا ہے خدا سے ہدایت حاصل کرے اور جیسا سورہ فاتحہ میں بھی مرقوم ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ وہ اُس کو دریافت کرکے حاصل کر سکے مگر دیکھا جاتا ہے کہ تلاش دین کے علاوہ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو وہ جتایا جو حقیقت میں نہ تھے۔ بار بار قوم قریش اور اہل یہود نے اُن سے کوئی نشانی طلب کی جو انبیاء سابقین برابر سلسلہ وار اپنے کلام کی تصدیق میں دکھاتے چلے آئے تھے۔ مگر وہ کوئی نہ کوئی طرح دیکر اُن سے اپنا پیچھا چھڑاتے رہے لیکن اپنے کلام کو خدا کی طرف سے الہام تصور کرتے رہے۔ حقیقت میں جیسا سرسید احمد خان صاحب نے اپنی کتاب تہذیب الاخلاق جلد اوّل میں قرآن کے مفہوم میں بیان کیا ہے "کہ عقل انسانی کے سوائے کوئی اور رہنما نہیں ہے اور کہ علم یا یقین یا ایمان کا مدار صرف عقل ہی پر رہتا ہے" یعنے نبوت کا منبع اور چشمہ فقط نور فطرت ہے۔ یہہ قول اُن کا محمد صاحب کی نسبت صحیح ثابت ہوتا ہے ابتدائی

سورتوں کے مطالعہ سے یہہ ظاہر ہوتا ہی کہ وہ اپنی جودت عقل اور زود فہمی اور فراست اور خوش بیانی کو ہی رفتہ رفتہ وہ درجہ دبنے لگ جاتے ہیں جو نبی برحق کا حصہ ہی اور جوں جوں اُن کے پیروؤں کی تعداد بڑھنے لگتی ہی وہ نبی کے علاوہ اپنے آپ کو رسول اور حاکم جتانے لگتے ہیں۔ کہاں تو پہلے ہدایت اور روشنی کے خواہاں ہوتے اور صلح اور امن کی منادی کرتے اور بعد میں پہلے مصلحت اور حکمت عملی کو کام میں لاتے تھے اور کہاں پھر جہاد اور اکراہ جائز کیا جاتا ہی۔ کہاں پہلے خدا کا نام یاد کیا جاتا ہی اور بعد میں اپنے احکام خدا کے نام سے جاری کئے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ نہ صرف اپنے آپ کو نبی اور بندہ خدا منواتے بلکہ رسول یعنے خدا اور انسان کے درمیان ایلچی۔ سورہ نصر سے ظاہر ہوتا ہی کہ کس درجہ تک وہ اپنے اختیارات کو وسیع کر دیتے ہیں۔ کہاں پہلے مبشر اور نذیر وغیرہ اور پھر طمع اور حرص حکومت اور ملکی حرص وہوا اُن کو قاہر اور جبار بناتی ہی۔ کہاں مکہ میں ایک واعظ اور ناصح کی حیثیت میں اور کہاں مدینہ میں واضع قوانین اور جنگی سپہ سالار بن جاتے ہیں۔ کہاں لا اکراہ فی الدین کی تعلیم اور نذیر وڈر سنانے والا اور کہاں حرب وضرب کا نعرہ بلند کر کے بحیثیت حاکم یہہ کہنا

کہ اطاعت اللہ اور رسول کی۔ خوشنودی اللہ اور رسول کی وغیرہ۔ اُن سورتوں کو دیکھ لیویں جو مکہ میں لکھی گئیں اُن میں محمد صاحب قوم قریش کی طرف مخاطب ہوتے ہیں اور اُن کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں مگر کچھ پیش نہیں جاتی اور اس لئے مجبوراً نرمی اور صبر کو کام میں لاتے ہیں۔ پھر اُن کو اپنے مقلد بنانے

کے واسطے غیر واجب وسائل قرین مصلحت سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہہ سب مسلمانوں پر آشکارا ہی کہ محمد صاحب نے بسبب اپنی نفسانیت یعنے باغوائے شیطان قرآن کی آیت کی تحریف کی یعنے واسطے تالیف قلوب بت پرستوں مکہ کے ایک آیت بتوں کی تعریف میں پڑھ دی اور پھر اُسکو منسوخ کیا۔

اس سے یہہ صاف نظر آتا ہی کہ قرآنی مذہب اصول ٹیلٹی پر مبنی ہی یعنے خودغرضی۔ زمانہ سازی حکمت عملی و مصلحت قرآنی تعلیم کا لب لباب ہیں۔ قرآنی تعلیم نہ تو خدا کی راستبازی اور قدوسی کی پابند ہی اور نہ ہی کوئی ایسا روحانی انجام و مقصد مدِنظر رکھتی ہی جس کو زوال نہیں ہوگا اُس کو مکانی مذہب کہنا چاہیئے۔ قرآن کی آیتیں حسب موقع اور حسب الضرورت نازل ہوکر محمد صاحب کی اغراض اور مقاصد کو پورا کرتی رہی ہیں۔ ایّام مکہ میں جب آپ اوصافِ الٰہی اور صفات ایزدی وغیرہ کا اظہار کرتے رہے تو اُس وقت ابوبکر اور آپ کے چچا ابوطالب اور چند اور پیرو جو کہ مکہ میں زبردست خاندان سے علاقہ رکھتے تھے اُن کے زیرِ حمایت ہوکر ہر طرح کے خطرہ سے محفوظ تھے مگر عرب کے ادنیٰ قبائل کے لوگ جو آنحضرت پر ایمان لائے تھے وہ ایذا رسانی سے ہرگز محفوظ نہ تھے۔ اُن میں سے ایک شخص عمر نامی کا ذکر ہی کہ اُس نے رو کر بیان کیا کہ یارسول اللہ اگر میں آپ کی توہین اور اُن کے معبودوں کی تعریف و توصیف نہ کروں تو میری رہائی ناممکن ہی۔ اُس وقت حضرت نے دروغ مصلحت آمیز کی تعلیم سکھائی یعنے اُسے فرمایا کہ اگر تیرا دل قائم ہی تو کچھ مضائقہ نہیں بیشک ظاہری طور پر انکار کردے بلکہ

قرآن میں اُن لوگوں کی نسبت جن سے کفار زبردستی اسلام کا انکار کرواتے تھے یوں ارشاد ہی کہ جس شخص نے ایمان لانے کے بعد خدا کا انکار کیا جبکہ اُسکو زبردستی مجبور کیا گیا اور دل میں ایمان پر قائم رہا تو اُس کا کچھ گُناہ نہیں ہی (دیکھو سورۂ نحل رکوع ۱۴) *

اِسی طرح جب قبیلۂ قریش کے لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے تھے تو زجر اور عتاب کی سورتوں اور اپنے دعاوی کو للکار کر پیش کرتے تھے تاکہ اپنا رعب داب لوگوں پر جما دیں اور جب اس سے بھی کام نہ چلا بلکہ مکّہ والے اُن کو شاعر اور فالگیر اور آسیب زدہ ناموں سے پکارنے لگے تو پھر قسموں اور لعنتوں اور کوسنے پر زور دیا اور منجملہ ان کے پھر آپ انسانی طبیعت کے حیوانی و شہوانی پہلو کی طرف مائل ہوتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی حیلہ سے اسلام کی طرف انسان کو ترغیب و تحریص ہو۔ پھر تو عروسی پلنگوں مشک و کستوری اور شراب طہور کا نقشہ شاعرانہ لباس میں کھینچکر دکھایا جاتا ہی اور دوزخ کے عذاب کا بھی نقشہ اُن الفاظ میں رنگا ہی کہ جس سے خواہ مخواہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر طرفہ یہہ ہی کہ بعد کی سورتوں میں بہشت کا موجودہ نقشہ نہیں کھینچا جاتا ہی بلکہ حور و غلمان جو موں کے پیرایہ سے بدل کر منکوحہ بیویوں کی حیثیت میں بیان کیے جاتے ہیں جس کی وجہ خصوصاً یہہ ہوسکتی ہی کہ اب اُن کا سابقہ اہلِ یہود کے ساتھہ پڑا جن کے اخلاق نے اُن کے دِل میں بہت کچھہ نیک اثر پیدا کیا۔ مثلاً پہلے مکّی سورتوں سے سورۂ النبا۔ سورۃ الواقعہ اور سورۃ الصافات وغیرہ ملاحظہ کیجاویں اور بعد میں

مقابلہ کے لیئے مدنی سورتیں سورۂ بقرہ سورۂ نساء وغیرہ ملاحظہ کی جاویں اسی طرح
اوایل میں آنحضرت کتب مقدسہ کی تصدیق کرتے رہے اور اہل یہود کی طرفداری
بھی۔ آپ نے یروشلم کی طرف منہہ کرکے نماز پڑھنی شروع کردی اور اپنے انصار
اور مہاجرین کو عیدِ کفارہ میں روزہ رکھنے کا حکم دیدیا اور سورۂ بقر میں یوں ارشاد
ہوا کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہود ہوئے اور نصارا اور صائبین جو کوئی
یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کئے نیک تو اُن کو ہی اُن کی مزدوری اپنے
رب کے پاس اور نہ اُن کو ڈر ہی اور نہ وہ غم کھاویں +

اس قسم کی کارروائیوں کو یا تو زمانہ سازی سے تعبیر کیا جاوے اور یا یہہ سمجھا
جاوے کہ محمد صاحب ابھی تک ایک متلاشی دین کی حیثیت میں تھے۔ مگر دیکھا
جاتا ہی کہ بعد میں اسلام کو فوقیت دی جانے لگی اور اسلامی سورتوں میں نہ صرف
منافقوں کو ہی پھٹکارا جاتا ہی بلکہ منکروں کو بھی لعنت کی جاتی ہی۔ چنانچہ سورۂ بقر
کے گیارھویں رکوع میں مرقوم ہی۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ یعنے لعنت ہی
اللہ کی منکروں پر۔ پہلے توراۃ ہدایت و نور کرکے بیان کی گئی ہی محمد صاحب اپنے
آپ کو کتب مقدسہ کا مصدق جتاتے رہے اور قرآن توراۃ اور انجیل کا محافظ
بیان کیا گیا ہی مگر بعد میں بحیثیت فاتح اور حاکم اسلام کی ایک نئی صورت بنائی
جاتی ہی حتّٰی کہ قبلہ بھی بدلا جاتا ہی اور روزوں کا مہینہ بھی۔ اور منجملہ ان کے اہل یہود
قرآن میں نہ صرف کوسے جانے بلکہ اُن پر تشدد کیا جاتا اور یہاں تک تغیر و تبدل شروع
ہوا کہ یہودیت سے بالکل مشابہت اُٹھ گئی دیکھو کتاب کشف القرآن جانسن صفحہ ۱۱۴

اِسی طرح پر پہلے صلح و امن کی تعلیم دیجاتی پھر لڑائی کی طرف اشتعال دیا جاتا ہی اور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے شروع کر کے محاربہ و مقاتلہ جاری کیا جاتا ہی حتّٰی کہ جہاد کا قیامت تک یا ایّام مہدی کے آنے تک جاری رہنا بیان کیا جاتا ہی۔ خواہ کسی پہلو سے محمد صاحب کے حالاتِ زندگی پر غور کیا جاوے ہم کو مصلحت اور زمانہ سازی نظر آتی ہی۔ آگے چلکر ہمارے بیان کی زیادہ وضاحت اور صراحت ہوگی +

چونکہ سنت نبوی کا اتباع ہر ایک مسلمان پر فرض ہی لہذا اہم بیہ دیکھیں کہ آیا محمد صاحب کا کیرکٹر تقلید کے لائق ہی یا نہیں۔ ہم نے انسانی پہلو الہام میں بیہ کہا تھا کہ انسان کی ہدایت کے لئے بیہ ضروری ہی کہ وہ اپنی موجودہ اصلی حقیقت سے بہرہ اندوز ہو اور کہ وہ خدا کے سامنے مناسب حال پہلو اختیار کرے اور اپنی اُس اصلی حالت سے بھی آشنائی حاصل کرے جس میں وہ قائم نہ رہا تاکہ عصمت کی راہ سے وہ اپنی تقلید کے لئے ایک کامل معیار یا قبلہ گاہ مدِنظر رکھے محمد صاحب کے حالاتِ زندگی سے نہ تو ہم کو اُس حالت میں جبکہ اُن سے گناہ و قصور سرزد ہوئے ایک حقیقی تائب نظر آتا ہی اور نہ بیہ ظاہر ہوتا ہی کہ اُنہوں نے کبھی بھی گناہ کی حقیقت کو دریافت کیا اور مناسب حال پہلو خدا کے سامنے اختیار کیا اور نہ ہی اُن کی زندگی میں کوئی ایسا معیار نظر آتا ہی جو تقلید کے لائق منصور ہوسکے پہلے تو بیہ دیکھا جاتا ہی کہ محمد صاحب جب ایک سید البشر یا سرور کائنات و سید الانام و خیر البریہ وغیرہ القاب سے ملقب کئے جاتے ہیں علاوہ

ازیں اُن کے حالاتِ زندگی سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے خود بہت سے حقوق اپنی ذات کے لئے مخصوص کرائے۔ قرآنی احکام دربارہ نکاح کی قید سے تجاوز فرمایا اور ہبہ نفس اور بے مہر نکاح بھی اپنے اوپر جائز ٹھہرایا تو اس میں کچھ شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ وہ کچھ ایسے ہی منصور تھے۔ پس اول یہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد صاحب قہراً یا مجبوراً ایک سردار مخلوق کے طور پر ہماری تعظیم و تکریم کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ اہلِ بصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تقلید کرنا جو مالکیتاً ایک سردار مخلوق پیدا کیا گیا ہے بادر ابشت بیہودن ہے کیونکہ وہاں تک کسی بشر کی رسائی ہی مشکل ہے اور نہ ہی ایسے شخص کی تقلید کسی اہلِ نظر کے آگے مفید مطلب ہو سکتی ہے کیونکہ جو ہم سے اعلیٰ ہے اور ہمارا سا ہم جنس انسان ہی نہیں اُس کی تقلید کرنا کچھ معنے نہیں رکھتا ہے۔ پھر جب یہہ مانا جاتا ہے کہ قرآن کے لکھنے میں محمد صاحب کا کچھ بھی دخل نہ تھا بلکہ وحیٔ باطن کے محمد صاحب وحیٔ ظاہر تھے جیسا اُن کو سنایا گیا ویسا ہی لفظ بلفظ محمد صاحب نے اپنی امت کو سنا دیا تو اس صورت میں بھی تقلید محمد کے کیا معنے ہیں؟ قرآن تو لوحِ محفوظ میں ازل سے موجود تھا جو جزءً جزءً محمد صاحب پر نازل ہوا تو پھر محمد صاحب کا قرآن سے کیا علاقہ ہے؟ قرآن تو بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ اور دیکھو سورہ عبس تیرھویں و چودھویں آیات جب قرآن میں الہام کا الٰہی پہلو منصور ہے مگر انسانی پہلو کا اُس میں کچھ بھی دخل نہیں ہے تو پھر محمد صاحب کی تقلید کیوں واجب تصور کی گئی ہے جبکہ اُن کا ہونا اور نہ ہونا الہام کے متعلق

یکساں ہی؟ اگر یہہ سمجھا جاوے کہ محمد صاحب نے خود اپنی ذات میں قرآن کی ہدایات کا پورا
نمونہ دکھایا اِس لئے اُن کی سنت کی تقلید واجب ہی یا وہ مرشدِ کامل ہیں تو
ہم کہتے ہیں کہ اِس صورت میں قرآن ایک معیار ہی نہ محمد صاحب کی زندگی۔ مگر
چونکہ سنّت نبوی کا درجہ مسلمانوں کے نزدیک نہایت ہی اعلیٰ ہی اِس لئے ہم
محمد صاحب کے اعمال اور قرآن کی ہدایات دونوں میں سے کچھہ مشتِ نمونہ از
خروارے لیکر اُن کو پرکھینگے تا دیکھیں کہ آیا قرآن کی تعلیم اور محمد صاحب کے
نمونۂ زندگی نے وہ درجہ اختیار کیا ہوا ہی جسکو اکمل کہنا چاہئے یا نہیں؟ بطور
نمونہ قرآن کی تعلیم اور محمد صاحب کا اُس پر عمل دونوں کو دیکھا جاوے کہ کہاں
تک محمد صاحب نے ایسا نمونہ تعلیم کا ہم کو دکھایا کہ جسکی تقلید داخل ثواب سمجھی
جاوے مگر یہہ یاد رہے کہ ہم انسانی ترقی کے قاعدوں کو بھی ساتھہ
ملحوظ رکھیں گے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان کامل نہیں ہی بلکہ اُس میں ایسی
فطرت موجود ہی جو مرتبہ امکان کامل بننے کا رکھتی ہی۔ قرآن کی ابتدائی تعلیم
یعنے وہ تعلیم جو محمد صاحب کو شروع نبوت میں ہوئی یہہ تھی کہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ
یعنے دین میں زبردستی نہیں۔ اور پھر وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا
یعنے ہم نے تجھہ کو صرف خوشخبری دینے اور عذاب سے ڈرانے کے لئے بھیجا ہی اور
پھر تیرا کام پیغام پہنچا دینا ہی اور ہمارا کام حساب لینا ہی۔ پھر سورۂ رعد آیت ۸
اور سورۂ عنکبوت آیت ۴۹ ملاحظہ فرمائیں پھر یوں مرقوم ہی کہ زبردستی کرنا ایمان
کے بارہ میں تیرے لئے ناجائز ہی اور اِس لئے کہنا ہی کہ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا

یعنے ہم نے تجھ کو اُن پر نگہبان نہیں مقرر کیا اور پھر کہتا ہے۔ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ اور تو اُن پر مختار نہیں ۔

پس خدا اپنے نبی کو بتاتا ہے کہ خوشخبری دے اور ڈر سنا دے وغیرہ یہہ مذکورہ بالا آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔ اب مدینہ والی آیات جو عین آیات مذکورہ کے ردّ میں ہیں ملاحظہ فرمائی جاویں۔ چنانچہ مرقوم ہے کہ قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ۔ ترجمہ لڑو اُن سے جہانتک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ پھر سورۂ توبہ پانچویں آیت۔ جب گذر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ۔ پھر ۲۸ ویں آیت اور العمران کی ۱۸ ویں آیت دیکھیں۔ جب محمد صاحب مکہ میں تھے اُس وقت بہت تھوڑے لوگوں نے محمد صاحب کی دعوتِ اسلام کو قبول کیا اُن کی حالت اُس وقت مجبوراً عجز و انکسار کی تھی وہ اُس وقت مکہ والوں پر دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے مگر دل چاہتا تھا کہ اگر کوئی صورت نکل آوے تو اُن کو ایذا دیں۔ دھمکی دینا۔ پھٹکارنا۔ کوسنا۔ دوزخ کا ہولناک نقشہ کھینچکر دکھلانا یہہ سب تدبیریں کام میں لاتے مگر کوئی پیش نہ جاتی تھی اِس لئے اُن کو یہہ ہدایت ہوتی ہے کہ جبر کرنا تیرا کام نہیں ہے بلکہ حلم اور بردباری سے کام لے۔ اب ہم یہہ دکھانا چاہتے ہیں کہ بمطابق منشاء مذکورہ بالا آیات مکہ محمد صاحب کا عمل پرکھنے کے لئے وہ عین کسوٹی ہیں محمد صاحب کو ہدایت ہوتی ہے کہ تو صرف مبشر اور نذیر ہے۔ دین کے معاملہ میں زبردستی ناجائز ہے۔ دعوتِ اسلام کو قبول نہ کرنے والوں پر جبر اور تشدد ناجائز ہے۔ مخالفوں کو

صدقہ نہ دینا نا واجب ہی اور چونکہ تو مبشر اور نذیر ہی تو مخالفوں کے ساتھہ احسان
اور مہربانی سے پیش آ۔ یاد رکھہ کہ جبر سے ایمان لانے سے انسان سے خود مختاری
جاتی رہتی ہی اور ثواب جو دین کی اصل مدعا ہی زائل ہو جاتا ہی۔ اب ایسی عمدہ
ہدایت کے مطابق یہہ ضروری تھا کہ محمد صاحب ہمارے سامنے ایک ایسا نمونہ
احسان اور مہربانی اور حلم اور بردباری اور صبر کا دکھاتے جو ہر ایک کے لئے
تقلید کے لائق ہوتا۔ مگر اِس کے برعکس ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ محمد صاحب ان آیات
کے مطابق اُس وقت تک چلتے رہے جب تک وہ عاجز اور لاچار تھے لیکن جب
ہجرت کے بعد اُن کو اقبال حاصل ہوا اور بڑے بڑے جنگی لوگ اُن کے ساتھی
ہو گئے اور انصار کے نام سے کہلائے اور مختلف ایسے عہد باندھہ کر جو کہ ملکی امور
اور امور سیاست سے علاقہ رکھتے تھے محمد صاحب کے حوصلہ کو بڑھایا تو تواضع
اور حلم اور بردباری سب کافور ہو گئے حتّٰی کہ تبلیغ اور انذار کے کام کو چھوڑ کر لڑائی
اور غارتگری کا طریق اختیار کیا۔ نذیر اور مبشر سے بدل کر قاہر اور جبّار بن گئے۔
اقبالمندی تو اُن کے لئے ایک امتحان کی صورت تھی جس میں اُن کو مکّہ والی آیتوں
کی منشا کے مطابق ثابت قدم رہنا چاہئے تھا نہ رہے بلکہ جبرائیل اُن کی منشا کے
مطابق آیات اسلام کی جگہ آیات قتال نازل کرتا رہا۔ کہاں لا اکراہ فی الدین
اور کہاں قاتلوھم حتّٰی لا یکون فتنۃ ویکون الدین للہ۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا +

باوجودیکہ محمد صاحب کو صلح اور امن پر کاربند ہونے کا خاصہ موقع اُن کی

اقبالمندی کی حالت میں ملا مگر وہ اس پر کاربند نہیں ہوئے۔ جب مسیح کی زندگی کی طرف دیکھا جاتا ہی تو ایک قسم کی حیرت دل میں پیدا ہوتی ہی کہ باوجودیکہ وہ ایک با اختیار شخص تھا اور اُس کے معجزوں سے اُس کی قدرت اور بزرگی عیاں تھی مگر طرفہ ماجرا ہی کہ اُس قدرت کو اُس نے اوروں کی خاطر استعمال کیا پر اپنے ذاتی فائدہ کے لئے نہیں۔ وہ لوگوں سے اِس طرح ملتا جلتا تھا کہ گویا وہ ایک اُنہیں میں سے تھا۔ اُن کے دکھوں کو رفع کرتا رہا۔ ایک دوسرے کو پیار کرنے کی تعلیم دیتا۔ کمال صبر اور استقلال کے ساتھ لوگوں کی طعن و تشنیع اور مخالفت کی برداشت کرتا رہا اور جب اُس کے مخالف زیادہ تند مزاج ہوتے گئے اور تشدد سے پیش آنے لگے تب بھی اُن کی برداشت کرتا رہا اور جب اُس کو صلیب دینے کے لئے پکڑا اور اُس کے شاگردوں میں سے ایک نے اُس کی قدرت کے دُھن میں آکر ملکھوس کا کان تلوار سے اُڑا دیا اُس موقع پر بھی وہ جو دوسروں کی خاطر اپنی قدرت کو کام میں برابر لاتا رہا اپنی خاطر اُس قدرت کو استعمال نہ لایا بلکہ اُس کو اپنے دشمن کے مجروح کان کے چنگا کرنے میں استعمال کیا اور پطرس کو مقابلہ کرنے سے ڈانٹا۔ مسیح میں قدرت کا پایا جانا اور اُس کو دوسروں کی خاطر استعمال کرنا مگر اپنی خاطر اُس قدرت کا استعمال نہ کرنا اس میں اُس کی الوالعزمی اور خود انکاری کا ایک عجیب و غریب میل نظر آتا ہی۔ اُس میں بڑی قدرت تو موجود ہی مگر وہ اُس قدرت کو قابو میں رکھنا اور اُس کا بجا اور محل پر استعمال کرنا بخوبی جانتا ہی۔ اگر انسانی پہلو سے ہی اُسکو دیکھا جاوے تو ہم اُس میں ایک ایسے انسان

کو دیکھتے ہیں جو خود اپنے پر قابض اور حاکم تھا۔ وہ مصلوب ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ بخوشی تمام اپنی جان اوروں کے لئے دیدی مگر محمد صاحب کی زندگی میں ہم کو ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جو پست حالی میں ملنسار اور اقبالمندی کی حالت میں ایک تندخو حاکم نظر آتا ہے۔ کہاں پہلے بھگوڑا واعظ اور نصیحت گو اور کہاں بعد میں جنگی سپہ سالار حتّیٰ کہ یہہ بھی وصیّت کر گئے کہ جب تک دجال ظاہر نہ ہو میرے مومنین اشاعت حق کے لئے ہمیشہ جبر و تعدی میں مصروف رہیں قاتلہم اللّٰہ ہر ایک مسلمان کے کانوں میں تادم مرگ گونجتا رہتا ہے۔ کہاں ایام مکہ میں آپ نے فرمایا جھگڑا نہ کرو کتاب والوں سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو سورہ عنکبوت ۲۵ آیت مگر اب مدتوں بعد فتحمندی کے نشہ میں بزور شمشیر اسلام کی اشاعت ورثہ میں دے گئے۔

اصل حقیقت یہہ ہے کہ محمد صاحب کے دل میں شہوت اور خون ریزی کے تخم شروع ہی سے موجود تھے۔ شہوت کا تخم تو اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب آپنے مکہ والوں کو اپنی طرف کھینچنے کی ترغیب و تحریص کی مختلف تدابیر میں سے بہشت کا ایک شہوانی نقشہ بھی کھینچکر دکھایا اور پھر اُس وقت بھی ظاہر ہوتا ہے جب اُنہوں نے ابو طالب اپنے چچا کی ایک بیٹی کی خواستگاری کی تھی مگر ابو طالب نے مصلحتاً اس عورت اور محمد صاحب میں جدائی ڈالی تھی۔ لیکن جب فتح مکہ کے بعد محمد صاحب نے اُس کا خطبہ کیا تو امہانی نے کہا کہ "واللہ میں دوست رکھتی تھی تم کو جاہلیت میں پس کیوں دوست نہ رکھوں تم کو اسلام میں" دیکھو امہات مومنین صفحہ ۲۴ مگر جب خدیجہ سے آپ کا نکاح ہوا جو آپ کی ایک خاص محسنہ تھی تو اُس کی حسین

حیات میں آپنے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ کیونکہ خدیجہ کا اثر اُن کے شہوانی خیالات کے عمل میں آپکا پوری طرح مانع تھا۔ دیکھو کتاب مذکورہ بالا۔ مگر اُس کی وفات کو ابھی تین ماہ نہ گزرے تھے کہ محمد صاحب عنانِ صبر و قرار کو ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں اور عورت پر عورت اور لونڈی پر لونڈی کر کے قرآن کے احکام کی مقررہ حد سے بھی تجاوز کر جاتے اور بعض ناشائستہ اور ناگفتہ بہ حرکات اپنے اوپر جائز اور مباح ٹھہراتے ہیں +

خون ریزی کا تخم ہم کو اُس موقع پر نظر آتا ہے جب اسلام کی آئتیں مکّہ میں سُنائی جاتی ہیں۔ مکّہ والوں پر محمد صاحب ایک قسم کا دباؤ ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اُن کی دعوتِ اسلام کو رد کرتے تھے۔ اِس سے ایک قسم کی بےصبری اُن کی طبیعت میں پائی جاتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اپنے دین میں لانے کے لئے اُن پر کسی قسم کا دباؤ ڈالیں۔ خدیجہ کی بدولت جو ایک تاجرہ اور شریف خاندان میں سے اور مالدار تھیں محمد صاحب متمول ہو گئے تھے بلکہ ایسے بڑے امیروں میں ہو گئے تھے کہ قریش میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس کے علاوہ ابوبکر اور اُن کے چچا ابوطالب جیسے لوگ اُن کی حمایت کرتے تھے۔ اِس لئے مکّہ والوں پر ذرا جلدی بیجا دباؤ ڈالنا چاہتے تھے اور گو اُن کی ضمیر اسلامی سورتوں میں جبر اور اکراہ کرنے پر ملامت کرتی تھی مگر بقول شخصے ؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کبھی تو قبیلہ قریش سے قربت حاصل کرنے کے لئے قرینِ مصلحت والی اور غیر واجب حکمت عمل میں لاتے اور اُن کے بتوں اور معبودوں کی داد دیتے کبھی دھمکی اور پھٹکار اور کوسنے

سے کام لیتے کبھی گانوں بہ گانوں قبیلے بنی بکر میں کبھی قحطان کے قبیلے کی طرف
اور کبھی طائف اور ثقیف میں جا کر اس بات کی سعی اور کوشش کرتے کہ وہاں کے لوگوں
کو جن کے خانگی عناد اور جھگڑے مکہ والوں سے مدت سے چلے آتے تھے دعوتِ
اسلام دیکر اُن کو مکہ والوں کی مخالفت میں ابھاریں اور کبھی مدینہ والوں میں سے
جو حج کے لئے سال بسال مکہ میں آتے اُن کے ساتھ مقام عقبہ میں عہد و پیمان
باندھ کر بیعت اور اقرار کرواتے تھے کہ وہ محمد صاحب اور اُسکے پیروؤں کی جان
کی حفاظت کے لئے سر دینے کو تیار ہونگے اور رفتہ رفتہ مدینہ میں خود ہجرت فرما کر
جوں جوں اُن کو فروغ حاصل ہوتا گیا مکہ والوں پر اپنے قدیمی عناد اور بغض کا
غبار پہلے پہل بذریعہ اُن کے قافلوں پر حملہ اور لوٹ کھسوٹ کرنے کے نکالتے
رہے حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جب خون ریزی کو جہاد کے نام سے تعبیر کرنے لگے اور
الٰہی احکام کی بنیاد پر اکراہ اور جبر کو جائز ٹھہرایا اور مکہ پر فتحیابی حاصل کر کے اُن کو
تہ تیغ کیا اور باقیوں کو مطیع اور منقاد کر کے بزور شمشیر اسلام قبول کروایا ۔ شاید ہی
شکسپیر نے اپنے کیرکٹروں کا ایسا خاکہ کھینچا ہوگا جیسا محمد صاحب کی سرگذشت
سے اُن کا کیرکٹر صفحات تواریخ میں صاف صاف نظر آتا ہے۔ اب ہر ایک
اہلِ بصیرت دیکھ سکتا ہے کہ آیا محمد صاحب کا نمونہ ہماری تقلید کا باعث ہو سکتا
ہے یا نہیں ؟

پھر دیکھئے ان آیات مذکورہ بالا کے متعلق ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ پیش کیا
جاتا ہے ہم پوچھتے ہیں کہ متذکرہ بالا بالمقابل آیات سے جو منشا فصنہ صورتیں ہیں

کونسی ناسخ اور کونسی منسوخ ہیں اور کس پر ایک محمدی عمل کرنے کے لئے تیار ہی؟ ہندوستان
کے محمدیوں کی موجودہ حالت ضعف اور کمزوری کی ہی کیونکہ وہ سرتاج نہیں ہیں بلکہ
محکوم ہیں تو کیا اس حالت میں لا اکراہ فی الدین پہ چلنا جائز ہی اور مرزا غلام احمد
قادیانی کی طرح مہدی قتال کی آمد سے ایسی حالت میں منکر ہونا مصلحت سمجھی جائے؟
اگر ہی تو یہہ آیت منسوخ نہیں ہوئی پھر دوسری آیت کا محل محمد صاحب پر جائز کیوں
ٹھہرایا جاتا ہی؟ اگر مفسرین کے مطابق ان آیتوں کی غرض کو معیادی قرار دیا جاتا
ہی تو یہہ دلیل اہل نظر کے آگے کچھہ بھی وقعت نہیں رکھتی بلکہ لچر اور پوچ ہی کیونکہ اگر
حلیمی اور بردباری کی راہ تب ہی تک جائز ہو جب انسان کو زور اور غلبہ کے آگے
مجبوراً حلیم اور عاجز ہونا پڑتا ہی الّا اُس وقت جب احسان اور تواضع اور حلیمی اور صبر
کا عین صحیح موقع آجاوے یعنے اقبال کی حالت میں تب اُن کو عدم کا رستہ دکھایا
جاوے تو یہہ خوبیں ہرگز اخلاقی نہیں کہی جاسکتیں بلکہ اُن کو اصول پولیٹی میں
شامل کرنا چاہئے۔ کیا اچھا ہوتا کہ جب محمد صاحب مدینہ میں تھے اور اختیار اور
حکومت اُن کے ہاتھہ میں آنے لگی اور جنگی بہادروں کا گروہ اُن کے حلقہ میں شامل
ہونے لگا تب وہ صلح اور امن کا نمونہ دکھاتے اور مبشر اور خوشخبری دینے والے
اور نذیر کے رتبہ پر قناعت کرتے تب تو ضرور اُن کے اعمال قابل تقلید ہوتے مگر نہیں!
ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی طبیعت میں مستقل مزاجی نہ تھی بلکہ حرص اور طمع نے اُن کے
کیرکٹر پر سخت داغ لگا یا ہوا تھا۔ کہاں پہلے بیت المقدس اُن کا قبلہ گاہ مقرر تھا اور
کہاں پھر حرم کعبہ اپنا قبلہ مقرر کیا۔ کہاں پہلے بہت عرصہ تک ایک ہی نکاح پر قانع

رہے اور کہاں خدیجہ کے انتقال کے بعد قرآن کی مقررہ حد چار سے بھی تجاوز کر گئے۔ ہم کو تو کسی صورت میں اُن کی تقلید ضروری نظر نہیں آتی۔ کثرت ازدواج نہ جماعت نہ کسی فرد کے لئے صورت کمال ہی۔ نہ صرف مسیحی تعلیم کی بنیاد پر یورپ کے عیسائیوں ہی نے کثرت ازدواج کو فی نفسہ ایک فعل قبیح سمجھ کر اُسکو قانوناً ناجائز ٹھہرایا ہی بلکہ ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان بھی کثرت ازدواج کی قرآنی تعلیم کی موجودہ نئی روشنی کے مطابق تاویل کر کے قرآن کے احکام دربارہ تعداد ازدواج کو از قبیل نواہی بلکہ حرامکاری کا تعلق سمجھنے لگے ہیں۔ فرض کرو یہہ مان بھی لیا جاوے کہ محمد صاحب کے زمانہ میں نکاح کی کوئی قید نہیں لگائی گئی تھی اور کہ وہاں کے لوگ اجہل تھے بت پرستی میں مبتلا اور بڑے قزاق اور خونی اور زانی تھے اور کہ محمد صاحب نے نکاح کی ایک واجب قید لگادی اور عرب والوں پر ایک بڑا احسان کیا۔ مگر جب یہہ دیکھا جاتا ہی کہ محمد صاحب کی تعلیم اور اُن کی زندگی مخصص متصور نہیں کیجاتی بلکہ درجہ عمومیت اور جامع کل کی حیثیت رکھتی ہی تب دیکھنا چاہیئے کہ آیا کثرت منکوحات کسی سوسائٹی کے لئے صورت کمال ہی یا نہیں۔ کتب مقدسہ کی تعلیم میں انجام کو شروع سے دکھایا جاتا ہی تاکہ اُس میں ارادہ ازلی نظر آوے مگر اُس تعلیم کی تکمیل انسانی تواریخ میں شروع ہوتی ہی اور بتدریج انجام کو پہنچتی یا پہنچائی جاتی ہی مثلاً خدا نے ابتدا میں نر و ناری پیدا کیا مگر معصیت اور گناہ کے پھیل جانے کی وجہ سے گنہگار انسان نے اُس سے تجاوز کرنا شروع کیا اور اُس زمانہ کی تہذیب کے اندازہ سے کثرت ازدواج کی رعایت کی گئی اور ساتھ ہی اُس کی

قباحت اور خباثت کو دکھایا گیا ہی تاکہ آئندہ روشنی میں خدا کی اصلی منشاء دربارۂ تعلقات
مرد اور عورت ابتدائی بنیاد پر ظاہر کی جاوے۔ اِسی طرح آدم کو بے گناہ بلکہ خدا کی
صورت میں پیدا کیا گیا تاکہ شروع سے ہی انسان کا اصلی منصب دکھایا جاوے کہ
وہ عصمت کی راہ سے پاکیزگی کو حاصل کرے اور خدا میں ہمیشہ خوشحال رہے مگر وہ
عصمت پر قائم نہ رہنے اور پاکیزگی نہ کمانے کی وجہ سے فردوس سے نکالا گیا لیکن
پھر بھی الٰہی منشا کو اور انسانی منصب کو برابر مدِنظر رکھا گیا ہی اور یہہ دکھایا گیا ہی کہ
اِنسان بالکل گرا نہیں دیا گیا ہی بلکہ کس طرح وہ اپنی اصلی حالت میں بحال کیا جاوے۔
اسی طرح باغ عدن میں آدم کا کوئی خاص یا مکانی قبلہ مقرر نہیں تھا اُس کو تو ہر جگہ
اور ہر حالت میں خدا کی قربت حاصل تھی اور گو بعد میں گناہ کی وجہ سے انسان خدا
سے جدا ہوا پھر بھی خدا نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ اُس کی تعلیم اور تربیت
اور عبادت کے لیے خاص قبلہ مقرر کیا جو آئندہ پرا ہما کرتا تھا اور جس کا مسیح کے
آنے پر پوری طرح سے انکشاف ہوا کہ انسان خدا کی پرستش روح اور راستی سے
ہر جگہ کر سکتا ہی۔ مگر محمد صاحب کی تعلیم نے انسان کو ہر زمانہ کے لئے مقید کیا ہی
وہ آنحضرت کی سنت سے ایک قدم بھی آگے نہیں رکھہ سکتا۔ اگر مسلمان محمد صاحب
کا پورا مقلد اور مکلّف ہی تو جو سنت چودہ صدیاں پیشتر آپ قائم کر گئے اُس سے وہ
ہرگز تجاوز نہیں کریگا محمد صاحب کی تعلیم اور سنّت فرزند کی جگہ انسان کو غلام بناتی
ہی وہ خود عبدہٗ کہلائے اُن کی تعلیم اور سنّت آزادی کی جگہ انسان کو رسم اور ریت
کی شدید قیود سے مقید کرتی ہی حقیقی عبادت کی جگہ مکان پرست اور لفظ پرست بناتی

ہے اور جیسا ہم نے پہلے بیان کیا کہ وہ ایک سردار مخلوقات مانے گئے ہیں تو انسان کے لئے نمونہ قرار دئے نہیں جا سکتے مسیح خداوند تو کامل انسان بھی تھا اور اپنے آپ کو ابن آدم کہا تاکہ وہ ہر ایک انسان کی تقلید کے لئے ایک کامل معیار ہو *

محمد صاحب کا سوشل طریقہ جو کہ ارکانِ دین میں شامل ہے وہ مطلق واجب التقلید نہیں ہے۔ مرد اور عورت کے ابتدائی رشتہ کو آنحضرت نے نہ صرف بلحاظ کسی خاص ایک زمانہ کے برطرف رکھا ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے اُس ابتدائی رشتہ کے مطابق سوسائٹیاں ایک ایسا مجموعہ خاندانوں کا قائم کرتی ہیں جن میں باہمی محبّت اور ترقی اور گھر کے آرام و آسایش اور خاندانی خصوصیتوں کے پیدا کرنے کے لئے پوری گنجایش ہوتی ہے۔ مگر محمد صاحب کی تعلیم نے عورت کا لحاظ نہ رکھ کر بلکہ اُس کی بے قدری اور بے عزتی کر کے خاندانوں کی خانہ بربادی اور حسد اور کینہ اور دائمی جھگڑے اور فساد کی بنیاد قائم کی ہے حتّٰی کہ جس کو یورپ کی اصطلاح میں ہوم کہنا چاہیئے محمدی خاندانوں سے اُسکا نشان تک بھی اُڑا ڈالا ہے *

قرآن کے مطابق ہر ایک مسلمان پر نکاح کے چار تک کے جواز کو شرعاً مقرر کیا ہے دیکھو سورہ نسا۔ یہہ سوال لازم آتا ہے کہ جو قید نکاح کی قرآن میں باندھی گئی ہے اُس کے مطابق بے طرح آزادی کو کہاں تک روکا گیا ہے؟ جب طلاق کی شرائط پر جو کثرتِ منکوحات سے لازم ملزوم ہیں غور کیا جاتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ حد بندی بالکل زائل ہو جاتی ہے کیونکہ عملاً ایک محمدی جتنی جورویں چاہیئے تزویج فرما سکتا ہے بشرطیکہ کسی وقت اُس کے نکاح میں ایک ساتھ چار سے زائد نہ ہوں۔ یعنے حد بندی کے

یہہ معنے ہیں کہ چار منکوحہ عورتوں سے زیادہ کا قانونی حق کسی مرد پر جائز نہیں ہی مگر جہاں چار میں سے ایک یا دو کو طلاق دی اور جس کو چار ہی ماہ گذرے ہوں وہ پھر نئے نکاح شرعاً عقد میں لاسکتا ہی جو حسابی اصول کی صورت میں مختلف طور پر یوں دکھایا جاسکتا ہی ۴-۴+۴ (۸) = ۴ یا ۴-۳ = ۱+۳ (۷) = ۴-۲ = ۲+۲ (۹) = ۴-۱ = ۳+۱ (۱۰) = ۴ اوراسی طرح بڑھاتے جاؤ- ایسی نظیریں بہت سی ہیں جن میں مقدور والے مسلمانوں نے طلاق پر طلاق دیکر اپنی حین حیات میں تیس عورتوں تک نکاحی عقد باندھا ہی اور اُن کا فعل ایک قدم بھی قرآنی شریعت سے باہر نہیں رکھا گیا ہی- کیا یہہ قرآنی نکاح جو حلال اور مباح ٹھہرایا گیا ہی- عیاشی کے لئے پوری گنجائش کا باعث نہیں ہی؟ ہاں یہہ تو سچ ہی کہ مطلقہ عورت کے کسی قدر مواجب وحقوق قائم کئے گئے ہیں چنانچہ وہ مہر کا دعویٰ کر سکتی ہی مگر ایک حیثیت والے شخص کے لئے یہہ کوئی روک کا ذریعہ نہیں ہی لیکن اس کے علاوہ جب ہاتھ کا مال یعنے لونڈیوں کو اپنی مدخولہ بنانا بھی مباح ہی تو ظاہر ہی کہ قرآنی تعلیم کے مطابق عیاشی کے لئے پوری گنجائش ہی +

یاد رہے کہ ہم اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ آیا محمد صاحب کی سنّت واجب التقلید ہی یا نہیں؟ اگر قرآن کی منشا ہی کہ شہوت رانی کی موج کو روکا جاوے اور نکاح کی ایک قید لگا دی جاوے تو ہم کو مقدم صورت میں محمد صاحب کی اپنی زندگی میں قرآن کا منشا نظر آنا چاہیئے لیکن دیکھا جاتا ہی کہ وہ خود قرآن کی مجوزہ تحدید پر قائم نہیں رہے اگر وہ خود اس امر میں اصلاح کو مدِ نظر رکھتے تھے تو زیادہ تر اُن کے ادا کے

صحابہ کے نمونہ پر قرآن کی منشا ظاہر ہوتی مگر آنحضرت نے خود چار سے زائد جوروئیں
تزویج فرمائیں تو اُن کی سنّت اس صورت میں واجب التقلید کیونکر ہو سکتی ہی؟ اور یہہ
بھی یاد رہے کہ اس تعلیم کے مطابق مرد کا تو لحاظ کیا گیا ہی مگر عورت کا لحاظ نہیں رکھا
گیا وہ تو مرد کی کھیتی متصور ہی دیکھو سورۂ بقر رکوع ۲۸- ہم پوچھتے ہیں کہ کیا عورت کی
ہمیشہ یہی حالت رہیگی؟ کیا اُس میں انسانیت موجود نہیں؟ کیا وہ تہذیب اور اخلاق
اور اُن تمام امورات میں خواہ معتقدات میں سے یا دیگر معاملات میں سے ہوں ترقی
نہیں کر سکتی؟ محمد صاحب کے خود اپنی ابتدائی سوانح عمری سے ظاہر ہوتا ہی کہ
اُس وقت جب خدیجہ کے ساتھہ اکیلے بہت عرصہ تک نبھایا تو اُن کو خدیجہ کی عقل
او رفضل اور ایمان سے بہت کچھہ فائدہ حاصل ہوتا رہا اُسی کی بدولت آپ افکار دنیا
سے نجات پاکر یاد الٰہی میں مصروف رہے اور اُسکا نیک اثر آپ کی زندگی پر بہت کچھہ
ہوا ہوگا جس کے باعث اُس کے جیتے جی آپ اُس کے احسانات کے حلقہ بگوش رہے
مگر بعد میں خانگی مخمصہ وغیرہ میں مبتلا ہوئے اگر کتب مقدسہ کے مطابق بہشت میں
شادی اور شہوت رانی کا نام و نشان تک بھی نہیں ہوگا تو یہہ قرین قیاس ہی
کہ وہ مذہب جو مرد اور عورت کے باہمی پاک رشتہ کو ابھی سے قائم کرتا ہی اور اُس
شخص کا نمونہ جس نے عورت کی واجبی توقیر کی اور اُس کو شریف سمجھا واجب التقلید ہی

پھر ہم نے یہہ کہا تھا کہ قرآنی مذہب ایک مکانی مذہب ہی اور کسی دائمی اور
منجانب اللہ دین کی صفات سے متصف نہیں کیا جا سکتا مثلاً محمد صاحب کا حج
کی پرانی رسومات کا قائم رکھنا تاکہ تمام مسلمانوں میں قومی پاسداری کے پیدا کرنے

کے لئے مکہ کا قبلہ ایک اتحاد کا مرکز ہو گو ایک قسم کی شراکت کا باعث ہوا لیکن اِس بودی اور کمزور تدبیر نے جسمانی آنکھوں کو وہ جگہ دی جو ایمان کا حق تھا۔ دنیاوی حکومت کو وہ جگہ دی جو روحانی ابدی بادشاہت کا حصہ تھا۔ عمومیت کی جگہ مذہب کو مختص بنایا۔ ایک مسلمان کا خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ کیوں نہ ہو رخ ہمیشہ مکہ ہی کی طرف ہوگا نہ آسمان کی طرف۔ خداوند مسیح کی زندگی میں اُس کے جی اُٹھنے کے بعد اور صعود فرما ہونے کے وقت لکھا ہے کہ جب اُس کے شاگرد آسمان کی طرف تک رہے تھے تو اُن کے دیکھتے ہوئے وہ اوپر اُٹھایا گیا اور بدلی نے اُسے اُن کی نظروں سے چھپا لیا یہہ وقوعہ پُر معنے ہے۔ اول کہ وہ وہاں گیا جو روحانی اور ابدی دنیا کہلاتی ہے۔ جس کی موجودہ دنیا ایک سایہ اور علامت کی صورت ہے۔ دوم اس وقوعہ میں اُس نے مومنین کی آنکھوں کو اُس روحانی دنیا کی طرف جہاں وہ خود داخل ہوا لگایا۔ مُردوں میں سے جی اُٹھنے کے بعد اُس نے موجودہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی اپنی رہایش کا مکان یا قبلہ یا مزار جیسے یروشلم یا روم مقرر نہیں کیا تاکہ اُس پر ایمان لانے والے اُس کو کسی خاص مکانی جگہ میں نہ دیکھیں جیسا اُس نے خود کہا کہ میری بادشاہت اِس دنیا کی نہیں ہے بلکہ اپنے کو سُرگ باسی سمجھکر ایمان کی آنکھوں سے اُس کو وہاں دیکھیں جہاں وہ داخل ہوا۔ یہہ مذہب کے عالمگیر ہونے کی صورت ہے جس میں ایمانداروں کی جماعت خواہ وہ کسی مُلک میں ہی پائی جائے مکان پرستی سے محفوظ ہو کر بلکہ کل مکانی اور قومی حدوں کو توڑ کر اور آگے بڑھتی ہوئی اُس انجام کو مدِنظر رکھتی ہے جو مسیح خداوند نے سامری عورت کے ساتھ

بات کرتے ہوئے اُن پُروزن الفاظ میں بیان کیا جو دنیا کے آخر تک کانوں میں گونجتے رہینگے کہ ”اے عورت میرا یقین کر کہ وہ گھڑی آتی ہے جب نہ تو اس پہاڑ پر اور نہ یروشلم میں تم خدا کی عبادت کروگے کیونکہ خدا روح ہے اور وہ جو اُس کی بندگی کرتے ہیں چاہیئے کہ روح اور راستی کے ساتھ کریں“

مگر ایک مسلمان کے عقیدہ کی بنیاد مکہ کا قبلہ اور کالا پتھر اور بت پرستوں کی پرانی رسومات ہیں جو اُس کو دنیا کے اسی ایک حصہ میں کھینچتی اور قائم رکھتی ہیں۔

پھر دیکھا جاتا ہے کہ مسیحی تعلیم دربارہ صلح و امن اور ظالم کا مقابلہ نہ کرنا (متی ۵: ۳۸ و ۳۹ و ۴۰) پر جرح کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد صاحب مسیح کی اس تعلیم پر قرآن کی تعلیم کو فوقیت دیتے ہیں اور مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری قرآن کی تعلیم دربارہ مقابلہ حکیمانہ اور مطابق فطرتِ انسان سمجھے بیٹھے ہیں اور مسیح کی اس تعلیم کے مقابلہ میں ایک عملی نظیر پیش کرکے پھولے جامہ میں نہیں سماتے بلکہ لوٹن کبوتر کی طرح لوٹ پوٹ ہوئے جاتے ہیں کیونکہ آپ نے یہہ سمجھ لیا ہے کہ چونکہ گورنمنٹ انگلشیہ جنوبی افریقہ کی لڑائی میں مسیح کی تعلیم پر کاربند نہیں ہوئی بلکہ قرآن کی تعلیم پر۔ تو فی الفور اپنے زعم میں یہہ ٹھان لیا کہ انجیلی فقرہ اب سے ردی کے صندوق میں ڈال دیا گیا ہے۔ شاید آپ کی نگاہ میں قرآنی مسئلہ ناسخ اور نسخ مسیح کی تعلیم پر عائد کرنا مدِنظر تھا۔ مگر ہم اہلِ اسلام کو دکھا دیتے ہیں کہ یہہ تعلیم ردی کے صندوق میں ڈالے جانے کے قابل ہے۔ کیا یہ بات ابھی علانیہ طور پر دلوں کی تختی پر کندہ ہے اور عام گذرگاہوں پر

ایسی نمایاں چسپاں ہی کہ اُس کا مٹا دینا مقید بشریت سے بعید ہی۔ وہ تعلیم جب تک اُس کی مدعا پوری نہ ہووے ایک سائین پوسٹ کے طور پر انجام اور تکمیل کے راستہ کو دکھاتی رہیگی۔ وہ سائین پوسٹ اُس زمانہ کی حالت کو دکھا رہا ہی جب لڑائیاں بند ہو جاوینگی اور انتقام اور بدلہ لینے کی جگہ جس کی توام عدالت ہی صلح اور امن جس کی توام برادری ہی قائم ہو جاویگی۔ اگر قومیں ابتک مسیح کی اس تعلیم پر کاربند نہیں ہوئی ہیں تو اس سے یہہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کبھی بھی اُس پر کاربند نہیں ہونگی ہیگ کانفرنس کی نظیر جس کی تحریک روس کی طرف سے ہوئی دیکھ لیویں۔ اُس کانفرنس کی تجویز پر آئندہ تمام یورپ نے کسی قدر عمل کرنے کے لئے داد دی ہی۔ یہہ گویا مسیحی تعلیم میں سے بطور ایک خوشہ از خرمن لیا گیا ہی جو اس بات پر ایما ہی کہ آئندہ یورپ کا رخ کس طرف ہوگا ہاں فطرتِ انسانی جسکا بانی مبانی قرآن بتلایا جاتا ہی۔ وہ تو جنگ جوئی پر ہمیشہ آمادہ رہتی ہی اور رہیگی اور یہہ جنگ جوئی کی طبیعت جس کا انسان خوگر ہو گیا ہی اور جو واقعی اُس کی ذات میں ایک فطرت ثانی بن گئی ہی گناہ کا نتیجہ ہی لیکن اس فطرت ثانی پہ خدا قادر ہی اور انسان کو اُس راستہ پر لا رہا ہی جو صلح اور امن کا راستہ ہی "مبارک وے ہیں جو صلح کرانے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے فرزند کہلاوینگے" انجام کار انسان کی مرضی خدا کی مرضی کے زیر ہو کر جبر و ظلم چھوڑ دیگی اور انسان کو انسان جانکر اُس کی عزت اور قدر کریگی۔

پھر دیکھئے کہ محمد صاحب نے کافروں اور منافقوں سے جنگ و جدل اور فساد کرنے کی تعلیم دی تھی کو انہوں نے جہاد سے تعبیر کیا ہی کہ ان مسلمانوں [illegible]

مقاتلہ کرو تاکہ فتنہ باقی نہ رہے"۔ اس تعلیم میں بھی ایک قسم کی صلح منصور ہے یعنے مقاتلہ اور فتنہ کے دور کرنے سے نتیجہ یہہ ہو کہ باقی مسلمان ہی مسلمان نظر آویں۔ تواریخ آ دیکھا جاتا ہے کہ آنحضرت اور اُن کے بعد خلفا نے جہاد جاری رکھا اور بزور شمشیر اور زبردستی سے قرآن اور محمد صاحب کو لوگوں کو مجبور اور مقہور کر کے منوایا۔ سیر اسلام کے مطالعہ سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ بجبر و اکراہ مسلمان ہوئے وہ موقعہ پاکر فوراً منحرف ہو گئے بلکہ عین محمد صاحب کی حین حیات میں ایسا اتفاق ہوا اور اُن کے بعد کا حال حدیث عائشہ میں مندرج ہے جس کا مولوی صفدر علی صاحب مرحوم حوالہ دیکر کہتے ہیں کہ "بجبر چند اشخاص کے سب کے سب تتّر بتّر ہو گئے اور بھیڑوں کی مانند اپنی راہ لے گئے اور اسلام سے منحرف ہو گئے آخر کار ابوبکر نے مار مار کر پھر جمع کیا"۔ قرآن کی فطرتی تعلیم جسپر مسلمان نازاں ہیں صلح اور امن قائم کرنے کے بارہ میں یہی ہے۔ کون اہلِ نظر اِس بات کو مان سکتا ہے کہ جو لوگ بطمع مال و متاع یا بخوف جان مذہب کو اختیار کرتے ہیں وہ حقیقت میں اور دراصل صلح اور امن کے جھنڈے تلے آ گئے ہیں؟ حاشا و کلا۔ بلکہ ایسے لوگ بدستور منافق رہینگے جن کے لئے یہی قانون بدستور جاری رہیگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت*

پھر قرآن کی فصاحت اور بلاغت قائم معجزہ منصور ہے بلکہ قرآن کے دعوئے اسلام کو دعویٰ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن خود کہتا ہے فاتوا بسورۃ من مثلہ۔ اہلِ اسلام قرآن کی للکار پر بڑا زور دیتے ہیں مگر اس دعویٰ کی تصدیق

ہیں صرف زبانی جمع خرچ نظر آتا ہی اور کچھہ نہیں۔ فاتوا بسورۃ من مثلہ سے قرآن کے دعوی الہام کی تصدیق ہرگز نہیں ہو سکتی جب تک یہہ نہ ثابت کیا جاوے کہ قرآن کی آیتیں معجزہ کی صورت ہیں معجزہ کی پہچان کے لئے چار امور کی ضرورت ہی اول معجزہ حیرت پیدا کرتا ہی۔ دوم فوق القدرت کا ایک صریح اظہار ہی۔ سوم نشان ہی۔ چہارم انجام کو مدنظر رکھتا ہی یعنے جو الہام پیش کیا جاتا ہی اُسکا معجزہ مصدق ہی۔ قرآن کی فصاحت اور بلاغت نے کبھی بھی انسان کو اُس حیرت میں نہیں ڈالا ہی کہ اُس نے اُس کو معجزہ تصور کیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ جو قرآنی آیتیں پتھروں پر اور ہڈیوں پر اور کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئیں صحابہ کے سامنے جو قرآن کے جامع تھے پیش کرتے تھے تو اُس وقت اُن کے دعووں کی صحت کی بابت شبہ کیوں ظاہر کیا جاتا تھا؟ کیوں محکمہ عدالت یا قسموں کی ضرورت پڑتی تھی کہ آیتوں کی نسبت گواہ و ثبوت بھی طلب کئے گئے؟ علاوہ اِس کے وہ لوگ جو عربی سے واقف نہیں ہیں اور ہزارہا مسلمان بھی ایسے ہیں جو عربی سے محض ناآشنا ہیں۔ اُن کے لئے قرآن کی عبارت کونسی حیرت پیدا کرنے والی ہی؟ پھر فوق القدرت کا اظہار قرآن کس صورت میں ہو سکتا ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت کی مکی سورتوں کی فصاحت مدنی سورتوں میں بالکل کافور ہو جاتی ہی وہ قافیہ بندی جو صافات و مرسلات و نازعات وغیرہ کے شروع میں نظر آتی ہی مدنی آیتوں میں تدابیر ملکی اور سرداری اور سروری اور خانگی مخمصوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے طول طویل نثر ہی نثر رہجاتی ہی۔ علاوہ ازیں قرآن کی

فصاحت کس چیز کا نشان ہی؟ مفسرینِ قرآن میں خود اس کی نسبت اختلاف ہی کہ آیا قرآن کی کیا صورت معجزہ قرار دی جائے اُس کی غیب کی باتیں یا اُس کی تعلیم یا اُس کی فصاحت؟ ہمارے خیال میں جو ڈپٹی عبداللہ آتھم صاحب مرحوم نے اپنی کتاب جوہر القرآن اور ماسٹر رام چندر نے اپنی کتاب اعجازِ قرآن میں قرآن کا معارضہ اور تحدی دعویٰ بے نظیری کا قرآن کے رو سے دکھایا ہی سو صحیح ہی کہ قرآن اُن کتابوں کا جو انبیا رسلف کی معرفت کلام اللہ مسلمہ ہیں خلاصہ محض ہیں +

پھر مکہ والوں کی طرف مخاطب ہو کر محمد صاحب کا یہہ کہنا کہ اس کی مثل کوئی سورۃ لے آؤ بعید از انصاف تھا کسی شاعر کے کہے ہوئے مصرعہ کے مقابل میں یہہ ضروری ہی کہ دوسرا شاعر اُسی مصرعہ کے نفس مضمون پر طبع آزمائی کرے مثلاً اگر مصرعہ کسی معشوق کی تعریف کے بیان میں ہی تو وہی شاعر اُس مضمون پر طرح دے سکتا ہی جو خود عاشق ہی جس کے دل میں معشوق کی طرف اُسی قسم کے جذبے جوش زن ہوتے ہیں جو دوسرے کے دل میں مصرعہ لکھنے کے وقت جاگزیں تھے۔ عرب کے شاعروں نے سخاوت اور شجاعت اور محبت اور عداوت اور انتقام پر نہ صرف ایک یا دو شعر بلکہ فصیح و بلیغ قصائد طویلہ اور خطبہ عظیمہ کی انشا پردازی کی ہی اور ہجو اور طعن و تشنیع کے عمدہ ترین اشعار کہے ہیں مگر جب محمد صاحب نے ان مضامین پر کچھہ بھی طبع آزمائی نہ کی تو اُن لوگوں سے ایسی سورہ کی مثل طلب کرنا کہ جس کا مضمون مذہبی تھا و جس میں اہلِ عرب کا مذاق نہ تھا بے انصافی میں داخل تھا +

اور پھر اگر قرآن بلحاظ مضمون اور عبارت فصیح و بلیغ ہی جس طرح موجودہ آریا لوگ بھی وید کو بلحاظ معنے اور عبارت اکمل سمجھتے ہیں تو اُن میں زیادہ ترقی کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ مگر مشاہدہ اِس کے خلاف ہی کیونکہ مشاہدہ میں شروع اور ترقی اور انجام نظر آتا ہی۔ ابتدائی زبانوں کی ترکیب ایسی واقع ہوئی ہی کہ جدا جدا الفاظ شروع و آخر الفاظ میں باہم پیوستہ ہوکر اپنے معنے ادا کرتے ہیں اور اِس قسم کی زبانیں اپنے ہم جنس آئندہ زبانوں کی بنیاد ہوجاتی ہیں اور وہ دو صورتوں میں جوں جوں انسان کے خیالات کو وسعت ہوتی ہی یا تو اصلی زبان میں تغیر و تبدل واقع ہوتا رہتا ہی یا اُس کا پالا کسی غیر زبان سے پڑتا ہی جو اُس میں سے لیکر اپنی زبان کا ذخیرہ فراہم کرتا ہی اور اِس طرح دوسری زبان کے الفاظ کی ترکیب متحد صورت سے بدل کر منفردی صورت اختیار کرتے ہیں یعنے سنتھیٹک سے اینالیٹک بنجاتی ہی۔ مثلاً انگریزی زبان اینالیٹک ہی اور گو ترکیب کے لحاظ سے ایسی مکمل نظر نہیں آتی جیسی لاطینی یا یونانی زبان مگر مضامین اور خیالات کے لحاظ سے جو وسعت اُس کو ہی اور ہورہی ہی سو لاطینی اور یونانی زبانوں میں نہ ہوئی نہ ہوگی۔ انگریزی انشا کی تواریخ سے ظاہر ہی کہ چوسر سے لیکر شکشپیر تک ایک تواتر اور مسلسل صورت ترقی کی عیاں و بیاں ہی جو شکشپیر میں ایک کمال درجہ کو پہنچتی ہی اور تاحال زبان مذکور کی ترقی روزافزوں ہی اور جاری رہیگی۔ اسی طرح اصطلاحات سائنس اور فلاسفی اور تھیالوجی اور دیگر علوم جو کچھ یورپ کی زبانوں نے پُرانی زبانوں کی بنیاد پر ترقی کی ہی وہ ایشیا کی کسی زبان نے ابھی تک نہیں کی ہی۔ اصل بات یہہ

ہو کہ جس طرح نیچر کے متعلق علوم وفنون میں انسان اپنی ترقی کو بذریعہ مشاہدات و ملاحظات بڑھاتا رہتا ہو اور تہذیب میں ترقی کرتا رہتا ہو اُسی اندازہ سے اُس کی زبان کو بھی وسعت ہوتی رہتی ہو۔ زبان دانی کا منبع اور چشمہ چونکہ انسانی زندگی سے وابستہ ہو اس لئے اُس کے وسعت کے میدان کا کوئی انتہا نہیں ہو اب جبکہ قرآن کا وجود لوح محفوظ میں پایا جاتا ہو تو جو وسعت اُسکو ہونی چاہئے تھی وہ تو اُس میں ازل سے موجود ہو اور شاید یہی وجہ ہو کہ علم فقہ والوں نے قرآن ہی کی بنیاد پر آیندہ عربی کے صرف و نحو اور ترکیب الفاظ وغیرہ کو قائم کیا ہو جسکا نتیجہ یہہ ہوا ہو کہ عرب والوں میں قرآن کی بدولت کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی ہو ہاں یہہ تو سچ ہو کہ مسلمانوں کا غیروں کے ساتھ سابقہ پڑنے کی وجہ سے ترقی کرنیکی بہت کچھہ گنجائش ہوئی مگر وہ ترقی قرآن کی بدولت نہیں ہوئی ہو اور نہ ہی محض قرآن کے پڑھنے والے عالم کے نام سے ممتاز کئے جاسکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری سمجھہ میں نہیں آتا کہ قرآن کی فصاحت کی بنیاد پر لفظ پرستی کیوں کی جاتی ہو جس حال کہ اُس فصاحت سے کچھہ بھی عام استفادہ متصور نہیں ہو؛ قرآن کا ترجمہ نہ صرف نہ قرآن ہی متصور ہو بلکہ کیا قرآن کیا ویدان کا ترجمہ اگر کسی اور زبان میں کیا بھی جاوے تو اُن کا جوہر جاتا رہتا ہو۔ لیکن یہہ کتب مقدسہ ہی کے حسنات میں سے ہو کہ اُس کے مختلف ترجموں میں بھی جو قریباً چارسو زبانوں میں ہو چکے ہیں بعینہ وہی فصاحت پائی جاتی اور وہی فیض پہنچتا رہتا ہو جو اصلی زبان سے حاصل ہوسکتا ہو۔ کیا اس میں خدا کی دوراندیشی نہیں پائی جاتی کہ وہ کتاب

جس نے کل دنیا کو فیض اور فائدہ پہنچاتا ہی وہ سب زبانوں میں ایسی ادا ہو کہ اُس کا
کوئی بھی دقیقہ باقی نہ رہے؟ بیبل کے انگریزی ترجمہ کا ملاحظہ کیجئے جس نے کل
انگریزی انشاپردازی اور علم ادب میں ایسا دم پھونکا ہی کہ انگلستان میں کوئی بھی
ایسا شاعر یا انشاپرداز یا فصیح تقریر کرنے والا نہیں ہی نہ ہوا جس نے بیبل سے
سبق نہ لیا ہو۔ اُردو میں بھی گو ابھی تک اس مُلک کے لوگوں نے کوئی خاص
اپنا ترجمہ نہیں کیا ہی تاہم مرزا قادیانی جیسے اپنے خیالوں پر زور دینے کے لئے
جابجا جلی قلم سے لکھ کر بیبل کی آیتوں سے کام لے رہے ہیں۔ کتب مقدسہ کے
ہر ایک زبان سے مناسبت پیدا کر لینے کی وجہ یہہ ہی کہ اُس میں خدا کی ہدایت
وحمایت پائی جاتی ہی جس نے اپنی ربوبیت میں کتب مقدسہ کی اصلی زبانوں
کو ایسے تعلقات سے وابستہ کیا تاکہ وہ ہر ایک زبان سے صحیح مناسبت پیدا
کرے مثلاً نیا عہدنامہ یونانی زبان میں خاصکر کے قلم بند ہوا ہی جس کا مرکز
اُس زمانہ میں خاص یروسلم تھا وہ ایسی جگہ واقع تھا جہاں تین عظیم تہذیبوں
کا آپس میں میل جول تھا یعنے اہلِ یہود۔ اہلِ یونان۔ اور اہلِ روم۔ اِن میں
گویا تمام تہذیبی دنیا تقسیم تھی اور یروسلم اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمایش میں تمام
تہذیبی دنیا کا ایک مرجع یا مرکز یا نمونہ تھا وہاں نہ صرف یہودیوں کی ہیکل کی عمارت
موجود تھی بلکہ رومیوں کے بھی اطبرا اور یونانیوں کا سکہ جاری تھا۔ اُس زمانہ
کے یہودیوں کی زبان میں یونانی اور لاطینی الفاظ رائج و مستعمل تھے۔ قدیم اور
متبرک یہودیت کے ساتھ یونانی اور رومی تہذیبوں کا ایک عجیب وغریب طور

سے اتحاد و ارتباط پیدا کیا گیا تھا۔ اہلِ یہود میں تو اُس پروردگار خدا نے وہ بنیاد ڈالی جس پر دا بردا آئندہ کلیسیا کی عمارت تیار ہونی تھی اِس لئے اُن کے پھیل جانے اور غیروں کے ساتھ سابقہ پڑنے سے انجیلی تخم کے لئے ایک مناسب حال اور عمدہ ترین زمین تیار ہو رہی تھی۔ یونانیوں کی تجارت اور زبان اور علمِ ادب اور فلاسفی کا پھیل جانا مسیحی خیالات کے ظاہر کرنے کے لئے عمدہ ذریعے تھے اور رومیوں کی حکومت اور قانون کی حفاظت میں مختلف صوبہ جات کا باہم متحد ہونا الٰہی دوراندیشی تھی جس کی بدولت اہلِ یہود۔ اہلِ یونان اور اہلِ روم میں باہمی روزمرہ کا سوشل سابقہ پڑنا ممکن ہوا۔ یہہ کل تہذیبیں انجیل کی اشاعت و تلقین کے ذریعے بنے۔ یونانیوں میں تو انسانی ذہن اور قیاس اور تصور نے عمدہ تربیت پائی تھی اور رومیوں کی حکومت کا سلسلہ نہایت ہی عمدہ تھا جسکی بدولت تمام اقوام میں ایک ہیئت مجموعی کا امکان ہوا چنانچہ رومی سلطنت کی بدولت تہذیبی دنیا کے کل حصے ایک ہی سایہ میں الٰہی دوراندیشی سے لائے گئے تھے۔ یہودیوں میں مذہب کی خصوصیت پائی جاتی تھی جس میں عالم اور جاہل دونوں بسہولیت تمام شریک ہو سکتے تھے۔ یونانیوں کی خاصیت یہہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کے ساتھ بآسانی راہ و رسم پیدا کر لیتے تھے۔ سکندر اعظم کے عہد سے لیکر یونانی تہذیب تمام ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اِسی طرح اُن کی زبان بھی تمام ممالک میں کم و بیش مروج تھی اور یہی زبان علمِ الٰہی کی زبان ہو گئی جو مسیحی خیالات کے ادا کرنے کے لئے عمدہ ذریعہ بنی۔ جس طرح آجکل ہندوستان میں قومی اتحاد کا ذریعہ

انگریزی زبان ہے (دیکھو نیشنل کانگرس کی نظیر) ویسا ہی یونانی زبان نے ملکوں میں اتحاد کو پیدا کیا ہوا تھا جس کو خدا نے اپنی ربوبیت میں نئے عہدنامہ کی اشاعت کا ذریعہ بنایا تاکہ انجیل کی بشارت تمام دنیا کے لئے ہوئے اور ایک ہی لہو سے آدمیوں کی سب قومیں تمام زمین کی سطح پر بسنے کے لئے پیدا کیں اور مقرر وقتوں اور اُن کی سکونت کی حدوں کو ٹھہرایا ،، اعمال ۱۷ : ۲۶ ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عین ایسے اتحاد اور ارتباط کے موقعہ پر جسکو انجیلی اصطلاح میں زمانہ کی بھرپوری کہتے ہیں خداوند مسیح کا آنا ہوا۔ اب دیکھا جاسکتا ہے کہ عالمگیر مذہب جو ہر قوم کا حصہ اور ہر ایک خاندان میں مستعمل ہو سکے اور ہر ایک خواندہ و ناخواندہ کی عقدہ کشائی کرے اور اُن کو فیض پہنچا سکے وہی ہو سکتا ہے جس نے انسانی تہذیب کے وسائل کو جو اقوام کے اُنس اور اتحاد اور ارتباط کا باعث ہو سکتے ہیں قبول اور استعمال کیا ہے تاکہ وہ اپنی بالائی اور روحانی تعلیم کو انسانی لباس میں کمال مناسبت کے ساتھ ظاہر کرے۔ مگر قرآن اور وید میں یہہ مناسبت مطلق نہیں پائی جاتی کہ اُن کے خیالات کسی غیر زبان میں اپنا جوہر دکھاویں۔ ایک ہندو نے نہایت ہی درد کے ساتھ فریاد کی اور کہا کہ مشکل تو یہہ ہے کہ ہم کو اپنے مذہب کی معلومات کے بارہ میں اُمّی رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی توجہ بھی دے تو اُس کی تمام عمر سنسکرت کے مطالعہ میں صرف ہو جاتی ہے ورنہ وہ پنڈت یا ودوان ہی ہونے نہیں پاتا۔ یہہ سچ ہے۔ اِسی طرح قرآن کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ہی اُس کا جوہر عنقا کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ وہ تو انسانی خیالات کو سنّت نبوی اور صحابہ کے ڈھانچہ میں مقید

کرتا ہی۔ اُس میں ترقی کو مطلق گنجائش ہی نہیں ہی۔ روم۔ فارس۔ افغانستان نظیر کے طور پر دیکھ لیویں +

اب ہم قرآن کے نفس مضمون کی طرف مخاطب ہوتے ہیں۔ دوسرے باب میں اس امر کا ذکر ہوا ہی کہ الہام میں دو پہلو ہیں کیونکہ الہام حضرت انسان کو خطاب کرتا ہی اور چونکہ الہام کا تعلق انسان سے ہی اور اُسی کی ہدایت اور فائدہ کے لئے ہی اِس لئے وہ اُس سے وہ حسنات اور خوبیاں نکلواتا ہی جو کل بنی نوع انسان کے لئے ایک تقلید کا آئینہ ہوں۔ جب ہم قرآنی اصول الہام کو دیکھتے ہیں تو اُس میں الٰہی پہلو کا تو دعوی بلا ثبوت کیا جاتا ہی مگر انسانی پہلو کا نام و نشان تک بھی نہیں ملتا۔ قرآن تو وحی الٰہی سمجھا گیا ہی۔ اس میں محمد صاحب کا کچھ دخل نہ تھا۔ وہ تو ایک قائم معجزہ سمجھا گیا ہی (دیکھو سورہ قیامہ ۱۶ ویں سے ۱۹ ویں آیت تک) اوّل تو مسلمانوں کا اپنا رویہ اس دعوی قرآن کو باطل ٹھہراتا ہی اور کیوں نہ ٹھہراوے؟ انسانی فطرت اس کی متقاضی ہی کہ وہ الٰہی پہلو کے ساتھ انسانی پہلو کو مربوط اور وابستہ کرے۔ دیکھو جیں قرآن کے علاوہ سنّت نبوی پر بھلا زور دیا گیا ہی اور اُس کو بھی الہامی قرار دیا جاتا ہی۔ خیر اگر محمد صاحب قرآن کے مکمل نمونہ ہیں تو ہم ایک اور طرح سے اُن کے چند اقوال و افعال کو لیکر کتب مقدسہ کے ایک الہامی شخص کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرینگے تاکہ اہل نظر خود اس امر کا فیصلہ کریں کہ کس شخص نے الہامی مدعا کو پورا کیا ہی۔ ہمارے مقابلہ کی صورت یہ ہی +

قرآن مثل تورات محمد مثل داؤد	قرآن میں محمد صاحب کا دخل نہ تھا۔ تورات موسیٰ کو دی گئی اور اُس پر داؤد نے کچھ اضافہ نہیں کیا۔ محمد صاحب قرآن کے عملی نمونہ متصور ہیں + داؤد تورات کا عملی نمونہ ہی +

اوّل ہم یہہ دیکھیں کہ قرآن کی بنیاد پر محمد صاحب نے اپنی زندگی میں انسان کا کیا صحیح اور حقیقی نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہی اور داؤد نے تورات کی بنیاد پر کیا؟ داؤد نے گناہ کیا۔ محمد صاحب نے بھی علیٰ ہذا القیاس اپنے آپ کو بحرِ عصیان میں ڈبویا (دیکھو سورہ مومن و سورۃ الفتح) مگر مقابلہ کرنے کے متعلق یہہ یاد رہے کہ رسالت کا مرتبہ گناہ سے باطل نہیں ٹھہرتا۔ ہاں البتہ شفاعت کا مرتبہ باطل ٹھہرتا ہی اور یہہ جو آیت لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ میں لفظ ذنب بمعنے گناہ ہی جس کو بعض علماء محمدیہ ترک اولیٰ کے معنے سمجھتے ہیں اسپر ڈاکٹر مولوی عمادالدین لاہز مرحوم کا یہہ قول بالکل صحیح ہی کہ "یہہ اُن کا تکلف اُس وقت تسلیم ہوسکتا ہی جب وہ کوئی آیت قرآنی عصمت انبیاء پر پیش کریں اور وَعَصَیٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوَیٰ وغیرہ کے معنے درست دکھلا کے تطابق کریں ورنہ اُن کے عقلی عقیدہ کے ثبوت کے لئے آیت قرآنی میں تاویل کرکے ذنب کو ترک اولیٰ کے معنے ہم کسی طرح نہیں سمجھ سکتے"۔ مرقوم ہی کہ محمد صاحب اپنے متبنّیٰ زید کی جورو کو ایک خاص موقع اور حالت میں دیکھ کر یہہ کلمات منہہ پر لائے کہ سبحان اللہ مقلب القلوب مسیح کے قول کے مطابق وہ اپنے دل میں زنا کر چکے تھے۔ یہہ تو نو بچ سے بھی

ثابت ہے کہ بعد میں اُنہوں نے اُس کے ساتھ نکاح کرنے کی بھی خواہش کی بشرطیکہ
کوئی سبیل ایسی پاویں کہ ننگ وعار سے بچیں۔ محمد صاحب کی بدنظری اور اُس
عورت سے نکاح کرنے کی خواہش سخت گناہ میں داخل تھی اور اس صورت میں
جبکہ آیت مذکور اُن پر نازل ہوئی تھی تو ہم کو آیت کی منشا کی یہہ امید ہونی چاہئے
تھی کہ محمد صاحب سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوگا جسکی ہدایت باری تعالیٰ
سے پہلے ہی نہ آگئی ہو اور خدا اپنی قدوسی کا لحاظ کرکے ہرگز انسانی رغبت
کے مطابق اپنی ہدایت نہیں کریگا بلکہ جب گناہ محمد صاحب سے ظہور میں آیا تو وہ
اپنے بندہ کو ایسی ہدایت دیگا کہ وہ اپنے گناہ کو پہچان کر ایک ایسا ندامت کا حقیقی نقشہ
جو ہر ایک انسان کے لئے ایک عمدہ نمونہ اور نشان عبرت ہو دکھلائیگا مگر اسکے برعکس
ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ محمد صاحب پر ایک ایسی آیت نازل ہوتی ہے جو عین اُن کی
دلی رغبت کو پورا کرتی ہے چنانچہ مرقوم ہے کہ جب تو کہنے لگا اُس شخص کو جسپر اللہ نے
احسان کیا اور تو نے احسان کیا کہ رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو کو اور ڈر اللہ
سے اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز جو اللہ اُس کو کھولا چاہتا ہے اور ڈرتا
تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہئیے ڈرنا تجھہ کو (دیکھو سورہ احزاب رکوع ۵)
پھر لکھا ہے کہ جب زید تمام کرچکا اُس عورت سے اپنی غرض ہم نے وہ تیرے نکاح
میں دی۔ یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ محمد صاحب کو اپنے گناہ کی حقیقت معلوم
نہیں ہوئی اور نہ ہی اُنہوں نے مناسب حال پہلو خدا کے سامنے اختیار کیا اور
نہ ہی خدا کی قدوسی کا لحاظ رکھا کہ وہ کس نگاہ سے گناہ کو دیکھتا ہے۔ بعینہ اسی قسم

کا واقعہ داؤد کی نسبت کتب مقدسہ کی تواریخی کتاب میں مذکور ہی کہ اُس نے بھی ایک
شخص اُوریاہ نامی کی عورت پر فریفتہ ہو کر اُس کو اپنے محل میں بلوالیا اور اُس سے
ناشائستہ فعل کیا اور اُس پر بھی قناعت نہ کی بلکہ جب حاملہ ہوئی تو اُس کے شوہر
کے مروا ڈالنے کا باعث ہوا۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہی کہ داؤد نے اپنی غرض
اور رغبت کو شہوانی خیال کے غلبہ پا جانے سے بلا کسی کی ہدایت کے پورا کیا۔ اگر
داؤد کے زمانہ کا لحاظ کیا جاوے تو عموماً اُس زمانہ کے لوگ مختلف اعمال مذمومہ
وخیالات قبیحہ کو ابتک گناہ کی صورت میں نہیں دیکھتے تھے۔ داؤد تو بادشاہ
تھا اور اپنی رعایا پر پوری حکومت رکھتا اور بہت عورتوں کا مالک تھا اور اُن کو
اپنے حرم میں داخل کرنا زمانہ کے دستور کے مطابق سمجھتا تھا اور اس لئے اُوریاہ
کی عورت کو منگوا بھیجنا اُس نے چنداں بُرا نہ سمجھا ہوگا مگر خدائے قدوس ایسے
شخص پر جو اُس کی مرضی پر چلنے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتا ہی الہام کے ذریعہ
سے اپنی قدوسی کو قائم کر کے گناہ کی کراہیت کو ظاہر کرتا ہی۔ چنانچہ ناتن نبی کی
معرفت داؤد پر گناہ مذکور کی زبونی اور کراہیت ظاہر کی جاتی ہی اور جوں ہی
گناہ کی خباثت اُسکو نظر آنے لگتی ہی وہ فوراً پشیمان اور نادم ہوتا ہی۔ ایکطرف
تو خدا اُس پر گناہ کو ظاہر کر کے اُس کو بری نہیں ٹھہراتا بلکہ مناسب حال سزا
دیتا ہی اور دوسری طرف داؤد خود اپنے گناہ کو دیکھتا اور مان لیتا ہی اور یہہ
کہتا ہی کہ میں خداوند کا گنہگار ہوں اور جب سے نبی کی معرفت اُس کو اپنا
حقیقی عرفان ہوتا ہی تب سے اُس کے دل میں حقیقی توبہ کا بیج پڑ جاتا ہی جو بڑھتے

بڑھتے ۱۵ ویں زبور میں شجر کی صورت میں نظر آتا ہی۔ داؤد کی حالت گناہ سے
آگاہی پانے کے بعد اُس کے زبوروں سے ظاہر ہوتی ہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں
کہ پہلے وہ چپ چاپ رہتا ہی اور ممکن ہی کہ کوئی نہ کوئی عذر گناہ سے چشم پوشی کرنیکا
اُس کے دل میں گذرتا ہو۔ اب اپنے گناہ کی نجاست کو معلوم کر کے ۳۲ ویں زبور
میں وہ کہتا ہی۔ "کہ جب میں چپ رہا تو میری ہڈیاں سارا دن کراہتے
کراہتے گل گئیں کیونکہ تیرا ہاتھ رات و دن مجھ پر بھاری تھا الخ" اور
پھر حقیقی تائب و نادم ہوکر ۱۵ ویں زبور میں کہتا ہی "کہ میں اپنے گناہوں کو مان
لیتا ہوں اور میری خطا ہمیشہ میرے سامنے ہی" حتّٰی کہ گناہ کی حقیقت اور
تہ تک پہنچتا ہی وہ گناہ کے ظاہر اعمل پر ہی نگاہ نہیں کرتا بلکہ باطن میں نگاہ ڈالتا
ہی اور صاف لفظوں میں کہتا ہی " دیکھ میں نے برائی میں صورت پکڑی اور
گناہ کے ساتھ میری ماں نے مجھے پیٹ میں لیا" اور اسی طرح نیکی کو
بھی ظاہر آنکھوں سے نہیں دیکھتا بلکہ یہہ کہتا ہی " دیکھ تو اندر کی سچائی
چاہتا ہی سو باطن میں مجھ کو دانائی سکھلا . . . . مجھ کو دھو کہ میں
برف سے زیادہ صاف ہو جاؤں" داؤد کی سرگذشت سے ہم کو ایک
ایسا شخص نظر آتا ہی کہ جس کے ایمان میں حقیقت تھی اور جس کی دینداری اعلیٰ

درجہ کی تھی۔ اُس میں صدق دلی پائی جاتی ہے۔ اُس کے زبوروں سے ہم کو اُس کا دل
خدا کی قربت کی طرف پوری طرح راغب اور مائل اور مصروف نظر آتا ہے۔ اُس میں
ہم ایک اصلی انسان کو دیکھتے ہیں جو توبہ کی حالت میں کمال عاجزی۔ انکساری۔
ندامت اور پشیمانی دکھلاتا ہے ایمان میں مستحکم اور پائدار نظر آتا ہے۔ برعکس اس کے
محمد صاحب کی سرگذشت سے ہم کو ایک اصلی اور حقیقی انسان نظر نہیں آتا بلکہ ایک
ایسا مطلق العنان حاکم نظر آتا ہے جو اپنے لئے سب کچھ اور خصوصاً اپنے کردار کو
جائز ٹھہراتا ہے۔ جو گناہ کو گناہ کی صورت میں نہیں دیکھتا۔ اگر محمد صاحب نے
اپنی حالت کو واقعی پہچانا ہوتا تو قرآن کی صورت ہم کو کچھ اور ہی نظر آتی۔ داؤد
پر جب گناہ آشکارا کیا جاتا ہے تو وہ اپنے گناہوں کو مان لیتا ہے مگر محمد صاحب
اپنے افعال مذمومہ اور خیالات فاسدہ کو گناہ کے نام سے ہی تعبیر نہیں کرتے
ہم نے کانشنس کے متعلق پہلے باب میں یہہ دکھایا تھا کہ کس طرح انسان رفتہ رفتہ
اپنی ضمیر پر پردہ ڈال کر اُس کو خستہ کر ڈالتا ہے حتیٰ کہ بُرے کو بُرے سے تعبیر کرنا
بھول جاتا ہے اور ایسے عذرات پیش کرنے لگ جاتا ہے جن کی بدولت کانشنس کا
فیصلہ اپنے حق میں حسب خواہش کروالیتا ہے۔ بعینہ یہہ حال محمد صاحب کا تھا آپ
نے اپنی کانشنس کی مذمت و ملامت سے طرح دیکر بلکہ اُسپر ملمع چڑھا کر اپنا پیچھا
چھڑایا اور ایسے عذرات پیش کئے جن سے ایک قسم کی خام تسلی اُن کے دل میں پیدا
ہوتی ہوگی کیونکہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اپنی نسبت قرآنی خبر دربارہ
مغفرتِ گناہ پاکر بھی (دیکھو سورۃ الفتح) رات و دن رویا کرتے تھے +

سورۂ احزاب کے اقتباس کردہ فقرہ سے یہہ صاف ظاہر ہوتا ہی کہ جب آپ زینب پر فریفتہ اور بے دل ہوئے اور یہہ کلمات مُنہہ پر لائے کہ فتبارک اللہ احسن الخالقین تو زید اس سے باخبر ہو کر خوف یا اخلاص کے لحاظ سے زینب کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ محمد صاحب اس فعل سے اُسکو منع کرتے ہیں مگر بالکل ظاہری طور سے۔ لیکن زید آپ کی منشاء کو بخوبی سمجھتا تھا۔ آیت مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہی کہ آنحضرت اپنے آپ کو نہ صرف اس بات میں محسن بتاتے ہیں کہ زید کو مشرف باسلام ہونے کی اجازت اور توفیق بخشی اور اپنا متبنیٰ بنایا بلکہ اِس میں بھی کہ آپ نے زید کو زینب سے جدا ہونے سے منع کیا۔ یہہ عرب کے لوگ اِس ماجرا کو سُنکر محمد صاحب کی طرف سے شاکی ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے زمانہ کی عادات اور آداب اور حیا کے لحاظ سے محمد صاحب کا یہہ فعل یعنے متبنیٰ کی بیوی کو اپنے نکاح میں لانا ناجائز تھا اب وہ عشق کو چھپاتے ہیں اور بدنامی سے بچنے کے لئے پہلے سورۂ احزاب کی چوتھی آیت نازل ہوتی ہی کہ اُس سے لوگوں کے عام اعتراضات رفع کئے جائیں یعنے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیپالکوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا۔ پھر اپنے حق میں زینب کے ساتھہ نکاح کرنے کی آیت کا محل پہنچا جو سورۂ احزاب کے ۵ ویں رکوع میں مندرج ہی جسمیں اللہ حرام کو حلال ٹھہراتا ہی۔ محمد صاحب کا زید کی عورت پر بد نظری کرنا گناہ تھا۔ اور پھر مذکورہ بالا احسن آمیز و عشق انگیز کلمات کو استعمال کر کے زینب کو یہہ جتانا بھی کہ آپ اُسپر فریفتہ و عاشق ہو گئے گناہ تھا۔ پھر عشق کا چھپانا اور عذرات کا پیش کرنا تیسری صورت گناہ کی تھی اور پھر زینب کو نکاح میں لانا اور عرب کے

اخلاق کا کچھ لحاظ نہ رکھنا چوتھی صورت گناہ کی تھی اور پھر نکاح کا شرعاً عمل میں نہ لانا پانچویں صورت گناہ کی تھی اور پھر چونکہ زینب آپ کی پھوپھی آمنہ کی بیٹی تھی اور کسی مسلمان کو پھوپھی کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا شرعاً جائز نہ تھا اُس کو وحی کے وسیلہ سے (دیکھو سورۂ احزاب کا چھٹا رکوع) اپنے حق میں خاص طور پر جائز ٹھہرانا یہہ چھٹی صورت گناہ کی تھی اور پھر محمد صاحب کا سخت دلی کی وجہ سے نادم نہ ہونا اور اپنے گناہوں کا اقرار نہ کرنا بھی سخت گناہ تھا۔ پھر آنحضرت اپنے زمانہ کی اخلاقی حالت کے لحاظ سے بھی معذور نہیں کئے جا سکتے۔

داؤد امتحان میں پڑا مگر لکھنے والے نے اُس کی کیفیت بیان کرنے میں نہ تو اُس کے گناہ کو چھپایا ہی اور نہ گناہ کے لئے کوئی عذرات پیش کئے ہیں اور نہ گناہ کو پاکیزگی کے لباس میں دکھایا ہی بلکہ داؤد کے گناہ کو گناہ کہا گیا ہی مگر محمد صاحب کی کیفیت زندگی میں نہ مورخ نے نہ خود آنحضرت نے گناہ کو گناہ کہا ہی بلکہ گناہ پر پردہ پوشی کی ہی۔ نہ صرف پردہ پوشی بلکہ اُلٹا اُسکو پاکیزگی کے لباس میں ظاہر کر کے جائز ٹھہرایا ہی۔ داؤد میں ہم ایک حقیقی انسان کو دیکھتے ہیں۔ اُسکی زندگی انسان کی اصلی حالت کو ظاہر کرتی ہی۔ اُس میں سخت دلی نہیں پائی جاتی۔ داؤد ایسا نظر آتا ہی جس میں کوئی چھل بل نہیں ہی پر محمد صاحب ایک حقیقی انسان نظر نہیں آتے ہیں بلکہ اُن کی زندگی میں ریاکاری اور سخت دلی پائی جاتی ہی۔ اب ناظرین خود غور فرمائیں کہ ایسی صورت میں کونسا شخص ہماری تقلید کے لئے نمونہ ہی کہ ہم اُس کے نقش قدم پر چلیں؟

یہہ بھی یاد رہے کہ محمد صاحب کی تقلید کرنا از روئے قرآن کیا معنے رکھتا ہی۔ یہہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ مسیحی معنے میں تقلید کرنا کسی کے نقشِ قدم پر چلنا ہی مثلاً جب ہم یہہ کہتے ہیں کہ مسیح ہمارے لئے تقلید کا نمونہ ہی تو اس کے یہہ معنے ہیں کہ ہمارا مسیح کے نقشِ قدم پر چلنا امکان سے ہی اور اسکو اپنا اندازہ اور معیار سمجھہ کر ہم روز بروز ترقی کرکے اُس کی زندگی سے ملبس ہوتے جاتے ہیں مگر قرآنی تقلید محمدی کے یہہ معنے ہیں کہ ہم رسول کے مطیع ہوں۔ اُس کے حکموں پر چلیں۔ وہ حاکم ہو اور ہم محکوم ہوں۔ ہم بشر وہ سید البشر۔ وہ مالک ہم غلام۔ وہ دسترخوان پر سے کھاوے اور ہم گرے ہوئے ٹکروں پر گذارہ کریں۔ وہ اوصاف حمیدہ سے متصف ہوں اور ہم اُنکے ثنا خوان اور معذرت کرنے والے ہوں۔ وہ جو کچھہ حکم کریں ہم اُسکو بے چون وچرا بجا لائیں۔ وہ اگر سفید کو سیاہ کہیں اور سیاہ کو سفید تو بلا حجت مان لیں وغیرہ +

عرفان خدا جس کے محمد صاحب دعویدار تھے اُس کے بیان کی نسبت طول دینے کی ضرورت نہیں مگر اُن کا عرفان خدا کی نسبت اُس کی شان کے شایاں نہیں تھا۔ سورۂ شعرا کے دسویں رکوع میں مرقوم ہی کہ نزل به الروح الامین علی قلبك یعنے قرآن نازل کیا ہی آمین کی روح نے۔ مفسرین قرآن عموماً روح القدس اور روح الامین دونوں سے جبرائیل مراد لیتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہی کہ قرآنی الہام کا نازل کرنے والا ایک فرشتہ ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبیوں کی روحوں یا دلوں میں مضامین الہام کا القا کسی فرشتہ کا کام نہیں بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی روح کا کام ہی۔ الہام خدا اور انسان کے درمیان ایک ذریعہ توصل ہی وہ انسانی پہلو میں حضرت

انسان سے خطاب کرتا ہے انسان خدا کی صورت اور شکل پر بنایا گیا تھا اور گو گناہ کی وجہ
سے وہ خدا کی قربت سے محروم ہوا اور نفسانی خواہشوں میں مبتلا ہو کر آزادسے غلام
بنا اور انسان سے حیوانی خصائل والا قرار پایا تاہم خدا نے اپنے فضل کا دروازہ
ہمیشہ کے لئے اُس کے سامنے مسدود نہیں کر دیا بلکہ اپنے الہام کے ذریعہ نبیوں
کے قلبوں میں داخل ہوتا رہا تاکہ انسان از سرِ نو اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر توبہ
اور اطاعت کی راہ سے خدا کے پاس آنا سیکھے اور اُس کی قربت حاصل کر کے
انسانی منصب اور مرتبہ میں بحال ہو جاوے۔ لیکن یہہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ
الہام اور قلب نبی کے درمیان فرشتہ کا آنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اس سے صاف
صاف معلوم ہوتا ہے کہ محمد صاحب کوئی الہامی شخص نہ تھے بلکہ اُن کو کسی قسم کی
بھی قربتِ حقیقی خدا کے ساتھ حاصل نہیں تھی۔ اُن کا اللہ ایک ایسا خدا تھا
جو اُن کی مرضی پر چلتا تھا اور اپنے اقوال میں اُن کی مرضی کا متبوع اور پابند تھا
جیساکہ قرآن کی ناسخ اور منسوخ آیات سے ثابت ہے۔ ناسخ اور منسوخ آیات میں اگر
ایسا بھی پایا جاوے کہ خصوصیتِ تعلیم سے ناسخ آیات بجانب عمومیت انسان کو
راجع کرتی ہوں تب کچھ عذر کی گنجایش ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت میں تو قرآنی منسوخ
اور ناسخ آیات میں تناقض اور اختلاف پایا جاتا ہے دیکھو کتاب منار الحق باب
سوم۔ اِن میں تو دل کی تبدیلی سے قول کی تبدیلی ہوتی ہے۔ کوئی خواہش قلبی حکم
کو بدل ڈالتی ہے جس طرح لڑائی اور غارت کی خواہش امن اور صلح کی آیات کو جنگ
وجدل کی آیات سے منسوخ کر ڈالتی ہے۔ طرفہ یہہ ہے کہ فعل نسخ سے پہلے واقع ہوتا ہے

نہ نسخ فعل سے پہلے مثلاً پہلے حکم عدولی اور بعد میں حکم کی منسوخی کی آیت نازل
ہوتی ہی۔ چنانچہ ماہ محرم میں لڑائی کی ممانعت اور بعد میں جب عبد اللہ بن حجش
رسدی نے اس ماہ میں لڑائی کی جو اہلِ عرب کا ماہ رجب العرب یا ماہ حرام کہلاتا
تھا تو پہلے محمد صاحب نے صاف انکار کیا اور کہا کہ ماہ حرام میں ہم نے لڑائی کا حکم
نہیں دیا اور پھر جب دیکھا کہ اس سے لوگوں کی تسلّی نہیں ہوئی تو آیتِ ناسخ سورہ
بقر رکوع ۲۷ لڑائی کی تائید میں نازل ہو کر نہی کو امر اور ممنوع کو مباح ٹھہراتی ہی
اسی طرح سورۃ التحریم کی پہلی آیت میں مرقوم ہی کہ ای نبی تو کیوں حرام کرتا ہی جو حلال
کیا اللہ نے تجھ پر۔ چاہتا ہی تو رضامندی اپنی عورتوں کی اور اللہ بخشنے والا ہی
مہربان۔ ٹھہرا دیا ہی اللہ نے تم کو کھول ڈالنا تمہاری قسموں کا۔ اور اللہ صاحب
ہی تمہارا اور وہی ہی سب جانتا حکمت والا۔ کتاب حیات القلوب کے مطابق اس
آیت کا شانِ نزول یہہ ہی کہ حفصہ کی نوبت کے دن میں محمد صاحب نے اپنی
لونڈی ماریہ قبطیہ سے مقاربت کی تھی اور جب حفصہ خفا ہوئی تو محمد صاحب نے شرمندہ
ہو کر فرمایا کہ اس بات سے درگذر کر ماریہ کو اب سے میں نے اپنے نفس پر حرام ٹھہرا دیا ہی مگر
بعد میں آیت مذکورہ کی تائید پر پھر اُس کو جائز ٹھہرا دیا۔ کچھ عجب نہیں کہ ڈاکٹر عماد الدین
صاحب مرحوم نے اپنی کتاب تحقیق الایمان میں نہایت درد سے یہہ کلمات
لکھے کہ "کبھی خدا نے یہہ نہ کہا کہ ای محمد کیوں زید کی جورو کا عشق تیرے دل میں
پیدا ہوا؟ اس سے باز آ۔ کیوں عورتوں کا شوق از حد دل میں رکھتا ہی؟ توبہ
کر کے روحانیت کی طرف توجہ کر۔ بخلاف اس کے جس طرف نفس امارہ توجہ کرتا گیا اُسی

طرف لیجانے کے لئے ایک آیت مبارک نازل ہوتی گئی"۔ اس سے دو باتیں نکلتی ہیں اول یہہ کہ محمد صاحب کا عرفانِ خدا نہایت ہی ناقص تھا۔ وہ تو اپنے وقت کو چند بیویوں اور لونڈیوں کی رضا مندی میں صرف کرتے تھے اور علاوہ اس کے ملکی تدابیر اور سیاستی امور میں اُن کا بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ یہہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ امورِ آخرت میں مصروف ہو سکیں ؟ بقول مسیح دو خاوندوں کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ دوم خدا کو رحیم اور غفور جاننا قرآن کی بہت سی آیات میں پایا جاتا ہی اور اس کا مفہوم یہہ ہی کہ اللہ نہ صرف گناہ سے درگذر کرتا ہی بلکہ اُلٹا گناہ پر رضامندی ظاہر کرتا ہی۔ اگر ناظرین ہمارے بیانات متعلق کانشنس بغور پڑھیں تو ظاہر ہوگا کہ محمد صاحب کی کانشنس کی بہت بُری حالت تھی۔ خدا نے ایک بڑی بھاری بنیاد شریعت کی ہمارے دل میں ڈال دی ہی اور ہماری روح کی صحت اور تندرستی کی یہی نشانی ہی کہ ہم پابندِ شریعت اور شارع کی اطاعت کا بھی لحاظ رکھتے ہوں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو بدی کے دیرپا تسلط سے اپنی کانشنس کی منشا کو دبا کر اپنے حق میں کوئی نہ کوئی حسب خواہش عمدہ فیصلہ کروا لیتے ہیں خستہ کانشنس کی یہی صورت ہوتی ہی صحیح کانشنس کے فیصلوں کے بارہ میں دیکھو باب اول۔ عموماً انسان مناسب اور نامناسب کی تمیز تو کرتا ہی مگر خطاکار اور مستوجب سزا ہونا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہی کہ خدا کو کریم اور رحیم کہہ کے اُس کی عدالت اور قدوسی سے اپنا مُنہہ چھپاتا ہی۔ محمد صاحب کی یہی حالت تھی دیکھ لیویں وہ خدا کو رحیم اور غفور بہت ایسی آیتوں میں کہتے ہیں (دیکھو سورہ بقرا ۲۶ واں رکوع۔ سورہ مائدہ پہلا

رکوع ۔سورۃ التحریم پہلی آیت) جن کے پہلے اُن سے یا اُن کی امت سے بدافعال سرزد ہوتے ہیں اور وہ یہہ کہکر کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہی جائز ٹھہرائے جاتے ہیں گویا اس خام بنیاد پر خدا کی قدوسی سے منہہ چھپایا جاتا ہی اور اُسکی رحمت اور مغفرت کا پلہ پکڑا جاتا ہی ۔ یہہ سچ ہی کہ انسان واجب اور غیر واجب کی صحیح تمیز کرتا ہی مگر اُسکے اخلاقی فیصلوں میں اختلاف پایا جاتا ہی ۔ سچ بولنا کیا ہی ؟ اس کیفیت کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا ۔ اگر ہم سے پوچھا جائے کہ کیا قرآن میں کوئی عمدہ تعلیم نہیں پائی جاتی ؟ تو ہمارا جواب یہہ ہی کہ بے شک پائی جاتی ہی ۔ خیانت نہ کرنا ۔ سخاوت ۔ دیانتداری وغیرہ وغیرہ کی عمدہ تعلیم قرآن میں موجود ہی مگر ہماری جرح وطعن قرآن اور محمد صاحب کی تعلیم پر یہہ ہی کہ غیر واجب فعل کیا ہی ؟ اِس میں عموماً اُن کا فیصلہ صحیح نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہہ ہی کہ جب انسان کے اندر کانشنس کی تحریک کے علاوہ احساس اخلاقی اور جذبات بھی عمل میں آتے ہیں اور اُس کو کسی فعل کے ارتکاب کی طرف مائل کرتے ہیں تب وہ اُس فعل کی پاسداری کرکے کوئی نہ کوئی حیلہ یا عذر تراشتا ہی حتیٰ کہ غیر واجب فعل کو واجب قرار دیا جاتا ہی اور وہ رفتہ رفتہ واجب کی صورت میں روا رکھا جاتا ہی اور اس قسم کے غیر واجب افعال واجب کی صورت میں ایسے خصائل پیدا کر دیتے ہیں جو واجب اور غیر واجب کی تمیز کو بالکل اُٹھا دیتے ہیں ۔ یہہ تو سچ ہی کہ محمد صاحب نے اپنی اُمت کو سچ بولنے اور حلم ۔ بردباری ۔ انصاف اور دیانتداری وغیرہ کی نسبت عمدہ ہدایت کی ہی پر ساتھہ ہی ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ خیانت اور دروغ گوئی اور

قسموں اور معاہدوں کا توڑنا اور خود غرضی اور ظلم جائز رکھنے اور شریعت کے پابند نہ ہونے اور خدا کو مقدم نہ رکھنے کے قرآن میں بیسیوں عذرات پیش کئے گئے ہیں نکاح کو محمد صاحب نے جائز ٹھہرایا ہی اور زناکاری کو بُرا کہا ہی اور اس لئے عرب والوں کے اخلاق پر اُن کے اخلاق کو ترجیح دیتے ہیں ہم کو مطلق انکار نہیں لیکن شہوت پرستی کے لئے بہت کچھ عذرات پیش کئے گئے ہیں۔ محمد صاحب کی قوتِ انصاف نفسانی آلائش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کمزور اور خستہ ہو گئی تھی اُن میں ایسے خصائص اور خصائل پیدا ہو گئے تھے جو اُن کو ایسے افعال قبیحہ کی طرف ترغیب دیتے تھے جن سے کانشنس اتفاق نہیں کر سکتی۔ مثلاً محمد صاحب میں حسد اور خود غرضی اور شہوانی خیالات پائے جاتے تھے جو اُن کے ضمیر کے برخلاف ترغیب دیتے رہتے تھے اور جن کے عمل میں لانے کے لئے وہ کوئی نہ کوئی آسمانی سند پیش کر دیتے تھے محمد صاحب نے یوں تو امن اور صلح کی تعلیم دی اور نکاح کو جائز رکھا مگر ظلم اور جبر اور شہوت رانی کو خدا کے راستہ میں اخلاق پسندی جہاد اور نکاح کے نام سے تعبیر کر کے کانشنس سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ کیا وجہ ہی کہ محمد صاحب کی چال چلن باوجودیکہ ہرگز نبوت کے مدعی کو زیبا نہیں اور باوصف اِس کے کہ مسلمانوں پر یہ روشن ہی کہ شہوت پرستی اور خون ریزی محمد صاحب کے سوانح عمری کے جزو اعظم تھیں تو بھی متاخرین اور حال کے بڑے بڑے محمدی علماء اُن کے لئے عذر خواہی کرتے اور اُن کے عادات قبیحہ کو محامد گردانتے آئے ہیں؟ اِس کا سوائے اِس کے اور کوئی سبب نہیں ہی کہ اُن کی

ضمیریں بھی بگڑی ہوئی ہیں۔ وہ آبائی خیالات کے جو نسلاً بعد نسلٍ رواج پا گئے
ہیں اور جن کو وہ خود تحقیق کئے بغیر سچ اور صحیح مانتے چلے آئے ہیں اُن کے بندے
ہیں اور سچائی کی سبیل نہ پاکر اندھیرے میں چل رہے ہیں۔ اُن کے احساس اخلاقی
غلط فیصلوں کو آمنّا وصدقنا کرتے کرتے جھوٹ کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ محمد صاحب
کی خطاؤں اور گناہوں کو بھی ثواب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کو خصائص نبوی
بتلاتے ہیں ؛

پھر جب یہہ دیکھا جاتا ہی کہ حضرت جبرائیل جب وحی لاتے تھے تو بہت سے
فرشتے بطریق پاسبانوں اور چوکیداروں کے اُن کے ہمراہ ہوتے تھے تفسیر درّی سے
معلوم ہوتا ہی کہ خدا کو رسول ملکی یعنے اس جلیل القدر فرشتہ کا بھی اعتبار نہیں تھا
اسواسطے ملائکہ کی نگہبانی کی ضرورت پڑتی تھی تاکہ جیسا اعجاز قرآن میں ماسٹر رامچندر
صاحب مرحوم نے شاہ عبد العزیز صاحب کی تفسیر عزیزی کا حوالہ دیکر بیان کیا ہی کہ
جبرائیل کی قوائے وہمیہ اور فکریہ اور خیالیہ اور عادات اور اخلاق کو وحی پہنچانے کے
وقت معطل کیا جاتا تھا تو ثابت ہوتا ہی کہ مذکورہ بالا قوائے کا غلبہ ضرور جبرائیل پر
ہوتا ہوگا۔ ہم نے الہام کے متعلق (دیکھو باب دوم) یہہ کہا تھا کہ الہام کے لینے
کے وقت نبی خدا کی پوری اطاعت اختیار کرتا تھا۔ وہ اُس حالت میں فضل کا
بندہ ہوکر اپنے کانوں اور آنکھوں کو دنیا سے بند کرتا تھا اور صرف خدا کی سُنتا تھا اور
اس طرح روح القدس کی وساطت سے سب احکام الٰہی اُس کے دل پر کالنقش
فی الحجر ہو جاتے تھے مگر قرآنی القا و وحی میں ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ جلیل القدر فرشتہ

جبرائیل کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا ہی پھر بھلا رسولِ بشری اور اُن فرشتوں کا جو جبرائیل
سے کہیں کم درجے کے تھے کیا اعتبار ہو سکتا ہی؟ یاد رکھنا چاہئے کہ کل ملائکہ مطہرین
جو مقربین درگاہ الٰہی ہیں توہمات اور خیالاتِ بے اصل سے صاف اور پاک ہیں اور جو
خیالات اُن کے دلوں میں آتے ہیں وہ موافق مرضی الٰہی کے ہوتے ہیں نہ کہ واہیات
اور لغو اور بے بنیاد۔ کیونکہ وہ خدا کے فضل کے زیر سایہ ہیں۔ انبیاء الٰہی اور ملہموں
کا بھی یہی حال ہی۔ اُن کی عادت اور خوشی اور طبیعت اور سرورِ قلبی یہی ہی کہ خدا کی
مرضی بجا لائیں۔ چونکہ وہ اس درجہ کے ہیں اس لئے وہ ہماری پوری تقلید کا
باعث ہو سکتے ہیں۔ محمد صاحب اور اُن کے جبرائیل کی وحی جس میں اُن کا کچھ
بھی حصہ نہیں تھا۔ اول تو وہ ایک انہونی اور استثنائی صورت الہام کی ہی اور
دوم اُس سے ہمارا کسی قسم کا بھی علاقہ نہیں ہو سکتا ہی جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں؛
اگر محمد صاحب کا عرفانِ خدا اُن قرآنی آیتوں میں دیکھا جاوے جن میں وہ توحید
الٰہی کی شہادت دیتے ہیں تو اُن کے کلام میں وہ سنجیدگی اور متانت نہیں پائی
جاتی ہی جو حقیقت مضمون کا پورا پورا انکشاف کرے۔ ہمارا مطلب یہہ ہی کہ کسی حقیقت
کو الفاظ میں بیان کرنے کے لئے یہہ دیکھنا ضروری ہوتا ہی کہ آیا وہ انسان کے
دل کی تہ سے نکلا ہی یا نہیں اگر تہ سے نکلا ہی تو نتیجہ یہہ ہوتا ہی کہ نفس مضمون کا طرز
بیان عین اُس کے زیبا اور موزوں ہو جاتا ہی یعنے برجستہ سنجیدہ اور پر از صداقت و مناسبت
جس کو انشا کے لحاظ سے عمدہ اور نفیس کہا جاتا ہی۔ مثلاً توحید کے بارہ میں قرآن کی
سورہ نحل کے دوسرے رکوع کو ملاحظہ کریں۔ وہاں مرقوم ہی کہ خدا وہ ہی جس نے آسمان

سے پانی اُتارا۔ اُس سے تم پیتے ہو اور اُس سے درخت ہوتے ہیں جہاں تم جانور چراتے ہو۔ اُس سے تمہارے لئے زراعت اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے اُگاتا ہی۔ اہل فکر کے لئے اُس میں نشانی ہی اور تمہارے لئے رات و دن اور سورج اور چاند کو اُس نے مسخر کیا اور ستارے اُس کے حکم کے تابع ہیں۔ اہلِ عقل کے لئے اس میں نشان ہیں اور جو اُس میں تمہارے لئے زمین پر مختلف رنگوں کی چیزیں پھیلائی ہیں اُس میں اہل فکر کے لئے نشان ہیں۔ وہ ہی جس نے دریا کو قابو کیا تاکہ تم اُس سے تازہ گوشت کھاؤ۔ اور اُس میں سے زیور نکال کے پہنو اور تو دیکھتا ہی دریا میں کشتیاں چلتی ہیں تاکہ تم اُس کے فضل سے معیشت طلب کرو اور کہ تم شکر گذار رہو۔ اُس نے زمین میں پہاڑوں کو اس لئے ڈالا کہ وہ تمہیں لیکے ہل نہ جائے اور نہریں اور سڑکیں ہیں کہ شاید تم راہ پاؤ...... اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرو اُنہیں گھیر نہ سکوگے بیشک اللہ بخشندہ مہربان ہی +

ہم نے سورہ نحل کا وہ رکوع پیش کیا ہی جس پر اکثر محمدی علما نازاں ہیں اور بڑے کرّ و فر اور فخر کے ساتھ آیات مذکورہ کو پیش کیا کرتے ہیں۔ یہ تو سچ ہی کہ اُنمیں صحیح صحیح توحید کی شہادت پائی جاتی ہی مگر اُس توحید کا اثر خود محمد صاحب کے اپنے دل میں کیا ہی؟ اُس کا نشان تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بیشک ہر ایک اہل فکر کے لئے نیچر میں خدا کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر جب اہل فکر اُن میں واقعی فکر دوڑاتا ہی تب اُس کی متخیلہ اور جذبات اور حرکاتِ باطنی اور احساس ذہنی اور اخلاقی وغیرہ تمام قوائے متحرک ہوتے ہیں اور وہ ایک ایسا خاکہ توحید کا الفاظ میں اُتارتا ہی جو کل بنی نوع

انسان کے لئے جو فکر سے کام لیتے ہیں پوری طرح سے موثر ہوتا ہی مثلاً مقابلہ کے لئے اول آٹھواں زبور دیکھو۔ اُس میں نیچر کے ظہور میں خدا کی تعریف کیجاتی ہی۔ سورج چاند اور ستارے۔ خلقت کا ضابطہ اور جلال بجلی کی چمک دمک اور رعد کی کڑک ان سب میں ایک زندگی کا دم پھونکا گیا ہی اور خدا کی حضوری کو جس سے ملہم کی روحانی زندگی وابستہ ہی رو برو اور بے پردہ کرکے دکھایا گیا ہی۔ گویا نیچر خدا کے ظہور سے پُر ہی اور تمام چیزیں اُسی کی ہیں اور اُسی کی وساطت سے ہیں اور اُسی کے واسطے ہیں گویا سورج اور چاند اُسی کے گواہ اور قاصد ہیں۔ روشنی اُسی کا لباس ہی۔ بادل اُسی کی سواری ہی۔ رعد کی کڑک اُسی کی آواز ہی بجلی کے چمکارے اور جھمکیں اُسی کی تیغ و سپر ہیں اور بدون خدا کے نیچر ویران اور سنسان ہی۔ اسی طرح سے ۱۰۴ زبور ملاحظہ فرمائیں جس میں موسوی بیان پیدائش کو موجودہ زندہ حالت میں کمال ایمان اور الفاظ کی برجستگی میں بیان کیا ہی جسکو پڑھکر ہم ایک طرف تو خدا کے کاموں کی تعریف کرنا سیکھتے ہیں اور دوسری طرف خود خدا کو بحیثیت خالق و مالک دیکھتے ہیں۔ یہہ زبور گویا کل مخلوقات کے ضابطہ کا ایک صحیح نقشہ ہی۔ عدم گنجائش کی وجہ سے متذکرہ بالا زبوروں کو اقتباس نہیں کیا لیکن ناظرین خود اُن زبوروں کو پڑھکر دیکھیں تو ضرور ہمارے بیان کی تصدیق ہوگی اور سورہ نحل کی خشک بیانی اور پھیکا پن زبوروں کے مقابلہ میں صاف صاف ظاہر ہوجاویگی۔ زیادہ فافہم یا اولی الابصار +

باب چہارم

ہندو مذہب

جو کچھ باب دوم میں بیان ہوا اُس سے یہہ ظاہر ہوا ہوگا کہ خدا کے اظہار الہام میں دو پہلو ہیں یعنے الٰہی پہلو و انسانی۔ الٰہی پہلو میں خدا حضرت انسان سے خطاب کرتا ہی۔ یعنے وہ سچائی کو پیش کرتا ہی اور سچائی کی تصدیق بھی باہم پہنچاتا ہی مگر الہام کی معرفت اور عرفان حاصل کرنے کے لئے وہ انسان سے اطاعت طلب کرتا ہی اُس لڑکے کی نسبت کیا کہا جاویگا جو اُستاد کے پڑھانے اور سمجھانے کے وقت اپنا دھیان کہیں اور لگاتا ہی؟ پس الہام کے قبول کرنے کے لئے اُس کے موضوع کو مطیع اور منقاد ہونا ضروری ہی۔ علاوہ اطاعت کے فروتنی اور خاکساری کا لباس پہننا بھی ضروری ہی تاکہ طالب العلم کی حیثیت میں وہ الہام سے پورا پورا شرف حاصل کرے۔ اگر مبتدی اُستاد کے سامنے شوخی سے پیش آوے اور اُس کی پوری توقیر نہ بجالائے تو ایسا مبتدی علم سے ہرگز فیضیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح الہام سے مستفید و مستفیض ہونے کے لئے پوری اطاعت اور تعظیم بجالانا ضروری ہی۔ جو سچائی الہام کی طرف سے باصداقت پیش ہوتی ہی اُس کے مزید دریافت کرنے کے لئے انسان کی طرف سے جستجو اور کھوج اور تلاش کی ضرورت ہی۔ دیکھو تمام دھاتی

چیزیں اِس زمین میں سے جسپر ہم سکونت کرتے میسر ہو سکتی ہیں مگر اُن کے حاصل کرنے کے لئے سعی و تلاش اور محنت اور ریاضت بلکہ عقل کا صرف کرنا درکار ہے۔ اسی طرح جب کتب مقدسہ میں اس قسم کے الفاظ مندرج ہیں کہ نوشتوں کو ڈھونڈو" یا مسیح کا یہہ کہنا کہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے لئے کھولا جائیگا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤگے اور مانگو تو تم کو دیا جائیگا + تو ان سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ الہامی باتوں کے جاننے اور سمجھنے کے لئے ہماری طرف سے یہہ ضروری ہے کہ ہم متلاشی دین اور کھوج اور جستجو کرنے والے اور درگاہ الٰہی میں الہام کے سمجھنے کے لئے خواستگار ہوں۔ تب وہ سچائی جو پیش کی جاتی ہے طالبِ حق پر منکشف اور آشکارا کی جاتی ہے ورنہ مسیح کا وہ قول تصدیق ہوتا ہے جو اُس نے علانیہ کہا کہ وہ کان رکھتے ہوئے نہیں سُنتے اور آنکھ رکھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ کیونکہ ایسوں کے سامنے الہام تمثیل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ مسیح کا قاعدہ تھا کہ پبلک میں تمثیلوں میں باتیں کرتا تھا۔ مگر خاص لوگوں کے سامنے جو سچائی کے ڈھونڈھنے کے درپے رہتے تھے تمثیلوں کو کھول کر بیان کرتا تھا۔ اہل یہود کے سامنے جیسے باب دوم میں بھی اس کا ذکر ہوا مسیح نے بہت معجزات دکھائے۔ مگر چونکہ وہ منحرف تھے اسلئے ہمیشہ مسیح سے زیادہ نشانیاں طلب کرتے رہے اور مسیح نے بھی اُن کے سامنے اپنے مرنے اور جی اُٹھنے کی نشانی پیش گوئی کے طور پر پیش کی تاکہ وہ اُس نشانی کے دیکھنے کے حقیقی آرزومند ہوں تو بعد میں اُس کے مرنے اور جی اُٹھنے پر نشانی مذکور کے بارے میں جو جو شہادات پیش کی گئیں اگر وہ چاہتے تو بغاوت کی جگہ فرمانبرداری کا قدم

لاکر اُس کی زیادہ تصدیق اور اطمینان اپنے دلوں میں پاتے۔ مگر اُنھوں نے سخت دلی
کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے مسیح نے بھی اپنا جسمانی چہرہ جی اُٹھنے کے بعد اُن
اُن سے چھپا رکھا تھا تاکہ آئندہ انسان اُس کو ایمان کی نگاہ سے دیکھے۔ اپنے عین
حیات میں وہ اُن کو اپنے ہاتھ پھیلا کر بلاتا تھا۔ اُس نے یروسلم کے رہنے والوں
کو بار بار کہا کہ اُن باتوں کو جو اُن کے اطمینان اور سلامتی کا باعث ہیں قبول کریویں
مگر جی اُٹھنے کے بعد وہ یہہ چاہتا تھا کہ قوم حقیقی تائب ہو کر اُس کے دیکھنے کی طلبگار ہو۔
نیچر بھی ایک الہامی کتاب ہمارے سامنے پیش کی گئی ہی۔ وہ بھی ہمارے
سامنے بعض الٰہی حقیقتوں کو جن کا بیان بار بار پہلے دو بابوں میں آیا پیش کرتی
ہی اور انسان سے یہہ مطالبہ کرتی ہی کہ خدا کے علامات اور نشانات نیچر میں دیکھہ کر
اور اُس کے آستانہ تک پہنچکر وہ سر تسلیم جھکائے اور پوری عظمت اور اطاعتِ خدا
منظور کرے تاکہ خدا خود اپنے مکالمات و مخاطبات سے اسکو شرف بخشے۔ مگر انسان نے
نیچر کا کسی قدر مطالعہ کر کے باقی قیاسات و تصورات سے کام لیا ہی جس کا نتیجہ یہہ
ہوا ہی کہ انسان کے خیالات میں سخت اختلاف پایا گیا ہی اور اگر کہیں دس کسی امر
میں متفق بھی ہوئے ہیں تو حقیقت میں ایسی جماعت نے جھوٹ اور بطالت کو ہی
سچ کر کے مانا ہی اور اپنے علم و معلومات کے گھمنڈ میں روحانی عرفان اور معرفت
سے بےنصیب رہے ہیں۔ دیکھہ لیویں کس قدر فریب خوردہ انسان کی حالت رہی ہی
جو حقیقی متلاشی دین کو تذبذب میں ڈالتی ہی۔ جماعتوں کی جماعتیں ایک ہی بنیاد
پر قائم ہو کر بھی کہیں سے کہیں نکل گئی ہیں۔ کہیں ہمہ اوست۔ کہیں ہمہ از اوست

کہیں ہیچ منیت کی جماعتیں قائم ہوگئیں ہیں اور بطالت پرستی انسان کے رگ و ریشہ میں ایسی گھس گئی ہی کہ اُس کے رفع کرنے میں نہ صرف کمال دقت پیش آتی ہی بلکہ بسا اوقات اُس کی انسانیت کا ستیاناس ہوتا ہی۔ کیونکہ وہ وہم پرست ہوجاتا ہی اور بطالت چھوڑنے کے ساتھہ اگر وہ حق کے ساتھہ پیوند نہیں ہوا ہی تو اُس کو زیادہ بربادی کا منہہ دیکھنا پڑتا ہی یعنے انسان ملحد و لاپروا ہوجاتا ہی۔ ایسی جماعتیں ہمہ تن اِس بات پر مصروف رہتی ہیں کہ ایک دوسرے کے عقیدہ کو کھنڈن کرکے اپنا قائم کرے اس کی وجہ محض یہی ہی کہ جہاں حقیقتوں کو دریافت کرنا چھوڑ کر انسان نے تصوّرات سے کام لیا ہی وہاں بطالت پرستی ظاہر ہوئی ہی +

لارڈ بیکن صاحب جو سولھویں صدی کے اخیر میں گذرے ہیں اور یورپ کے ایک بڑے ممتاز عالم مانے گئے ہیں وہ اپنے بیان متعلق نیچر یہہ فرماتے ہیں کہ معلومات نیچر کے بارہ میں اُن کے ہمعصرین کے درمیان ایسی غلط فہمی اور کم علمی پائی جاتی ہی جو نہایت حیرت خیز ہی۔ نیچر میں تو حقایق کی کوئی کمی نہیں ہی اُس میں تو ضابطہ انتظام پایا جاتا ہی حتّٰی کہ کسی صیغۂ علم میں اگر یقینی اور صحیح پتہ لگتا ہی تو نیچر کی حقیقتوں کے دریافت کرنے میں۔ مگر کیا وجہ ہی کہ اس طرف علما کی کم توجگی پائی جاتی ہی؟ کیا بالیاقت صحابہ موجود نہیں ہیں؟ ہاں ہیں۔ الّا اُن کے مطالعہ میں قباحت یہہ پائی جاتی ہی کہ اُنھوں نے حقائق کے دریافت کرنے کے بجائے تصورات و قیاسات سے کام لیا ہی۔ فلاسفروں نے ایک اپنی ہی قیاسی دنیا بنا رکھی ہی اور اپنے دماغ سے تمام مسودہ علم دریافت کرنے کا اختراع کیا ہی اور مشاہدہ و ملاحظہ کرنا بالاطاق

رکھہ چھوڑا ہو تحقیق و تدقیق کی جگہ رائے زنی کی جاتی ہو اور اسی واسطے بیچ کی حقیقتوں سے
بے خبر رہتے ہیں۔ علاوہ اس بیان کے وہ مغالطہ کے پھیل جانے کے اسباب میں ایک
یہہ سبب بیان کرتے ہیں کہ عموماً قومیں کوئی نہ کوئی عزیزیت اپنے سامنے قائم کرتی ہیں
عموماً انسان کا یہہ حال ہو کہ اُس کا ذہن ایک شفاف آئینہ کی طرح نہیں ہو جو صحیح
نقشہ چیزوں کا اپنے سپاٹ سطح پر معکوس ہونے دے بلکہ اُس کی سطح ناہموار اور
دھندلی سی ہوتی ہو جس پر علاوہ اصلی چیزوں کے عکس کے اپنی شکل و صورت بھی
ملی ہوئی ہوتی ہو۔ مثلاً زمانہ سلف کے لوگوں نے اگر یہہ دیکھا کہ اجرام فلکیہ اپنے
اپنے محور پر گردش کر کے پھر وہیں کے وہیں آجاتے ہیں تو بلا زیادہ تحقیق و تدقیق
کرنے کے یہہ تصور اپنے دماغ سے منتج کیا کہ اُن کی شکل اور دائرے بالکل گول
ہیں اور اُن کی حرکات مطابق ہیں اور اس احتمالی بنیاد پر دنیا کے کل انتظام کی
صورت قیاس کی گئی ہو۔ پھر یہہ بھی فرماتے ہیں کہ ہر ایک انسان کے دل میں
کسی نہ کسی گوشہ میں کوئی نہ کوئی بطالت کا بت چھپا ہوا ہوتا ہو جہاں وہ روشنی
کو داخل ہونے نہیں دیتا اور اس تاریک مندر میں سچائی قربان کی جاتی ہو۔
لوگوں کی استعداد متفرقہ ہوتی ہیں۔ کوئی تو تفریق بندی کا مطالعہ خوب کر سکتا
ہو اور کوئی مشابہت پر زور دیتا ہو۔ پہلے قسم کے علماء تو بتدریج بہت کچھ معلومات
کی تفریق بندی کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر مشابہ والے جلد باز اور مخترع ہوتے ہیں
اور ذرا سا بھی مشابہ دیکھہ کر معلومات کا ایک تومار باندھہ دیتے ہیں۔ اسی طرح
دونوں فریق زیادتی کر کے غلطاں و پیچاں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ اسلاف نے

تحقیق الاشیاء کے علم میں مغالطہ کھایا ہی حتیٰ کہ تھوڑے سے مشاہدات پر بڑے بڑے مسئلے دماغ سے حل کرنیکی کوشش کی ہی جنکو بعد کے محققوں نے غلط ٹھہرایا ہی۔ دماغی تصورات میں لفظوں پر بحث کی گئی ہی اور اصلیت کا لحاظ نہیں کیا ہی۔ اُن میں سے بعض نے تو قیاسی علم دریافت کرنیکی کھوج کی ہی مثلاً علم نجوم جو محض ایک خوابی علم ہی اس میں بہت سر دردی کی گئی جسمیں بڑے لوگ خفیہ طلسم یا سحر یا فالگیر والی دعوت سے روحوں کو بلاتے اور وہم پرستوں کو جھوٹ میں مبتلا کرتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے لوگ حقیقتوں کا پیچھا چھوڑ کر نیچر کو اپنی دماغی اور وہمی روحوں سے آباد کرنا چاہتے ہیں۔ یہہ پُر وزن بیانات لارڈ بیکن صاحب کے جو نیچر کے مطالعہ کے متعلق ہیں ہمارے قول کی بھی جو مذہب کے مطالعہ کے متعلق ہی پوری تصدیق کرتے ہیں۔ کیونکہ واقعی انسان مذہبی معاملات میں بھی تصورات سے کام لیکر خدا سے الہام کا خواستگار نہیں ہوا بلکہ ذہنی مخترعات سے کام لیکر اپنی آزادی اور اُس کی اصلیت کا خون کیا ہی۔ انسان خدائی کا درجہ نہیں رکھتا ہی نہ اُس کی عقل صفت عالمیہ سے منسوب کی جاتی ہی بلکہ اُس کا وصف تسلیم کرنا ہی۔ خدا کا تسلیم کرنا ایک امر ہی اور خدا کا علم کے ذریعہ سے ذہن میں لانا دوسرا امر ہی۔ وہ لوگ جو خدا کی خبر نیچر میں پاکر اُس کی ہستی کو تسلیم کرتے ہیں اُن میں قوت ایمان کارگر ہوتی ہی اور وہ جو خدا کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں بطالت میں مبتلا ہو کر وہم پرست ہو جاتے ہیں۔ نیچر کے دریافت کرنے میں تین امور پائے جاتے ہیں۔ اولاً حقائق کا دریافت کرنا۔ ثانیاً اصول پر نگاہ رکھنا۔ ثالثاً بذریعہ اصول حقائق کی تاویل اور تفصیل کرنا اسی طرح خدا کے دریافت کرنے میں اول اصول کی ضرورت پڑتی ہی جو ذہنی مخترعات

میں سے نہیں ہی بلکہ اُس کا وجود خدا کی طرف سے ہی اور اُس کا پیش کرنا اور ہمارے علم میں آنا الہام ہی اور اُس کا ہماری طرف سے علی الترتیب بیان کرنا تعلیم اصول کہلاتی ہی۔ اگر دینی اصول کی بنیاد خدا نہیں ہی بلکہ تصورات انسانی ہیں تو یاد رکھو کہ ان تصورات کے پیشوا اور پیرو دونوں حق پر قائم نہیں ہیں بلکہ بطالت کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہم پرستی میں مبتلا ہیں۔ نیچر میں بہت قدرتیں اور قاعدے اور قوانین اصول کی صورت میں موجود ہیں جن کا مشاہدہ اور ملاحظہ کیا جاتا ہی اور کیا گیا ہی اور جوں جوں انسانی تجربہ اُن کی نسبت صحیح واقع ہوتا ہی اُسی قدر انسان کے علم کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہی مگر قوانین کی بنیاد نیچر میں خود بخود ہی۔ اُن کو انسان اپنے دماغ سے اختراع اور استخراج نہیں کرتا بلکہ نیچر میں اُن کے ظہور کا مشاہدہ کرکے اصول قائم کرتا ہی۔ اسی طرح الہام کا خدا کی طرف سے پیش ہونا ضروری ہی اور جب وہ الہام تصدیق کیا جاتا ہی تو ہمارا کام الہام کو تسلیم کرنا ہی+ زیادہ تمہیدی باتوں کی ضرورت نہیں ہی۔ اب ہم اُن مذاہب کی طرف جو ہندوستان میں رائج ہیں رجوع ہوتے ہیں تاکہ یہہ دیکھیں کہ انسان اور خدا کے حق میں ان مذاہب نے کیا کچھہ صحیح یا غیر صحیح پتہ دیا ہی۔ یاد رہے کہ انسان صرف اشیاء مرئی کا طالب نہیں ہی بلکہ اُس کے حوائج مشاہدات سے بڑھکر ہیں+ انسان اس بات کا خواہشمند ہی کہ ازمنہ ثلثہ میں جو اپنی اور غیر قوم کی زندگی کا باہمی تعلق اور ارتباط ہی اور جو انسان کا تعلق خدا سے اور خدا کا انسان سے ہی اُن کو دریافت اور معلوم کرے+

پہلے ہم قدیم ہندو مذہب کو لیتے ہیں۔ جب قدیم کا لفظ ہندو مذہب پر چسپاں کیا جاتا ہے تو اُس سے ہندو مذہب کا زمانۂ طفولیت مراد لینا چاہئے۔ بلکہ ویدوں کا مطالعہ کر کے اُس کی نسبت ہندوؤں کا ابتدائی تہذیبی زمانہ کہنا بجا ہوگا جس میں مذہب بھی شامل ہے حقیقت میں رشیوں کے مقابل میں قدیم ہم کو کہنا چاہئے۔ کیونکہ جو کچھ رشیوں نے سیکھا اور سکھایا اُسپر بعد کے زمانہ کے لوگوں نے بہت کچھ تجربہ بڑھایا اور ترقی کی ہے حتّٰی کہ وہ کچھ اب دریافت ہوا ہے جو اُن کے خواب وخیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ مگر یاد رہے کہ رشیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہند کے ہر ایک رہنے والے کے دل میں فخر سماتا ہے کہ ہم بھی اُن کی نسل میں سے ہیں اور اُن کی واجبی توقیر کرتے ہیں اور اُن کی لکھی ہوئی کتابوں کو وصیت کے طور پر اور وراثتاً اپنا حصّہ سمجھتے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کی آئندہ نسلیں بھی جو اُن کے کُنبے میں سے ہیں رشیوں کے نیک خصال جو اُن کے وجود میں پائے جاتے تھے نسل در نسل قائم رکھیں گی۔ مثلاً رشیوں کی دینداری اور اُن کے خوض اور فکر کرنے والی طبیعت اور اُن کی تہذیب۔ مگر یہہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ الہامی نہیں تھے نہ اُنہوں نے الہام کا دعوی کیا ہے بلکہ نیچر میں جو الہام اُن کو بذریعہ نُورِ فطرت نظر آتا تھا اُس کے مطابق وہ عمل کرتے تھے اور ہمارے خیال میں بہت اُن میں سے خدا کے نزدیک مقبول نظر ہونگے۔ مگر ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ نیچر کے مطالعہ کے متعلق بعد کے رشی مُنیوں نے حقیقت کی جگہ تصور سے کام لینا شروع کر دیا تھا اور اس طرح نیچر کے پیغام و پیام سے کانوں کو بند کر کے اور قیاس اور تصور سے کام لیکر

وہ سچائی تک نہیں پہنچنے پائے بلکہ بطالت پرستی میں مبتلا ہوئے۔ یعنے اُنہوں نے نیچر میں قدم رکھتے ہی ٹھیس لی اور پھر اُس کے دروازے میں داخل ہوتے ہی سر ٹکرایا۔ جو درس نیچر نے دینا تھا اُس سے تو اپنے کان بند کر لئے اور اُس کے بجائے اپنا ہی درس فلاسفی کے لباس میں پڑھ سُنایا۔ اگر ویدک مذہب کا ملاحظہ کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی نسبت مختلف بلکہ متضاد خیالات وید کی تعلیم سے بر آمد ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کی قدیم کتابیں وید ہیں۔ اُن میں منتر مقدم ہیں یعنی رشی مُنیوں کا شاعرانہ لباس میں کلام۔ چار وید یعنے رگ۔ یاجش۔ شاما۔ اور اتھروید دو حصص میں منقسم ہیں۔ سمہتا اور برہمنا۔ پہلے میں تو منتر پائے جاتے ہیں اور برہمنوں میں ایشور کی سیوا کی ترکیب و ترتیب پائی جاتی ہے۔ برہمنا ویدوں کے منتروں پر بنائے گئے ہیں اور وہ منتروں کی تشریح کرتے ہیں اور طریق عبادت کا بیان بھی اُن میں پایا جاتا ہے۔ برہمنا کے وہ حصّے جو برہما کا بیان کرتے ہیں یوپانشد کہلاتے ہیں۔ برہمنوں میں مذہبی خوض و فکر پایا جاتا ہے۔ رگوید کے سہنتا میں مختلف منتروں کی تصنیف کا کئی ایک صدیوں کا فاصلہ ہے۔ اور اُن دس منڈلوں کے مطالعہ سے جن میں رگوید منقسم ہے یگانگت کی جگہ اختلاف رائے نظر آتی ہے۔ برہمنوں کے بعد یوپانشد ہیں۔ یوپانشدوں میں اُن مختلف طریق فلسفہ کی جو ہندوؤں میں رائج ہیں سند پائی جاتی ہے۔ مثلاً ویدانت۔ سانکھیا۔ ویشیکہا۔ نیایا اور یوگا۔ کیونکہ ان طریقوں کے پابند فلاسفر اپنی تعلیم اور خیالات کی سند یوپانشدوں

میں دیتے چلے آئے ہیں تاکہ یوپانشد کا حوالہ دیکر اپنے خیالات کو مقلدانہ بنائیں۔
یوپانشدوں میں خود مختلف اور متضاد فلسفانہ خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ برہمنوں
میں بھی بہت خیالات کی آزادی ظاہر ہوتی ہی چنانچہ پہلے پہل صرف میمانسا اور
نیایا مقلدانہ طریق متصور تھے مگر بعد میں ویشیکھا۔ سانکھیا اور یوگا فاسفی بھی
مقلدانہ تصور کیئے گئے ہیں۔ وید کو بنیاد بنا کر فلاسفروں نے جدھر چاہا اپنے عقلی
گھوڑے دوڑ لئے اور گو متضاد خیالات بھی ظہور میں آئے مگر سب کے سب مقلد
تصور کیئے گئے میکس مولر صاحب کی کتاب اینشنٹ سنسکرت لٹریچر ہمارے متذکرہ
بالا بیان کی تصدیق اور سند ہی۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہی کہ ویدوں کی صورت
الہامی نہیں ہی بلکہ وہ صورت ہی جس میں انسان اپنی ابتدائی حالت میں ترقی کے
میدان میں قدم رکھنے کا کوشاں تھا۔ جو کچھ رشیوں کی نظر سے گذرا اُس کی نسبت
کچھ نہ کچھ دریافت کر کے رائے زنی کی ہی اور چونکہ ابتدائی زمانہ انسان کا ایسا ہوتا
ہی کہ جس میں وہ چیزوں کو دیکھتے ہی اُن کی نسبت کچھ نہ کچھ خیال دوڑاتا ہی مگر اُس
میں تحقیق کرنے کا مادہ ابھی تک اتنا نہیں ہوتا کہ جستجو اور کھوج اور ملاحظہ سے مشاہدات
کی اصلیت تک پہنچے اِس لئے مشاہدات کی نسبت قیاس اور تصور ذہنی کو کام میں
لاتا ہی۔ اِلّا وہ بھی ابتدائی زمانہ میں خالی از فائدہ نہیں ہوتا ہی کیونکہ اُس میں انسان
کے احساس باطنی اور دینی سوز و گداز سینہ اور دل میں جوشزن ہوتے ہیں جو الفاظ
میں ادا ہوتے ہیں اور یہی قدیم رشیوں اور منیوں کا کلام کہلاتا ہی۔ آئندہ شعرا جو ہندوستان
میں اُٹھینگے اس میں شک و شبہ نہیں کہ وہ رشیوں کے کلام اور راماین اور مہابھارت

کے طرز کلام سے بہت کچھ سبق لینگے۔ مگر وید کو الہامی اور دین اور ایمان کا چشمہ ومنبع ماننا غلط ہی۔ خیر اوپر کے بیان میں یوپانشد کا ذکر ہوا تھا۔ یوپانشد کے بعد درشنا ہیں اور درشنا کے بعد مختلف دیگر کتابیں۔ مثلاً پوران وشاستر۔ اتہاس وسمرتی کتابیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم ویدوں میں خدا اور انسان کے متعلق جو بیان ہی اُس کو دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وید کی مدعا کو دیکھا جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُن کے منتروں میں انسانی خواہشات کا ذکر پایا جاتا ہی چنانچہ رگوید کی انوکرمنی میں یہہ درج ہی کہ رشی مختلف چیزوں کی خواہش رکھکر دیوتاؤں کے پاس شعر کی زبان میں دست بدعا ہوتا ہی اسی طرح نروکتا میں بھی درج ہی کہ رشی کسی خاص دیوتا کو کسی خاص مطلب کے لئے پکارتا ہی۔ دیکھو میور صاحب کی کتاب جلد دوم صفحہ ۱۹۵۔ اس سے اول تو یہہ بات ظاہر ہوتی ہی کہ رشیوں نے کوئی بات الہام کے ذریعہ نہیں پائی اور گو نروکتا میں رشیہ درشنات لکھا ہوا ہی یعنے رشیوں نے منتروں کو دیکھا مگر جب یہہ دیکھا جاتا ہی کہ منتروں کے کئی مصنفوں کے نام درج ہیں اور وہ موقعے بھی لکھے گئے ہیں جب وہ مرقوم ہوئے یعنے جب رشی کسی خاص نعمت یا برکت کے خواہاں تھے تو رشیہ درشنات لکھنا وہ تقاضاء انسانی ہی جو کسی ہیرو کے مرجانے کے بعد ظہور میں آتا ہی جب انسان اُس کو آلہی خطاب دینے لگ جاتا ہی۔ جیسے رامائن اور مہابھارت میں راما اور کرشن کے حق میں شروع میں صرف انسانی اور بہادرانہ اوصاف بیان کئے جاتے ہیں مگر آخر میں وشنو کے اوتار کر کے مانے جاتے ہیں۔ ابتدائی مفسرین میں وید کی تعلیم کے بارہ اختلاف ہی۔ مثلاً پرواہیمانسا اور اوتامیمانسا یا ویدانت*

برہما سوتروں کا مصنف جو شرح ویدوں کی کرتا ہے وہ ویدانت کی تعلیم کو برہمنوں اور اوپانشدوں کی بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ اگر کھٹ درشنوں کو دیکھا جاوے تو ان میں بھی مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ پروا میمانسا کرم کے بارہ میں ہے اور وہ وید کی سند پیش کرکے اس میں سے دینی فرائض نکالتا ہے جو کرم میمانسا کہلاتا ہے اور برہما میمانسا یا ویدانت علم الٰہی سے تعلق ہے۔ الحاصل کرم میمانسا اور برہما میمانسا دونوں ملکر وید کی تعلیم اور احکام کی پوری شرح ہیں۔ بادرائن برہما سوتروں کا مصنف اور شنکر اچارج اُسکا مفسر دونوں ویدوں میں سے اسناد پیش کرکے اپنی تعلیم کو قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ منتروں اور برہمنوں اور اوپانشدوں کی بنیاد پر ابتدائی مصنف انسان اور خدا کی نسبت اپنے مختلف خیالات بیان کرتے آئے ہیں مگر اُن میں سے زیادہ اس بات پر متفق ہیں کہ وید کی تعلیم ویدانت ہے۔ وید کے مقلد اُسکو ایشور کا بچن جانتے ہیں۔ مگر مقلدین میں سے بدھ جیسے بھی اُٹھے ہیں جو وید کے فقرات کو الہامی نہیں مانتے ہیں۔ وید کا مفہوم دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جو اسنند لالاً یا پرمان کے دوارے سدھ ہوتا ہے اور دوسرا جو آرشا کہلاتا ہے جو رشیوں کا حصہ تھا۔ آرشا کا مفہوم نور فطرت سمجھنا چاہئے۔ مگر وید کے مقلدین کہتے ہیں کہ یہہ ودیا بذریعہ یوگ رشیوں کو پراپت ہوئی مگر یاد رہے کہ اسی بنیاد پر بہتوں نے یہہ بھی سمجھا ہے کہ ایشور کا ثبوت وید سے برآمد نہیں ہوتا ہے کیونکہ جب سُرگ پراپت کرنے کے وسائل بغیر ایشور کے جاننے کے حاصل ہو سکتے ہیں تو ایشور کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی ہے +

خدا کے علم کی نسبت ویدوں سے خود تین صورتیں نکلتی ہیں۔ پہلی صورت کثرت الالہیات۔ دوسری صورت تپشیا یعنے انسان کا خود تپش کے ذریعے دیوتا بن جانا۔ تیسری صورت توحید کی طرف رجوع ہونا اور الہام خدا کی ضرورت کو محسوس کرنا۔ یاد رہے کہ الوہیت کے تصور میں ویدوں میں سے ہم کو کوئی ایسی صورت نہیں نظر آتی جو صحیح اور حقیقی عرفان خدا کا ہم کو دیوے۔ وہ دیوتے جو رگوید میں مانے گئے ہیں پورانوں میں اُنکی کم قدر پائی جاتی ہے اور دیگر دیوتے جن کا نام تک بھی ویدوں میں نہیں پایا جاتا مانے گئے ہیں۔ مثلاً شیو۔ مہادیو۔ دُرگا۔ کالی۔ راما۔ کرشنا اور جن کا نام پایا جاتا ہے اُن کی قدر کم پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تری موتی یعنے برہم۔ وشنو۔ اور شیو کا جو نامعلوم حروف اوم کی علامت ہیں ذکر تک بھی ویدوں میں نہیں ہے۔ وید میں جو وشنو تصور کیا گیا ہے اُس کے لئے کوئی جُدا منتر مرقوم نہیں ہے مگر تریوی کرما کے نام سے نامزد کیا گیا ہے یعنے تین قدم بمعنے سورج کی گردش کے تین زمانے۔ طلوع معراج۔ غروب۔ رگ وید ا۔ ۲۲۔ نروکتا بھی یاسکا یہی تشریح کرتا ہے اور درگا چریا یاسکا کی تائید کرتا ہے۔ تو گویا پورانوں میں جو بیان شوا اور وشنو کا پایا جاتا ہے وہ ویدوں کے بیان سے کہیں مختلف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الوہیت کے تصور میں کوئی ایسی ترقی تبدیل صورت نظر نہیں آتی جو کسی انجام کو مدنظر رکھے۔ کیونکہ اگر الوہیت کا عرفان خدا کی طرف سے ہوتا تو اُس کی کوئی تکمیل کی صورت ہونی چاہئے۔ مگر ویدوں میں اور ویدوں کے بعد کی کتابوں میں سے کوئی ایسی ترقی کی صورت نظر نہیں آتی جو خدا کے

درشن یا عرفان میں کسی غایت مطلوبہ کو پہنچائے۔ وید کے بیانات سے اور جن موقعوں پر وہ مرقوم ہوئے ظاہر ہوتا ہی کہ وہ ابتدائی شاعروں کے فطرتی بیانات ہیں جو اُنھوں نے اپنی ذاتی امیدوں اور محسوسات کی نسبت اپنی زبان میں ادا کئے ہیں۔ اُن میں آریہ لوگوں نے اپنے نسلی دیوتاؤں کی سیوا کی ہی اور اُنکی خوشنودی کے لئے ایسے چڑھاوے دئے ہیں جن سے وہ خوش ہوتے معلوم دیتے تھے اور اُن دیوتاؤں سے اُن چیزوں کی درخواست کی ہی جن کے درپے عموماً انسان رہتا ہی۔ مثلاً تندرستی۔ دولت۔ عمر۔ مواشی۔ اولاد۔ فتحیابی۔ گناہ کی مغفرت اور اعلیٰ خوشی۔ جیسے نروکتا ۱-۷ میں درج ہی کہ ہر ایک منتر کا کوئی نہ کوئی خاص دیوتا ہی جس کی طرف رشی مخاطب ہو کر اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لئے دست بدعا ہوتا ہی اور منتروں کے نفس مضمون سے بہہ بھی عیاں ہوتا ہی کہ وہ اُس وقت لکھے گئے جب وہ دشمنوں سے لڑائی میں مبتلا تھے۔ چنانچہ ایسے دیوتاؤں سے جن کی اصل نیچر کے عناصر میں پائی جاتی ہی حفاظت اور فتحیابی کے لئے منّت اور سماجت کیجاتی ہی اور اسی طرح رفتہ رفتہ نیچر کی طاقتوں اور عقل کی بھی سیوا کی جاتی ہی۔ کیونکہ منتر ایک ہی وقت میں نہیں لکھے گئے بلکہ نسل درنسل کئی صدیوں کے شعروں کا مجموعہ ویدوں میں پایا جاتا ہی ÷

اندرا۔ اگنی۔ وایو۔ ساوتیری۔ سوریا اور دیگر دیوتاؤں میں درحقیقت عناصر کو شخصی لباس پہنایا ہوا ہی۔ اور وچ یا سرسوتی جیسے دیوتے حقیقت میں عقلِ ایزدی یا کلام کا نام ہی جس سے بڑے بڑے رشی فیضیاب ہوئے تھے

رشیوں کو علم اگنی - اندر - متر ا - ورن - سوما - پوشن وغیرہ سے حاصل ہوا اور
یہہ دیوتے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں - اگر دیکھا جاوے تو اسی کا نام قدرت پرستی
ہی نیچر میں طاقتیں مشاہدہ کرکے زیادہ ملاحظہ سے کام نہیں لیا گیا ہی بلکہ اُن کو
شخصی لباس پہنا کر دیوتا کر کہا تا ہی - اگنی کے ذریعے بہت فوائد حاصل ہیں
اگنی اندھیرے کو دور کرتی ہی - اگنی ہر ایک چیز میں پائی جاتی ہی اس واسطے اگنی
کو دیوتا کرکے مانا گیا ہی اور اسی طرح دیگر عناصر کی پرستش شروع ہونے سے بہت
دیوتاؤں کو ماننا پڑا ہی اور منتروں میں اُن ہی کے گن گائے گئے ہیں +

یہہ منتر بعد میں بڑے تاثیر والے مانے گئے ہیں - اسی طرح بعد کے
رشیوں میں منتروں کی بھی سیوا ہونے لگی اور جوں جوں ترقی ہوتی گئی متر ا اور
وروں جو پہلے پہل نیچری دیوتا کرکے مانے گئے تھے اب اخلاقی حاکم بن جاتے ہیں
چنانچہ دیوآسے پھر برہما کی سیوا ہوتی ہی - اور اسی طرح وشنو سورج ہی یا ادتیا تین
مقاموں میں اُس نے اپنا قدم جمایا ہی پرتھوی پر - آکاش پر - اور وایو پر - بذریعہ
اگنی پرتھوی میں - بذریعہ بجلی ہوا میں - اور بذریعہ سورج اکاش پر - ساکپونی تو
ایک ہی دیوتا کا تین صورتوں میں ظاہر ہونا سمجھتا ہی اور نوبھا اُس کے معنے سورج
کا طلوع - معراج - اور غروب ہونا مراد لیتا ہی - وشنو جو ادتیا ہی اُس کی تعریف
سمبھالنے والا ہی - رگویدا - ۱۵۴ - سایَن اُس کی یہہ تشریح کرتا ہی کہ وشنو جو
اگنی وایو اور ادتیا کی صورت میں ہی اُسکے ذریعہ جگت بنا - یعنے زمین - ہوا اور
آکاش +

وشنو کو ساکیونی تو دیوتا کرکے مانتا ہی اور تو بہا تین قدم سے سورج کی
گردشیں مراد لیتا ہی اور اندرا اُس کے ساتھہ شامل ہی۔ وشنو کے کام کا اندرا اور
اگنی کے کام کی طرح صاف صاف بیان نہیں پایا جاتا اور گو اُس کی کہیں کہیں بڑی
تعریف لکھی ہی گویا وہی خاص اور افضل دیوتا ہی اگر یہہ تعریف اُس پر مخصوص ہوتی تو توحید
کی کچھہ بنیاد نظر آتی مگر ایسا نہیں ہی بلکہ اور مقاموں میں اندرا وشنو کے ساتھہ شامل
ہی اور رگ وید کے آٹھویں منڈل میں وشنو اندرا کی تعریف کرتا ہی اور نویں منڈل میں
وشنو کا سوما سے وجود پاتا ظاہر ہی نہ صرف یہہ بلکہ اندرا۔ اگنی۔ متزا۔ ورون وغیرہ
کی تعریف میں کثرت سے منتر پائے جاتے ہیں اور وشنو کی تعریف میں بہت کم۔ دیگر دیوتاؤں
سے اُس کی کچھہ زیادہ وقر بھی متصور نہیں ہی۔ علاوہ ازیں جو تعریف وشنو کے حق میں
مرقوم ہی اُس سے بڑھکر کہیں کہیں اندرا اور ورون کے حق میں مرقوم ہی اس
سے صاف ظاہر ہی کہ خدا کے عرفان کے بارہ میں کوئی صورت روئے ترقی نظر
نہیں آتی +

مکس مولر صاحب اپنی کتاب اینشنٹ سنسکرت لٹریچر میں فرماتے ہیں کہ وشنو
کے علاوہ دیگر دیوتاؤں کے بھی وہی الٰہی اوصاف اور صفات بیان کئے گئے ہیں
جو وشنو کے مثلاً دوسرے رگوید منڈل کے پہلے منتر میں اگنی کو کائنات کا حاکم کہا
گیا ہی منکھوں کا خداوند۔ دانا۔ بادشاہ۔ باپ۔ بھائی۔ بیٹا۔ دوست وغیرہ اسیطرح
دوسرے دیوتاؤں کی تحقیر نہیں بلکہ تعظیم کی گئی ہی۔ برہمنوں میں اندرا سب سے بڑا دیوتا
بیان کیا گیا ہی۔ وسوا ماد اندرا اوتارا۔ یعنے اندرا سب سے افضل ہی۔ اسی طرح

سوما سے بھی الٰہی صفات منسوب کی گئی ہیں۔کہیں ورون بڑھ کر بیان کیا گیا ہی اور کہیں ورون اور متر ادونوں۔اس میں شک نہیں کہ دسویں منڈل میں اندرا کی سیوا کسی قدر مخصوص کیجاتی ہی کیونکہ اُس میں ورن کا ذکر نہیں پایا جاتا ایک بھی پورا منتر اُس کی طرف مخاطب نہیں ہی اور برہمنوں میں بھی اُسی کا نام براجاجاتا ہی۔مگر جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے یہہ بات ثابت ہوتی ہی کہ پہلے رشیوں کا مذہب کثرت الالٰہیات تھا جس میں نیچر کے عناصر کو شخصی لباس پہنا کر اُن کی سیوا کی جاتی تھی اور پھر رفتہ رفتہ جب مشاہدات کے ساتھہ فکر اور استدلال شروع ہوا تو توحید کی طرف بھی بعد کے رشی کسی قدر راغب ہوئے لیکن تصورات نے اصلی و حقیقی خدا کی پہچان کی طرف اُنکو رجوع نہیں ہونے دیا*

توحید کی صورت یہہ ہی مثلاً رگوید ۱-۱۶۰-۴ اور ۴-۵۶-۳ میں آسمان اور زمین کی نسبت تصورات کے گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں۔گویا الہام کی ضرورت محسوس کی جاتی ہی۔کہیں اندرا اُن کا خالق بتلایا جاتا ہی۔کہیں سوما اور پوشن اُن کے خالق بیان کئے جاتے ہیں۔شروع میں یہہ پوچھا جاتا ہی کہ زمین پہلے تھی یا آسمان؟ ساتویں منڈل میں پانیوں کی نسبت کہا گیا ہی کہ وہ آسمان اور زمین کی پیدائش کی جگہ جانتے ہیں۔دسویں منڈل میں رشی یہہ سوال پوچھتا ہی کہ وہ کونسا جنگل اور درخت تھا جس سے اُنھوں نے زمین اور آسمان کو بنایا ہی؟ اور اسی منڈل میں وسواکرمن زمین اور آسمان کا خالق بیان کیا گیا ہی۔پھر پوچھا جاتا ہی کہ سروگیانی وسواکرمن نے کس بنیاد سے اور کس سہیتا سے زمین کو پیدا کیا اور آسمان کو پھیلایا؟ پھر ۱-۱۲۱

میں آسمان اور زمین کے اصل کا ایک جدا بیان شروع ہوتا ہے مثلاً اسی منڈل کے ۱۲۹ - ا میں یہہ کہا گیا ہے کہ پہلے نہ اسد تھا نہ سد - اور تیتر یا برہمنا میں یہہ بیان ہے کہ پہلے پہل کچھ نہیں تھا - نہ آسمان - نہ زمین اور نہ ہوا - پھر یوں بیان ہے کہ اسد نے ارادہ کیا کہ میں ہو جاؤں +

حقیقت میں یونانیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ دیوتے آسمان اور زمین سے نکلے - جو کچھ اوپر بیان ہوا اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں مختلف دیوتے مانے گئے اور رفتہ رفتہ رشی غوض و فکر سے کام لینے لگے حتیٰ کہ نروکتوں والوں نے وید کے دیوتاؤں کو گھٹاتے گھٹاتے تین تک پہنچا دیا - یعنے اگنی وایو یا اندر اور سوریا - اور اُنہوں نے یہہ بھی دعویٰ کیا کہ یہہ دیوتے اپنی اپنی بڑائی کی وجہ یا مختلف کاموں کی وجہ سے بہت القاب حاصل کرتے ہیں - مثلاً ہوتری - برہمن - اُودگاتری وغیرہ پھر یاسکا نے کہا کہ حقیقت میں دیوتاؤں کی بڑائی کی وجہ سے ایک ہی آتمن کا ایسا گن گایا جاتا ہے کہ گویا وہی بہت ہیں - مگر یاد رہے کہ رگوید کے پرانے حصوں میں دیوتا کی نسبت ایسے فلسفانہ خیالات نہیں پائے جاتے رشی تو نیچر کے ہر ایک ظہور کو جُدا جُدا دیوتا کر کے مانتے تھے اور توحید کا صاف صاف خیال اُن کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ خدا کے جاننے کی خواہش اپنے دلوں میں محسوس کرتے تھے - ہاں رفتہ رفتہ مختلف دیوتاؤں کو توحید کی ڈھانچے میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی تھی - مثلاً اگنی ہی کے تین مقام بتلائے جاتے ہیں کہ وہی زمین پر اور ہوا پر اور وہی سورج میں مقیم ہے - اسی طرح بعد میں

اندرا۔ سوریا وغیرہ کو ایسے القاب سے ملقب کیا جاتا ہی جو خدا ہی کو زیبا ہیں۔ مثلاً سروبیاپک اور سروگیان وغیرہ گو یہہ صفات کسی ایک دیوتا کی طرف منسوب نہیں کئے جاتے تاہم نیچر کے مطالعہ سے صفات ایزدی کا تصور اُن کے دلوں میں کسیقدر قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ کسی خاص دیوتا کو وسواکرمن یا پرجاپتی کے القاب سے خطاب کرنا۔ اس کے علاوہ رگوید میں چند ایک ایسے فقرات بھی ہیں جن میں رشی کثرت میں وحدت کو دیکھتے ہیں۔ مثلاً رگوید ۱۰۔ ۱۱۴۔ ۵ سوپرنام وبپراہ کا وایو واچو بھر ایکم سنتم بھوداکلپیانتی۔ یعنے دانا جس گارونمت کو اپنے منتروں میں بہت صورتوں میں پیش کرتے ہیں وہ ایک ہی ہی۔ مگر اس ایک کا مفہوم مہمل ہونے کی وجہ سے بعد میں ادیت کے معنے میں لیا گیا ہی۔ مثلاً رگوید ۱۔ ۸۹۔ ۱۰ میں تمام چیزیں ایک ہی سروبیاپک اصل کے ظہور ہیں۔ آدیتی آکاش۔ آدیتی ہوا۔ آدیتی ماتا پتا اور بیٹا ہی۔ آدیتی تمام دیوتے وغیرہ۔ رگوید کے مختلف شعرا خدا کے کارکٹر اور جگت کے ساتھ اُس کے علاقہ کو مختلف طور سے بیان کرتے ہیں۔ کہیں وسواکرمن۔ کہیں ہیرنیاگربھ۔ کہیں سماورت تتا کہیں برہماسپتی۔ کہیں دکشا اور آدیتی۔ اور پھر رگ ۱۰۔ ۱۲۹ کی تاویل ویدانت کے اصول کے مطابق ہوتی چلی آئی ہی+

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اُس کی سند اور زیادہ مطالعہ کے لئے میور صاحب کی سنسکرت ٹکسٹ جلد ۵ کو ملاحظہ کیا جاوے تو اس سے صاف آشکارا ہوگا کہ ویدوالے کس قدر توحید کی طرف رجوع ہو کر بعد میں تصورات میں مبتلا ہو گئے

اور حقیقی خدا کے عرفان سے محروم رہکر بطلان پرست بن گئے +

ہم نے کہا تھا کہ نروکتا والوں نے وید کے دیوتاؤں کو گھٹاتے گھٹاتے صرف تین دیوتے قائم رکھے یعنے اگنی وایو یا اندرا اور سوریا اور ان دیوتاؤں کی بڑائی اور بزرگی یا کام کے مطابق اُن کو کئی ایک خطاب دئے گئے ہیں۔ مثلاً ہوتری دمہو۔ برہمن۔ اور اودگاتری اُنہیں دیوتاؤں کی بنیاد پر بعد میں تری مورتی یعنے برہما۔ وشنو۔ شیو کی سیوا ہونے لگی۔ لیکن اوتار کی تعلیم وید میں نہیں پائی جاتی۔ حقیقت میں خدا کا تصور جو رشیوں کو حاصل ہوا وہ بچوں کا سا تھا۔ اُنہوں نے جیسا دیکھا ویسا ہی خدا خدا کر کے پکارا۔ کیونکہ مشاہدات سے اُن کے دلوں میں کچھ نہ کچھ دینی اثر پیدا ہوتا تھا۔ اُنہوں نے نیچر میں قدرتیں مشاہدہ کر کے یہہ خیال کیا کہ جگت کے ہر ایک صیغہ میں کوئی نہ کوئی جُدا دیوتا موجود ہی جس سے ہر ایک گوشہ نیچر کا پُرجان نظر آتا ہی۔ چونکہ فکر سے ابھی تک کام نہیں لیا تھا اس لئے اُن کو یہہ صحیح معلوم نہیں ہوا کہ تمام کائنات کا ایک ہی خالق و مالک ہی۔ اُن کے شاہدوں میں دیوتاؤں کے وہی نام رکھے جاتے ہیں جن عناصر میں اُن کی اصلیت پائی جاتی ہی۔ اگنی آگ کا دیوتا ہی سوریا سورج کا اور اندرا بادلوں کا۔ اُن کے فکر و خوض کی صورت یہہ ہی کہ بعد میں وشنو سوتیری۔ پوشن وغیرہ کو دیوتاؤں کے نام سے پوجنے لگے جس سے یہہ ظاہر ہوتا ہی کہ وہ کسی قدر توحید کی طرف رجوع ہو رہے تھے۔ جیسا اوپر بیان ہوا اگنی ہی کے وجود کی تین صورتیں بیان ہونے لگی تھیں اور صفاتِ ایزدی دیوتاؤں کی طرف منسوب کی جاتی تھیں

چنانچہ حاضر وناظر۔ ہمہ دان۔ سمبھالنے والے۔ جگت کے حاکم۔ وسواکرمن اور پرجاپتی جو نہ صرف قدرت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ ایسی طاقت کو جو جگت کو پیدا کرسکتی اور سمبھال سکتی ہے۔ مثلاً دیوو دھر تتا بھو وانسیا پرجاپتی۔ پھر ایسی صفت جیسے سوایم بھو۔ یعنے خود ہستی اور پھر وہ سوکت جو اوپر بیان ہوئی یعنے رگ وید ۱۰۔ ۱۱۴-۵ +

لیکن یہاں تک پہنچکر سلف کے رشی تو خاموش ہوجاتے ہیں مگر بعد کے رشی تصورات سے کام لینے لگتے اور نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ توحید ادویت کے معنے میں سمجھی جانے لگتی ہے چنانچہ رگوید ۵۔ ۱۰ و ۱۲۹۔ جو سد اور اسد کے بارے میں ہے اُس میں ساتپتا برہمنا کے مطابق ویدانت کی تعلیم پائی جاتی ہے اور چند وگیا یو پانشد اور نستریا برہمنا اور گوپت ادویت کے معنے لیتے ہیں جو بعد میں اکوہم بہو شوامی کی صورت میں عقیدہ قائم ہوا ہے الحاصل خدا کی نسبت ویدوں میں صاف صاف خیالات بیان نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی دیوتاؤں کے خصائص کو صاف اور دلائل قاطع کے ساتھ بیان کیا ہے صفات غیر محدود۔ قادر علی الاطلاق۔ حاضر وناظر مختلف وجودوں کو لکھا گیا ہے۔ آسمان اور سمندر وغیرہ جب ظاہراً لامحدود نظر آئے تو اُنہیں یہہ صفات ابدی چسپاں کی گئیں اور پھر اُنہیں صفات کو ایسا بیان کیا ہے کہ گویا وہ محدود ہیں یا خوراک سے بڑھتے یا اور وجودوں سے نکلے ہیں مثلاً پرش ویراج سے نکلا یا دیوتے تپش سے پیدا ہوئے۔ دیکھو رگوید دس منڈل نوبواں منتر۔ اسی طرح الٰہی طاقت کے قیاس میں بھی اختلاف ہے بعض

اوقات تو ایک ہی وجود کی طرف منسوب کی گئی ہو اور بعض مقاموں میں الٰہی
طاقت کا الحاق کام یا کال سے ہو یا زندہ وجودوں کی ایسی طاقتوں کا نام ہو جو
اُن میں موجود ہیں مثلاً ویراج کہ وہی جگت ہو۔ وہی دھرم کا محافظ اور وہی برہما
چارن کا پروہت۔ اِس لئے پروہت اور بلدان منتروں کے دوارے دیوتے
کہلاتے ہیں نہ صرف یہہ بلکہ تمام برتن جو پروہت نے استعمال کئے وہ سب الٰہی
طاقت سے معمور ہیں۔ اسی طرح بعض منتروں میں بھی خود الٰہی تاثیر تصور کی گئی
ہو جن کے وسیلہ سے جگت سمھالا جاتا ہو +

دوسری صورت وہ ہو جس میں تپش کے دوارے منکھہ خود بہشت پر پت
کرسکتا ہو۔ مثلاً اندرا نے تپش سے آسمان کو فتح کیا (رگوید ۱۰۔ ۱۶۷۔ ۱) اور یجروید
۱۱۔ ۵۔ ۱۹ میں مرقوم ہو کہ دیوتاؤں نے برہم چریا اور تپش سے مرتیو کو جیت
لیا اور روہت سے امرت حاصل کیا۔ اسی طرح ساتپتا برہمنا میں بیان ہو کہ
دیوتاؤں نے اسوروں کے برابر ہو کر آخر اُن سے بڑھ گئے۔ بدھ کی تعلیم اسی
بنیاد پر تھی۔ کثرت الالٰہیات کی جو صورت اوپر بیان ہوئی اُسکا نتیجہ بعد میں
یہہ ہوا کہ حضرتِ انسان کی قدر گھٹتے گھٹتے منوں کے وقت میں بالکل معدوم
ہو گئی مگر اس دوسری صورت میں بدھ نے انسان کی قدر کو تو قائم کیا لیکن خدا کی
ہستی کو بالکل اُڑا دیا۔ یعنے ناستک مت کو قایم کیا +

حاصل کلام

ہم نے پہلے باب میں یہہ دکھایا کہ نیچر میں خدا کی قدرت اور حکمت اور نیکی

نمایاں ہیں لیکن ساتھہ ہی دوسرے باب میں یہہ بھی ظاہر کیا تھا کہ نیچر ایک خاص
حد تک ہم کو پہنچا تا ہی بلکہ وہ اپنے میں خدا کے علامات و نشانات کو دیکھا کر انسان کو
زیادہ تر تجسس تفحص ۔ اور خوض کی طرف مائل کرتا ہی اور نکات اور اسرار دیکھا کر
یہہ جتاتا ہی کہ اُن کو دیکھہ کر انسان وہ پہلو اختیار کرے جو عین اُس کو زیبا ہے
یعنے کمال فروتنی اور انکساری اور فرمانبرداری کی طبیعت کے ساتھہ اُس
پاکترین جگہ پر جہاں نیچر نے اُس کو لا کر کھڑا کیا ہی سر تسلیم خم کرکے اور گردن نیاز
کو جھکا کر خدا کے دیدار کا طالب ہووے +

ویدوں کے مطالعہ سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہی کہ اوایل رشیوں نے
خال خال یہہ پہلو اختیار کیا اور اس لئے وہ ثواب میں تھے۔ مگر یہہ بھی دیکھا
جاتا ہی کہ برہمنوں اور اوپانشدوں میں بلکہ رشیوں کے بعد کی تمام ہندو مذہب
کی کتابوں میں رشیوں والا پہلو انسان نے اختیار نہیں کیا ہی بلکہ اپنے اپنے
زمانوں کے فلسفانہ خیالات کے مطابق تصورات سے کام لیکر نیچر کے پُر راز
پیغاموں کے جوابات دماغی اور قیاسی اور احتمالی بنیاد پر دئے ہیں اور
اس لئے بطالت اور وہم پرستی میں مبتلا ہو کر ثواب کے درجے سے گرے ہوئے ہیں
چنانچہ اِس کے ثبوت میں کہ رشی خود ثواب میں تھے ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ جب
وہ نیچر پرستی سے نیچر کے خالق کی طرف رجوع ہوئے تو وہ اپنے دیوتاؤں کیطرف
یہہ صفات منسوب کرتے ہیں جیسے پیدا کرنے والا اور سمبھالنے والا۔ رگوید چوتھا
منتر اور آیات ۵۳-۲ میں مرقوم ہی کہ دیو ودھرتا بھوداسیا پراجاپتی۔ اِسی

طرح اندرا کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قادر ہے۔ وہی سورج کو روشنی دیتا ہے۔ وہی عالمگیر معمار اور تمام الٰہی صفات سے معمور ہے۔ پھر وسواکرمن یا ہیرنیا گربھ جیسے الٰہی القاب یہہ ظاہر کرتے ہیں کہ رشی نے نیچر میں حکمت اور دانائی کا بھی کسی قدر ملاحظہ کرنا شروع کر دیا تھا اور علت کی تلاش میں پڑ گیا تھا۔ چنانچہ وہ اصلیتِ مخلوق کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ رگوید کے دسویں منڈل اور اُس کے اکاسیٰ اور بیاسیٰ منتروں میں رشی پوچھتا ہے کہ وہ کونسا جنگل تھا کونسا درخت جس میں سے دیوتاؤں نے آسمان اور زمین کو بنایا؟ اور گو ابھی تک بہت دیوتاؤں کا بیان پایا جاتا ہے مگر بعد میں جوں جوں تلاش کی طبیعت اُس میں پیدا ہوتی گئی وہ مخلوق سے خالق کی طرف رجوع ہونے لگا۔ کہیں توشتری معمار کی صورت میں خالق کہا جاتا ہے اور کہیں وسواکرمن۔ مگر ساتھ ساتھ ہی رشی زیادہ روشنی اور ہدایت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ رگوید ا۔ ۱۸۵۔ ا میں رشی پوچھتا ہے کہ آیا آسمان پہلے تھا یا زمین اور وہ کس طرح پیدا ہوئے۔ کون ایسا ودیا جاننے والا ہے جو یہہ بتا سکے؟ رشی تو سوال کر کے عالمِ سکوت اختیار کرتا ہے۔ مگر ساتپتا برہمنا اُس کا جواب دیتا ہے کہ پرتھوی پر اتھا تھی۔ رگوید ۱۰۔ ۱۳۱۔ ۷ میں رشی پوچھتا ہے کہ وہ کونسا جنگل تھا۔ کونسا درخت جن میں سے زمین اور آسمان بنائے گئے؟

اور ۱۰۔ ۱۸۔ ۴ میں پھر وہی سوال پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب تیتریا برہمنا اُس فلسفانہ خیال کے مطابق جو اُس کے وقت میں رائج تھا یہہ دیتا ہے کہ برہم وہ جنگل اور درخت تھا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ رگوید ا۔ ۱۶۴۔ ۵ میں رشی

اُس خدا کی رہائش جاننے چاہتا ہی جو خود ہستی ہی۔ رگوید ۱۰ - ۱۲۹ میں ایک مختلف بیان مخلوق کا دیا گیا ہی۔ نہ اسد تھا نہ سد وغیرہ اس کا جواب تیتریا برہمنا دیتا ہی کہ نااسد وجود نے کہا کہ میں ہو جاؤں وغیرہ۔ رشی تو اپنے بیان میں لاعلمی ظاہر کرتا ہی۔ اس سوکتا میں جو اکیم کا ذکر ہی وہ رگوید کے پہلے منڈل کے ۱۶۴ - ۶ سے ظاہر ہوتا ہی کہ کہ اگنی ہی۔ اُس میں رشی جاننے چاہتا ہی کہ اتپتا کس طرح سے ہوگئی۔ کیا کسی نے جگت کو پیدا کیا یا نہیں۔ شاید وہ جو آسمان پر ہی جانتا ہو اور شاید وہ بھی نہ جانتا ہو؟ اِسپر برہمنا اور اپنشد نے جواب کے طور پر اپنے اپنے تصورات کے مطابق حاشئے چڑھائے ہیں۔ چنانچہ ویدانتیوں نے برہم اُس کا جواب دیا ہی۔ ساتپتا برہمنا کی طرف اشارہ کرتا ہی جو سب سے پرے تھا تھا۔ چندوگیہ اپنشد کچھ اور ہی جواب دیتا ہی رشی تو خلقت میں طاقتیں اور قوتوں کا ملاحظہ کرکے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہی۔ مگر بعد کے فیلسوف تصورات کے گھوڑے دوڑا کر حقیقت کے راستہ سے تجاوز کرکے فرضی میدان پر کہیں کے کہیں نکل گئے بقول شخصے ؎ پیراں نمی پرند۔ مریداں ہمی پرانند کناد اور گوتم نے تو دنیا کی علت پرادھنا بتایا کسی اور نے ناستی جگت کی علت بتائی۔ کسی نے جگت کو انادی بتایا کسی نے برہم ہی کو جگت کی اصل بتائی۔ مگر رشیوں نے نیچر میں خدا کے علامات دیکھ کر زیادہ بالائی الہام کی ضرورت محسوس کی ہی گویا ضرورت الہام کا اپنے کو محتاج ظاہر کیا ہی +

اب اے ہندؤ! اور سناتن دھرمیو! اور آریو! یہہ آپ لوگوں پر بخوبی واضح ہو کہ ہندوستان کی تہذیبی اور اخلاقی بھبیڑی ترقی واقع ہونے کی خاص وجہ یہہ

بلکہ آپ سب نے علم کے دریا میں تصورات اور قیاسات کے بھنور میں غوطے کھائے ہیں اور
کھا رہے ہو۔ اور آپ کا کوئی بھی دست گیر نہیں ہوتا کیونکہ آپ لوگوں کو اپنے ہی دماغی
علم کے زور وطاقت پر بھروسہ ہے اور اس لئے کشتی پر سوار ہونے کی حاجت محسوس نہیں
ہوتی یہی وجہ ہے کہ آپ لوگوں میں جان نہیں پائی جاتی بلکہ ایک پژمردہ زندگی بسر
کر رہے ہو۔ دیکھ لیں کہ ویدوں میں آپ لوگوں کا کوئی لیڈر یا پیشوا نہیں ہے لیکن
انسان طبعاً چاہتا ہے کہ سچائی اس کے سامنے کسی مجسم صورت میں نظر آئے۔ یہی وجہ ہے
کہ ویدوں کے بعد کے رشیوں منیوں نے اپنے اولوالعزم بہادروں کو مثلاً رامچندر
یا کرشن جیسوں کے اقوال واطوار کو اپنے لئے قابل تقلید سمجھ کر ان کو اپنے لئے سچائی
کا دستور العمل ٹھہرایا ہے۔ اے آریو! آپ لوگوں نے جو آجکل موجودہ روشنی میں ویدوں
کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اور ان کے لفظوں میں وہ کچھ پڑھتے ہو جو موجودہ روشنی
کی بدولت آپ کو حاصل ہوا ہے تو یاد رکھو کہ ویدوں میں ضرورت الہام صاف صاف
لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے اس سے ویدوں کی کوئی گھٹتی یا تذلیل نہیں ہوتی بلکہ
توقیر اور قدر افزائی ہوتی ہے کیونکہ رشیوں نے ایسی جگہ پر لا کر آپ لوگوں کو کھڑا کیا ہے
جہاں سے اگر آپ خدا سے مانگتے وہ دیتا۔ مگر ویدوں کے معتقدین نے تو اس
پر عمل نہیں کیا اور نہ آپ کر رہے ہیں۔ آپ لوگ الہام کی جستجو میں نہیں ہیں بلکہ
بالائی الہام سے اپنے دل کا دروازہ بند کر کے اندر ہی اندر اپنا دماغی الہام پکا
رہے ہیں۔ آپ لوگ جو اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وید جملہ علوم وفنون کے
اصولوں کی کتاب ہے اور کہ سچے علم کا دوسرا نام الہام ہے یہ خیال آپ کا سراسر غلطی

پرمبنی ہی نیچر خود ایک کتاب الہام ہی اور ہم نے پہلے باب میں بواضحت دکھایا ہی کہ کیا کچھہ اُس کتاب نیچر میں سے انسان سبق لے سکتا ہی اور لیا ہی اور لے رہا ہی اور لیتا رہیگا۔ موجودہ زمانہ کی ترقیاں انسان کے معلومات کی شاہد ہیں اور جو کچھہ آجکل دریافت کیا گیا ہی وہ علم رشیوں کے خواب میں بھی نہیں گذرا۔ پہلے پہل تو لوگ قانون استخراج پر عمل کرتے رہے جس کی پیروی میں گذشتہ زمانوں کے محققوں کو بطالت کے دریا میں غوطے کھانے پڑے اور اُن کے بچاؤ کے لئے لارڈ بیکن ساموشگاف عالم اُٹھہ کھڑا ہوا اور قانون استقرار کی کشتی قائم کی جسپر سوار ہو کر آجکل کے محققان تمام عالم نیچر کا سیر کرتے پھرتے ہیں پس اگر ہم نیچر کے ذخیرہ علم کے دریافت کرنے کے لئے نری کتاب وید ہی کا مُنہہ تکتے رہیں تو ترقی کے میدان کو خیرباد کہکر یہہ یاد رکھو کہ ہندوستان کی بیڑی کبھی کنارے لگنے نہیں پاویگی۔ البتہ یہہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نیچر کی صحیح بنیاد خدا ہی وہ اُس کا خالق و مالک ہی ہم کو نیچر پر تصور دوڑانے کا مجاز نہیں ہی بلکہ ہمارا صحیح اور حقیقی کام صرف اس قدر ہی کہ حقیقتوں کو دیکھیں اور اُن کی شرح کریں۔ قوانین اور ضوابط کو دریافت کریں اور اُن کے مطابق اپنا کام دھندہ چلاویں اور خصوصاً اُس میں حکمت اور دانائی کے آثار دیکھہ کر محقق کا یہہ کام ہی کہ خدا کا جلال اور اُس کی بزرگی بجالاوے اور اُس کے دریافت کرنے کے لئے الہامی کتاب کی جستجو کرے۔ وید اگر جملہ علوم و فنون کا منبع اور چشمہ ہی جیسے نیچر خود علوم و فنون کا منبع اور چشمہ ہی تو ظاہر ہوا کہ وید اور نیچر الہام در الہام ہیں جو کچھہ نیچر سے ہم دریافت کر سکتے ہیں وہ بقول آپکے

وید سے بھی دریافت ہو سکتا ہے خیر یہہ آپ لوگوں کا اختیار ہے کہ ہندوستان کی بہبودی
کے لئے ویدوں میں سے علوم وفنون نکالتے رہیں لیکن ہم پیشگوئی سے کہتے ہیں کہ اب
ہی تو بمقابلہ یورپ کے آپکی ترقی کا دور دورہ قریباً دو ہزار برس پیچھے رہ گیا ہے لیکن آپ
لوگ اگر آئندہ بھی وید ہی کے علوم وفنون پر نازاں رہینگے اور اُس کی وسعت معلومات
کی بنیاد پر اپنے ابنائے جنس کو حقارت کی نظر سے دیکھینگے اور اُن کی کم علمی پر رحم کرتے
رہینگے اور اُس قول سے عبرت حاصل نہیں کرینگے جو کسی دل چلے نے صحیح اور نہایت ہی
صحیح کہا ہے کہ - جو طبلِ تہی ہیں وہ بنکارتے ہیں * جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ
تو یاد رہے کہ وہ وقت بھی آویگا جب آن ہیرا لایشہ را آلخ کی طرح آپ کی ہستی تک کا بھی نشان
مٹ جاویگا *

بابِ پنجم

دین عیسوی

باب اول میں جو کچھہ خدا کی ہستی و قدرت و حکمت کا بیان ہوا اُسکی کتب مقدسہ سے تصدیق ہوتی ہی۔ مثلاً اس سوال کا جواب کہ دنیا کی اصل کیا ہی۔ پیدایش کی کتاب کے شروع میں ملتا ہی جس میں یہہ منکشف کیا جاتا ہی کہ خدا کا الہام خلقت کے آغاز ہی سے شروع ہوا ہی۔ خلقت کے بیان میں نہ صرف یہہ آشکارا کیا گیا ہی کہ خدا اُسکا خالق ہی بلکہ اُس کا تواریخی اور مسلسل سلسلہ بھی بیان کیا گیا ہی جس میں خدا کی قدرت و حکمت و نیکی کو اس طور پر بیان کیا ہی کہ گویا چند مختصر الفاظِ نبوت میں صحیح بنیاد کو قائم کرکے آئندہ تہذیب اور تمدن اور اخلاق کا نقشہ کھینچا ہی۔ اِس دنیا کی تمام حرکات اور جانیں خالق کی بزرگی اور حشمت ظاہر کرتی ہیں۔ نیچر الہام کی ایک کھلی کتاب ہمارے سامنے پیش کی گئی ہی۔ وہ ہم کو خدا کی درگاہ تک پہنچاتی ہی اور از سر تا پا رموز و اسرار سے پُر ہو کر جتاتی ہی کہ یہہ زمین جسپر تم کھڑے ہو متبرک اور پاک ہی اِس لئے تم سرِ تسلیم خم کرو اور گردنِ نیاز جھکاؤ اور درگاہ الٰہی کی دہلیز پر دروازہ کھٹکھٹاؤ تا کہ کھولا جاوے۔ مانگو تا کہ دیا جاوے۔ پر اگر تم بجائے یہہ پہلو اختیار کرنے کے وہاں پر اپنا سر ٹکراؤ گے تا کہ خدا کی جگہ خود جانشین ہو جاؤ تو تمہارا سراسر نقصان ہوگا اِس لئے یہی زیبا ہی کہ اگر تم دلی ارادت اور اطاعت سے خدا کی تلاش کرو گے تو وہ اپنا دیدار تم کو عطا کریگا۔

[illegible] ہیں ہمارا بھگوان خدا ہو اسلئے اسکی عبادت و بندگی بجالانا فرزندی انسان کے شایاں ہو اور تمہاری کل روش فرمانبرداری اور انقیاد کے راستہ میں ہونی چاہئے +

جب بابا آدم باغِ عدن میں رکھے گئے تو اُس باغ کے بیچوں بیچ زندگی کا درخت اور نیکی اور بدی کی پہچان کا درخت بھی اگایا گیا۔ دونوں درخت صورت علامت تھے۔ نیکی اور بدی کا درخت اُس علم کی علامت تھا جو آدم خدا کی حلقہ بگوشی اور اطاعت میں نیکی اور بدی کی تمیز کر کے حاصل کر سکتا تھا کیونکہ خدا کے زیرِ اطاعت رہکر وہ شیطان کی آزمایش کا مقابلہ بخوبی کر سکتا تھا اور غالب آکر اپنی آزادی کے اصلی استحقاق کو پہنچ جاتا اور شریعت کی پابند آزادی کو کام میں لاکر نیکی اور بدی کی واجب اور صحیح تمیز کرتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا بلکہ خدا کی مقرر کردہ تجویز سے تجاوز کر کے اُس ممنوع درخت کے پھل میں سے یہہ سمجھہ کر کھا لیا کہ وہ خدا کی طرح نیکی اور بدی کے پہچاننے والا ہو جاویگا اُس نے فرمانبرداری سے سرتابی کر کے اور خدا کی حلقہ بگوشی سے انکاری ہو کر اپنے دماغ اور تصور میں خدا کے برابر ہونیکا احتمال کیا جسکا نتیجہ یہہ ہوا کہ نیکی اور بدی کی تمیز تو اُسکو تجربہ کر کے حاصل ہوئی مگر اس طور پر کہ عبد کی حیثیت میں اُس نے اپنے معبودِ حقیقی کی نافرمانی کی اور وہ پاکدامنی اور عصمت کی حالت جس میں وہ فرمانبرداری کی راہ سے ایک نیک خلق اور پاک انسان بنتا نہ رہی اور اُس کی روح میں گُناہ کے بیج کے دخل یاب ہونے سے اُس کو زندگی کے عوض میں موت کا مُنہہ دیکھنا پڑا +

کیونکہ تم خدا نہیں ہو بلکہ بندگانِ خدا ہو اِسلئے اُسکی عبادت و بندگی بجالانا تمہاری شان کے شایاں ہو اور تمہاری کل روش فرمانبرداری اور انقیاد کے راستہ میں ہونی چاہیئے +

جب بابا آدم باغِ عدن میں رکھے گئے تو اُس باغ کے بیچوں بیچ زندگی کا درخت اور نیکی اور بدی کی پہچان کا درخت بھی اگایا گیا۔ دونوں درخت صورتِ علامت تھے۔ نیکی اور بدی کا درخت اُس علم کی علامت تھا جو آدم خدا کی حلقہ بگوشی اور اطاعت میں نیکی اور بدی کی تمیز کر کے حاصل کرسکتا تھا کیونکہ خدا کے زیرِ اطاعت رہکر وہ شیطان کی آزمایش کا مقابلہ بخوبی کرسکتا تھا اور غالب آکر اپنی آزادی کے اصلی استحقاق کو پہنچ جاتا اور شریعت کی پابند آزادی کو کام میں لاکر نیکی اور بدی کی واجب اور صحیح تمیز کرتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا بلکہ خدا کی مقرر کردہ تجویز سے تجاوز کر کے اُس ممنوع درخت کے پھل میں سے یہہ سمجھ کر کھالیا کہ وہ خدا کی طرح نیکی اور بدی کے پہچاننے والا ہوجاویگا اُس نے فرمانبرداری سے سرتابی کر کے اور خدا کی حلقہ بگوشی سے انکاری ہوکر اپنے دماغ اور تصور میں خدا کے برابر ہونیکا احتمال کیا جسکا نتیجہ یہہ ہوا کہ نیکی اور بدی کی تمیز تو اُسکو تجربہ کر کے حاصل ہوئی مگر اس طور پر کہ عبد کی حیثیت میں اُس نے اپنے معبودِ حقیقی کی نافرمانی کی اور وہ پاکدامنی اور عصمت کی حالت جس میں وہ فرمانبرداری کی راہ سے ایک نیک خلق اور پاک انسان بنتا نہ رہی اور اُس کی روح میں گُناہ کے بیج کے دخل یاب ہونے سے اُس کو زندگی کے عوض میں موت کا مُنہہ دیکھنا پڑا +

یہہ تو سچ ہی کہ انسان آزاد ہی مگر خدا کی اطاعت ہی اُسکی شانتی اور اطمینان کا باعث ہی۔ کل بنی نوعِ انسان کا یہی حال نظر آتا ہی کہ وہ اپنے تئیں خدا کے سپرد کرنے اور اُس سے دریافت کرنے کے بجائے آدم ہی کی آزمایش میں مبتلا ہوتے ہیں وہ بھی خدا کو اپنے دماغ اور تصور سے جاننا چاہتے ہیں گویا کہ بحرِ ناپیدا کنار کو کوزہ میں بند اور غیر محدود کو محدود اور مقید کرتے ہیں اور متعلم بننے کی جگہ عالم بنتے ہیں۔ ایمان کی جگہ دماغ کو کام میں لاتے ہیں۔ استقرار کی جگہ استخراج سے سب کچھہ مستنبط کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ +

ع نشوی واقفِ یک نقطہ ز اسرار وجود + گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوران را +

جسکا نتیجہ یہہ ہوا کہ یا تو خدا کا انکار کیا گیا ہی اور یا خود خدا کی جگہ جاگزیں ہوئے ہیں اور یوں انواع و اقسام کے اوہامِ باطلہ میں مبتلا ہو گئے ہیں +

پیدایش کی کتاب علاوہ اِس کے جیسا اوپر بیان ہوا ہی سلسلۂ پیدایش بھی بالترتیب والتوضیح ظاہر کرتی ہی جس میں خدا کی قدرت و حکمت و رحمت کی بنیاد ڈالی گئی ہی اور اُن کا دریافت کرنا انسان ہی پر جو خدا کا ہمشکل بنایا گیا ہی چھوڑا گیا ہی۔ خدا کی خلقت میں قدرت اور حکمت اور رحمت عیاں و بیاں ہی مگر جسکو انسان جس کی عقل محدود ہی ایک دن میں دیکھہ نہیں سکتا بلکہ اُن کا انکشاف انسانی عقل و ذہن میں زمانوں کے تواریخی دور میں پے در پے اور درجہ بدرجہ ہوتا ہی +

پیدایش کی کتاب خلقت کا ایک تواریخی سلسلہ بیان کرتی ہی تاکہ انسان کو انگشتِ شہادت کی طرح یہہ دکھاوے کہ یہانتک تیری رسائی کا امکان ہی اور آگے نہیں

چونکہ علم انسانی محدود ہی اسلئے وہ انسان کے معلومات کی ایک صحیح حد باندھتی ہی تاکہ
اُس حد سے تجاوز کرکے وہ غلطان و پیچاں نہ ہونے پاوے سلسلۂ پیدائش کے
مختلف طبقات کو لفظ باڑا اور عاشا سے جدا جدا کرکے انسان کی تحقیقات کی صحیح بنیاد
ڈالی ہی۔ البتہ سائنس کا جتانا اُسکا کام نہیں ہی یہہ استحقاق انسان ہی کو عنایت
ہوا ہی کہ وہ مخلوقِ خدا میں حقائق و معارف کو دریافت کرے اور اُسکی قدرت و حکمت
وغیرہ مشاہدہ کرکے اُسکی بزرگی بجالاوے اور قوانین وضوابط کو کام میں لاکر
خدا میں خوشحال رہے۔ لیکن جہاں سائنس نے خدا کو الگ کرکے انسانی قیاسات
اور احتمالات کی بنیاد پر موجودات کی اصل کو دریافت کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہی وہاں
ایسے محقق کو بھی آدم کی آزمایش میں پڑکر بطالت کا منہہ دیکھنا پڑا ہی۔ سائنس کی
صحیح بنیاد موجودات کی حقیقت پر ہی نہ فرض اور تصور پر۔ جب حقائق موجود ہیں
تو اُن کی تفسیر و تفصیل کرنی۔ ان میں قوانین وضوابط کا دریافت کرنا تو سائنس
کا پورا استحقاق ہی مگر تصور باندھنا یا فرض کرلینا صحیح سائنس نہیں ہی صحیح سائنس
نیچر کے اجسام اور کوائف میں جو ظاہری اور باطنی خوبیاں پائی جاتی ہیں ان سے
داد و ستد کرکے انسانی معاشرت اور خوشی اور حظ کے سامان اخذ و مہیا کرتا رہتا
ہی اور خدا کی حکمت و حشمت کی بھی داد دیتا ہی اور اُسکا ایسا کرنا انسان کی ترقی
روز افزوں اور افزایش اور خوشی کا باعث ہوتا ہی٭

پیدایش کی کتاب میں ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس وقت خدا نے اِنسان کو
پیدا کیا اُسکی رہائش کے لئے ایک خاص جگہ تیار کی گئی اور گو اسکو خدا نے اپنی صورت

شکل پر بنایا اور تمام مخلوقات کا سردار مقرر کیا تاہم اُس کی مخلوقی حیثیت کو بھی ظاہر
کیا چنانچہ مرقوم ہے کہ مٹی لیکر (وہ مٹی جو خلق ہو چکی تھی) آدم کو بنایا۔ اس فعل سے
خدا تعالیٰ نے انسانی رتبہ اور پایہ کو قائم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موجودات کو متبدل کر کے
اپنے کام میں تو لا سکتا ہے مگر خلق کرنا اُسکی ذات اور امکان سے باہر ہے۔ خلق کرنا صرف
خدا ہی کا کام ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اُس مٹی کے پتلے میں زندگی کا دم پھونکا جس سے یہہ
مراد ہے کہ اُسکو روحانی بنایا اِسی لئے انسان کی بناوٹ میں دونوں الفاظ عاشا
و بارڑا استعمال ہوئے ہیں مثلاً (۱: ۲۶) میں נעשה مرقوم ہے
اور (۱: ۲۷) میں تین بار لفظ ברא آیا ہے۔

آدم کو اُس خاص جگہ یعنے باغ عدن میں رکھا۔ پیدایش (۲: ۵) میں مرقوم
ہے کہ "جس دن خداوند خدا نے آسمان و زمین کو بنایا اور میدان کے سب نباتات
کو اُس سے آگے کہ وہ زمین پر تھی اور میدان کی سب گھاس کو جو ہنوز نہ اُگی تھی کہ خداوند
نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرتا" الخ۔ یہہ بیان باغ
عدن کے متعلق ہے اور نباتات کے پھوٹ پڑنے اور نشو و نما پانے کے بارہ میں
ہے جسکا انحصار مینہہ اور انسان کی محنت اور تربیت پر تھا کیونکہ لفظ השדה سے وہ
زمین کا مزروعہ قطعہ یا حصہ مراد ہے جو کاشتکاری کے لائق ہو جیسے ۱۹ ویں آیت میں
بھی زمین کے بہائم سے وہ بہائم مراد ہیں جو کھیتی سے گزارہ کر سکیں۔ اس خاص
قطعہ زمین میں آدم کو رکھا گیا تاکہ وہ استعداد و دیعی کو جو پیدایش کے ساتھ عطا
ہوئی تھی کام میں لا کر باغ کی خبرگیری کرے اور اُس کو آراستہ و پیراستہ کر کے

حسب حیثیت اپنی رہائش کے لائق بناوے اور بہائم اور پرندوں پر بھی اپنی حکومت کا سکہ جماوے جنگل کو منگل اور حیوان اور پرند کو تربیت دیکر مہذب بناوے۔ زمین میں اپنی شان وشکوہ کو ظاہر کرے۔ اُسپر اپنی روح کے نقش ونگار کی نورانی تصویر کھینچکر یادِ عظمت ڈالے تاکہ اُسکا کام نیچر کے متعلق اُسپر ایک شفاف آئینہ کی طرح اپنے خالق کے جلال وبزرگی کو ظاہر وباہر کرے +

باغ عدن میں آدم کی حیثیت اور رتبہ کا نقشہ نبوت کے طور پر تمام آیندہ بنی نوعِ انسان کو دکھایا گیا ہی۔ وہ زندگی کا درخت جو باغ کے بیچوں بیچ تھا اسی حقیقت کی علامت تھا کہ آدم اپنی استعداد ودیعی کو عمل میں لاکر روز بروز تہذیب اور اخلاق میں ترقی کرے اور نیز اپنی جسمانی زندگی کو بھی روحانی لباس پہناکر جلالی بناوے لیکن واجب فعل کے ظہور میں نہ آنے کی وجہ سے اُس کی ترقی ٹھہری واقع ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ باغ عدن میں علاوہ روحانی زندگی میں نشوونما پانے کے آدم موجودات کی تحقیقات کے لئے بحیثیت اول سائینٹسٹ رکھا گیا تاکہ وہ خدا کے زیر سایہ عاطفت اور اطاعت ہوکر روز بروز تہذیب اور اخلاق میں ترقی کرے اور بہائم اور پرندوں اور تمام نیچر کو اپنی حکومت میں لاوے اور یوں خدا کی قدرت وحکمت اور رحمت مشاہدہ کرکے اُسکی حمد وثنا اور تمجید وستایش بجالاوے اور اُسی میں خوشحال رہے +

کتب مقدسہ سائنس کے اصول نہیں جتاتی ہیں کیونکہ وہ اصول تو مخلوق میں جابجا مرکوز ہیں جن کو انسان خود دریافت کرتا ہی۔ نیچر تو خود الہام کی ایک کھلی کتاب

ہمارے سامنے پیش کی گئی ہو زمین کی بنیاد حکمت پر رکھی گئی ہی اور وہ یہہ جتاتی ہی کہ انسان خود اُن اصولوں کو جو نیچر میں مرکوز ہیں دریافت کر کے اپنے کام میں لاوے اور بطفیل اُنکے خدا کے نشانات اور علامات کو دیکھہ کر خدا کا طالب ہو اور گردن نیاز جھکا کر اُس بے نیاز کی تعظیم بجا لاوے لیکن جو انسان سے خود بخود نہیں ہو سکا اُسکو خدا نے اپنے ہاتھہ میں لیا ہی اور اپنے فضل اور توفیق کا دروازہ کھول دیا ہی تاکہ انسان فضل کا بندہ ہو کر اپنی زندگی کی علت غائی کو بتدریج حاصل کر سکے ❖

آدم کی عصمت اور عفت کی حالت سے گرنے کی وجہ سے ترقی ٹیڑھی واقع ہوئی ہی چنانچہ پیدایش کی کتاب میں انسان کا گرا ہوا پہلو بھی دکھایا گیا ہی اور وہ پہلو بھی جو فضل کا ہاتھہ پکڑ کر زندگی کے گذرگاہوں کو طے کرتا ہی منکشف کیا گیا ہی۔ پہلے میں وہ خدا سے جدا ہو کر اور دنیا کے غیر واجب استعمال سے رفتہ رفتہ خستہ اور برباد اور باطل پرست اور وہم پرست ہو جاتا ہی۔ چنانچہ جب آدم سے نافرمانی ظہور میں آئی تو عصمت کی حالت سے گرنے کی وجہ سے گو وہ پاکیزگی میں خود بخود ملبوس نہ ہو سکا تاہم وہ خدا سے ہراسان اور خائف ہوا اور اُس نے اپنے گناہ کا اقرار بھی کیا اور فضل کا ہاتھہ بھی پکڑا۔ لیکن اُس کے بیٹے قائن میں ہم گناہ کی ترقی کو دیکھتے ہیں جو فی الآخر ایسا مرتد ہو جاتا ہی کہ اپنے گناہ کا اقرار تک بھی نہیں کرتا اور نہ نادم و پشیمان ہوتا ہی۔ خدا کے حضور سے برگشتہ ہوتے ہی اپنی اولاد سمیت دنیا میں اپنا سہارا ڈھونڈھتا ہی اور اس دوڑ دھوپ اور تگ و دو میں رہتا ہی کہ حتی الوسع دنیا کو کمائے حتیٰ کہ ایک شہر بناتا ہی گویا کہ نفسانی بادشاہت کی عمارت میں بنیاد کی پہلی اینٹ رکھتا ہی اور

شہر مذکور کو اس خام امید پر اپنے بیٹے حنوق کے نام سے موسوم کرتا ہے تاکہ اُسکی اولاد ہمیشہ تک قائم رہے۔

یہہ دنیا داری کی ایک بڑی بھاری نشانی ہے۔ چنانچہ زبور میں مرقوم ہے کہ وہ اُن کے دل میں خیال تھا کہ ہمارے گھر تا ابد قائم رہیں گے اور ہمارے مسکن پشت در پشت وہ اپنے نام اپنی زمینوں پر رکھتے" الخ۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ قائن سے ایک بڑی اولاد پیدا ہوئی جو تہذیب میں ترقی کرتی گئی مثلاً بربط اور بین اور بڑے بڑے اعلیٰ سے اعلیٰ ساز بناتے اور پیتل اور لوہے پر کام کرنے والے کاریگر بن جاتے اور گو سائنس میں ترقی کرتے تھے لیکن اپنی خداداد استعداد اور لیاقتوں کو خدا سے منحرف ہو کر غیر واجب استعمال میں لاتے تھے۔ یہی بیدینی اور دنیا داری ہے جسکو ایوب کھول کر بیان کرتا ہے "وہ گلے کی مانند اپنے بال بچّوں کو باہر لیجاتے اور اُن کے لڑکے بالے ناچتے ہیں۔ وہ طبلے اور بربط لیتے ہیں اور بانسری کی آواز سے خوش ہوتے ہیں۔ وہ عیش و عشرت سے اپنی عمر بسر کرتے ہیں . . . تسپر بھی وہ خدا سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس سے جاتا رہ کیونکہ ہم تیری راہوں کی پہچان نہیں چاہتے ہیں۔ قادرِ مطلق کون ہے کہ ہم اُس کی بندگی کریں" (ایوب ۲۱: ۱۱) خدا کو چھوڑ کر بے دینی آدم کے گناہ کا نتیجہ ہوا ہے یعنے خدا سے جدا ہو کر انسان نے اپنی عطیات اور نیچر کی بخششوں اور نعمتوں کو حلال کی جگہ اپنے اوپر حرام کیا کیونکہ نفس پروری اُسکی زندگی کا شیوہ ہو گیا۔ اس لئے جب خدا نے پیش بینی سے آدم کی قائمقامی کے سبب دنیا کو بھی لعنت میں شریک

کیا تو اُس کا خاص مطلب یہی تھا کہ وہ دنیا جو آدم کی فرمانبرداری اور حلقہ بگوشی میں اُس کے فائدہ کا باعث ہو سکتی تھی گناہ کی وجہ سے سراسر اُس کے نقصان کا باعث ہوئی*

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ لمک جو قائن کی چھٹی پشت میں تھا اُس میں نفس پروری اور بے دینی ایک غایت درجہ تک پہنچ گئی۔ پیدایش کی کتاب (۴: ۲۳ و ۲۴) میں مرقوم ہے کہ اُس نے نہ صرف دنیا ہی کو غیر واجب استعمال سے اپنے اوپر حرام ٹھہرایا بلکہ وہ اپنی عقلی استعداد اور لیاقتوں کو بھی غیر واجب استعمال میں لایا چنانچہ اُس نے طبع آزمائی کر کے ایک گیت بنایا جسکا مضمون یہہ ہے "کہ میں آدمیوں کو اپنے زخم کے لئے اور نوجوانوں کو اپنی ضرب کے لئے بدلے میں مار ڈالتا ہوں قائن کا بدلہ سات گنا لیا جاویگا لیکن لمک ستہتر گنا بدلہ لیگا" اس گیت کے نفس مضمون سے صاف صاف نظر آتا ہے کہ گناہ کے دخلیاب ہونے سے انسان کا مرض یہانتک بڑھتا گیا کہ اُسکی عقل اور ضمیر بھی اُسکے قابو میں نہ رہی۔ کہاں دانت کے بدلے دانت جو انسانی سوسائٹی کی کل میں انصاف کو قائم رکھنے کے لئے ایک ضروری پردہ ہے۔ وہ لمک میں یہانتک ضائع ہو گیا کہ اُس کا نشان تک بھی مٹ گیا۔ یہہ وہ گناہ ہے جس کا ذکر مکاشفات میں بھی پایا جاتا ہے "کہ اُسکو انسان کا منہہ دیا گیا اور وہ بڑا بول بولتا تھا" یہہ وہ غرور اور تکبر اور شوخی و گستاخی ہے جس کا حبقوق نبی اپنی کتاب میں ذکر کرتا ہے (۱: ۱۱) تب اُنکی طبیعت اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی اور وہ گذر جاتے اور گناہ کرتے ایسا گمان کر کے کہ یہہ میری قوت میرے

معبود کی طرف سے ہے" (یعنے میری قوت ہی میری معبود ہی) یہوواہ بھی اپنے خط میں ایسوں کاذکر کرکے کہتا ہی کہ "یہ وہ ہیں جو قائن کے راستے پر چلے گئے ہیں" یہی وجہ ہی کہ آدم سے نوح تک تمام انسانی نسلیں تباہ کی گئیں تاکہ آئندہ نسلوں کو عبرتاً اور صاف صاف دکھایا جاوے کہ بے دینی کا انجام کیا ہوگا۔

مگر پیدایش کی کتاب میں انسان کا دوسرا پہلو بھی دکھایا گیا ہی جس میں وہ خدا کے فضل کا ہاتھ پکڑکر دینداری میں عمر بسر کرتا ہی۔ مثلاً ہابیل کی نذر میں ہم اُس کے طبعی ایمان کو دیکھتے ہیں۔ وہ نذر اُس ایمان کو ظاہر کرتی ہی جو دنیاوی تعلقات میں خدا کی جدائی محسوس کرکے گردن نیاز جھکاتا ہی اور خدا کی قربت اور نزدیکی حاصل کرنے کے لئے اپنی قربانگاہ پر امنگ اور آرزو کے دھوئیں درگاہ الٰہی میں پہنچاتا رہتا ہی۔ ہابیل کے بعد اُس کا بھائی سیت پیدا ہوا اور سیت سے آنس یا آنوش بمعنے ضعیف یا فانی بشر گویا کہ اُس نے وہ پہلو اپنے لئے معمول بنایا جو ہر ایک انسان کو خدا کے سامنے اختیار کرنا زیبا ہی یعنے خاکسار اور فروتن پہلو اور یہی وجہ ہی کہ پہلے پہل اُسی کی اولاد خدا کو پکارنے لگی۔ پیدایش (۴: ۲۶) میں مرقوم ہی "کہ آنوش کے وقت سے لوگ یہوواہ کا نام لینے لگے"، یعنے خدا سے دعا مانگنا اور اُس کی حمد و تمجید اور شکر گذاری بجالانا شروع کر دیا۔ اور اس طرح سے سیت کی اولاد نے گویا کہ خدا کی عبادت اور اُس کی بادشاہت کی عمارت کے قائم کرنے میں پہلی بنیادی اینٹ ڈالی حتیٰ کہ دینداری میں ترقی کرتے کرتے حنوق اور نوح میں ہم ایسے اشخاص کو دیکھتے ہیں جو خدا کے ساتھ ساتھ چلتے تھے یعنے

اُن کی زندگی میں نہ صرف دینداری پائی گئی بلکہ اُن کو وہ رتبہ حاصل تھا کہ وہ
فضل کے بندے ہوکر خدا کے مکالمات اور مخاطبات سے شرف حاصل کرتے
تھے۔ ہم نے دوسرے باب میں الہام کے متعلق یہہ کہا تھا کہ الہام خدا اور انسان
میں ایک توصل اور میل کی صورت ہی۔ چنانچہ آدم کے گرنے کے بعد سے حنوق
اور نوح میں ابتدائی نقشہ نبوت اور الہام کا دکھایا گیا ہی اور ہم آگے چل کے
یہہ دکھائینگے کہ الہام کس طرح مختص صورت سے صورت عامہ اختیار کرتا ہی۔ اور
پھر حنوق کا زندہ آسمان کی طرف اُٹھالیا جانا یہہ ظاہر کرتا ہی کہ گو خدا بے دینوں
کو ہلاک کریگا لیکن اُس نے انسان کو بالکل متروک نہیں کیا بلکہ درِ فضل کو وا کرکے
حنوق کی زندگی سے یہہ ظاہر کیا ہی کہ وہ ایک مومن کو ہمیشہ کے لئے لقمۂ نہنگِ
اجل نہیں کریگا بلکہ اُسکو بقا کا لباس پہنا کر جلالی بنا دیگا۔ اسکا بیان فصاحت
کے ساتھ نئے عہدنامہ میں پایا جاتا ہی کیونکہ وہی خدا جس نے گناہ کی مزدوری
موت مقرر کی اُسی نے مسیح میں ہوکر موت کو مغلوب کیا اور اب بہت سے حنوق
اور الیجاہ جیسوں کو آبِ حیات دینے کے لئے طاقت رکھتا ہی اور نوح کا کشتی کی
معرفت ہلاکت کے طوفان سے محفوظ رکھا جانا یہہ ظاہر کرتا ہی کہ نجات فضل سے ہی
جو کچھہ اوپر بیان ہوا اُسکے مطابق اب یہہ دیکھنا چاہئے کہ وہ لوگ جو مسیحی نہیں مگر
دنیا اور مافیہا دونوں کے قائل ہیں کیا وہ وارث جہنم ہونگے؟ اس کے جواب
میں مطابق بیان متذکرہ بالا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو بے دین ہیں جنہوں نے
اپنی زندگی کے کل حصوں سے خدا کو خارج کیا ہوا ہی اور جو نہایت ہی تکبر اور غرور اور

نخوت سے کہتے ہیں خدا کون ہے کہ ہم اُس کی عبادت کریں۔ ہم اُس کی راہوں کی پہچان نہیں چاہتے۔ الحاصل وہ لوگ جو تمام دنیا کو کمانا چاہتے ہیں لیکن اپنی روح کی فکر میں نہیں ہیں وہ خواہ کسی مذہب یا کسی مشرب کے پابند کیوں نہ ہوں سب کے سب وارثِ جہنم ہیں۔ اب رہا یہہ کہ بہشت کے وارث کون ہو سکتے ہیں سو اِسکے جواب میں دو امور ہیں جو آپس میں شرط مشروط کی صورت میں وابستہ ہیں یعنے خدا کی درگاہ میں مقبول ہونا ایک امر ہے اور نجات حاصل کرنا امر دیگر ہے۔ انسان کی طرف سے اطاعت اور فرمانبرداری اور ایمان خدا کی درگاہ میں مقبول ہونے کے لئے شرائط ہیں لیکن خدا کی طرف سے اُسکو نجات کے لباس سے ملبوس کیا جاتا ہے۔ پہلے امر کے متعلق ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ خدا کسی مذہب کا پاس نہیں کرتا بلکہ کوئی شخص بجائے خود خواہ وہ کسی مذہب کا معتقد ہو یا نہ ہو اگر اُس روشنی کے مطابق جو نیچر اور کانشنس کی بدولت اُسکو عطا ہوئی خدا کو جانکر خدائی کے لائق اُس کی بزرگی اور شکرگذاری کرتا ہے اور صانع کی قدرت و حکمت کو دیکھ کر پے در پے بلائیں لیتا ہے وہ خدا کی نظر میں مقبول ہے۔ کتب مقدسہ میں جا بجا ایسی نظیریں پائی جاتی ہیں جن سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایوب کی سرگذشت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ یہودی بھی نہ تھا تاہم اپنے خالق و مالک کا یقین دل میں رکھتا تھا اور اُس نے اُس کی اطاعت میں اپنا سر جھکایا ہوا تھا۔ دنیا کے دھندوں میں ایسا الجھا ہوا نہیں تھا کہ بے دینی اُسکی زندگی کا مقصد ہونے پاوے بلکہ اپنی معلومات کے مطابق رضاءِ مولا میں مصروف رہتا تھا۔ یہہ شخص خدا کی نظر میں منظور

ہوا مسیح کی پیدایش کے وقت مجوسیوں کی پہنچری لیکن دینی تجسس اور تلاش میں
خدا نے اُن کی مدد کر کے اُن کو مسیح تک پہنچایا۔ مسیح نے خود اپنے ایام زندگی میں
ایسے اشخاص کو اپنے درسی حلقہ میں لیا جو پہلے ہی سے حقیقی دین کی جستجو میں مصروف
تھے۔ ایک رومی سپہ سالار کی نسبت جو دیندار اور عابد تھا اُس نے یہہ شہادت دی
کہ میں نے ایسا بڑا ایمان تمام اسرائیل میں بھی نہ پایا۔ بلکہ کسی خاص کا پاس نہ کر کے نبوت
کی راہ سے یہہ بھی کہا کہ "میں تم سے کہتا ہوں کہ بہتیرے پورب اور پچھم سے آئینگے اور
ابرہام اور اضحاق اور یعقوب کے ساتھہ آسمان کی بادشاہت میں بیٹھینگے پر بادشاہت
کے فرزند باہر کے اندھیرے میں ڈالے جائینگے" (متی ۸: ۱۰) ایسے اشخاص خواہ
وہ کسی مذہب کے پیرو اور کسی مشرب کے مقید ہوں خدا کو منظور ہیں۔ یہہ
ہرگز نہ سمجھو کہ کتب مقدسہ میں خدا نے عیسائیوں اور یہودیوں کی ٹھیکہ باندھہ چھوڑی
ہی بلکہ ہمارا یقین ہی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت ایسے اشخاص ہونگے جو واقعی
دیندار ہیں اور بے دینی سے کوسوں دور بھاگتے ہیں اور خدا کے حقیقی عرفان کے
طالب ہیں وہ اشخاص خدا کی درگاہ میں مقبولِ نظر ہیں بلکہ وہ لوگ جو اس دار فانی سے
رحلت کر چکے ہیں مگر اپنی حینِ حیات میں اپنے معلومات کے انتہائے حد تک عابد و
دیندار اور خدا کی جستجو کے درپے اور اُسکے دیدار کے طالب تھے وہ خدا اسے ضرور
منظور کئے ہونگے اتنا اعتراف کر کے اب ہم دوسرے امر کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنے
یہہ کہ نجات حاصل کرنے کے لئے فقط ایک ہی راہ ہی۔ خدا بندوں کو صرف منظور
ہی نہیں کرتا بلکہ اُن کی نجات بھی بہم پہنچاتا ہی۔ یہہ نجات خدا نے ازل سے مقرر کی ہوئی

ہو۔مسیحی مذہب کے شیوع کے پہلے صبح صادق کا چمکتا ہوا نجات کا تارا خدا کے ازلی ارادہ سے طلوع ہو کر انسانی تواریخ کے دور دوران میں آفاقِ عالم تک انبیا کے قلبوں میں چمکتا ہوا آفتاب نصف النہار کی طرح یہودیہ کے آسمان پر اپنی پوری تجلی اور شعاعوں کے ساتھ مسیح میں منوّر ہوا۔مسیحی مذہب عالمگیر مذہب ہے۔یہہ کسی کا پاس نہیں کرتا۔اسکو کسی کے رتبہ کا لحاظ نہیں بلکہ یوں مرقوم ہے کہ جو چاہے آئے۔جو ڈھونڈھے اور مانگے سو پائے خدا نے جہان کو پیار کیا۔اگر کوئی پیاسا ہو تو مجھہ پاس آئے وغیرہ۔اِس لئے وہ جو مسیح کے آنے سے پہلے مر چکے تھے لیکن خدا کو منظور تھے اُن کی نجات کا کام خدا کی روح نے پورا کیا کیونکہ اُس کی روح جہاں چاہتی اور جس طرح چاہتی اور جب چاہتی ہے اپنا عمل ظہور میں لاتی ہے اور اب وہ جو مسیح پر ایمان لاتے ہیں نجات حاصل کرتے ہیں کیونکہ مسیح نے زمانہ کی بھرپوری میں نجات کے کام کو پورا کیا ہے اور اسلئے یہہ لکھا ہے کہ خدا ایک ہے اور خدا اور آدمیوں کے بیچ ایک آدمی بھی درمیانی ہے وہ مسیح ہے +

اگر یہہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ ایک ہی خدا ہے جو ہم سب کا خالق و مالک ہے تو یہہ بات بھی یقین کرنے کے لائق ہے کہ راہ نجات بھی ایک ہی ہے۔اب ہم یہہ دیکھیں کہ نجات کے معنے کیا ہیں۔نجات کس بات سے ہے؟ اور نجات کا مقصد اور انجام کیا ہے؟ پہلے جملہ کا جواب مختصرًا فی الحال یہہ ہے کہ نجات خدا کے قہر و غضب سے۔ہم اس امر کا ذکر کر آئے ہیں (دیکھو باب اول متعلق کانشنس) کہ انسان واقعی اپنے گناہوں کا لحاظ کر کے خدائے پاک کی طرف نظر دوڑانے سے کنارہ کش ہوا ہے لیکن اپنے آپ کو چاروں طرف سے سحر و محصور پا کر اُس نے اپنا سا ہم خیال خدا بنا لیا ہے اور اُس کے

خوش کرنے کے لئے صدہا تدبیریں چڑھاوے اور یگ اور قربانی کی عمل میں لایا ہی۔ اس
مقام پر یہہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خداوند خدا ایک قدوس اور عادل خدا ہی اور اپنی
قدوسی کا محافظ ہی۔ ہم اُس کی پاک شریعت کے جو اُس نے ہم کو عنایت کی مقروض ہیں
اور قرضہ ادا کرنے کی قابلیت نہ رکھکر اُس کی نظر میں مجرم ہیں۔ ہماری ضمیر کی شہادت
ہمارے برخلاف ہی۔ ہمارا اپنا دل ناقابل معافی جرائم کے ارتکاب سے ہم کو ملامت کرتا
ہی اور اس لئے خدائے پاک کی طرف نظر دوڑانے سے ہم کنارہ کش ہوتے ہیں خدا کے
قہر وغضب کی تلوار ہمارے اوپر جھوم رہی ہی۔ اس حالت میں ہماری نجات کی پہلی
صورت یہی ہی کہ ہم اُس کے قہر سے بچیں اور راستبازی کے لباس میں جو ہم کو ہمارے
جرائم کے ارتکاب سے بچاوے خدائے عادل وپاک کے حضور آنے سے نہ ڈریں
اور خدا بھی ہم کو اُس لباس میں دیکھے جس میں ہماری خطائیں ڈھانپی گئی ہیں
اور ہمارے گناہ حساب میں نہیں لائے جاسکتے۔ قرآن کی تعلیم خدا کی قدوسی کا لحاظ
نہیں رکھتی اور اس کی وجہ خاص یہہ ہی کہ محمد صاحب خود خدا کی قدوسی سے
کنارہ کش ہوئے اور خدا کی رحمت کی آڑ میں ہو کر خدا کو اپنا ہم خیال بنایا اور اُس کے
قہر وغضب سے یہہ کہکر بچا چھڑایا کہ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا
(سورۂ نسار رکوع ۴) یعنے ارادہ کرتا ہی اللہ کہ ہلکا کرے تم سے۔ اور بیدا کیا گیا آدمی
ناتوان۔ اس پر مولوی ڈاکٹر نذیر احمد خان صاحب تشریح کرتے ہوئے فخریہ کہتے ہیں
کہ نجات ابدی کے لئے قرآن نے بڑی سادگی اور سہولیت پیدا کی ہی چنانچہ عملوں
کی فہرست میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج بیان کرکے زیادہ آسانی کے لئے عذرات کی

ایک جداعقد منسلک کرتے ہیں چنانچہ تیمم۔ نماز قصر۔ قضائے فائتہ اور فرض کے لحاظ سے بھی سورۃ فاتحہ کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی تین آئتیں بیڑا پار کرتی ہیں۔ رکوع و سجود میں ایک ایک دفعہ تسبیح صبح کو دو رکعتیں۔ ظہر عصر کو چار چار۔ مغرب کو تین۔ دن رات میں پانچ نمازیں جن کا مجموعی وقت زیادہ سے زیادہ آدھہ گھنٹہ۔ روزے برس میں ۲۹۔ ۳۰ بیمار مسافر کو اجازت قضا۔ زکوۃ صاحب نصاب پر برسویں دن مال کا چالیسواں حصہ۔ حج عمر بھر میں ایک بار وہ بھی بشرط استطاعت . . . بس ایک توحید اور اتنے سے عمل پر اسلام نجات ابدی۔ خوشنودی خدا اور بہشت کا ذمہ لیتا ہی،، افسوس امولوی صاحب نے نجات کے مطلب ہی کو نہیں سمجھا اور کیونکر سمجھتے جب کہ نجات کے معنے کو خود قرآن کا بانی مبانی بھی نہ سمجھا۔ افسوس مولوی صاحب نے یہہ نہ دیکھا کہ یہہ تمام آسانیاں خدائے قدوس سے انسان کو دلق ملمع میں چھپا کر اُسکو اپنی حالت زار سے آشنا ہونے نہیں دیتیں محمد صاحب کے حالتِ زندگی سے ہم نے یہہ صاف صاف ثابت کرکے دکھایا ہی کہ آپکا عرفانِ خدا صحیح نہیں تھا۔ گو وہ یہہ یقین کرتے تھے کہ خدا ہی مگر اس امر سے بے بہرہ تھے کہ خدا میرے لئے کیا ہی۔ آپنے خدا کی رحمت کی آڑ میں ہوکر خدا کی قدوسی سے اپنا منہہ چھپایا ہوا تھا اور اُسی رحمت کی آڑ میں آپسے بہت بری بری کرتوتیں ظہور میں آئیں اور اسی رحمت کی آڑ میں آپ جنگی مخصوں اور جنگی بکھیڑوں اور سیاستی امور اور دنیاداری میں اُلجھے رہے اور آخرت کا کم فکر کیا اور اپنی امت کے لئے یہہ آسانیاں وصیت کر گئے جنکو بڑے بڑے قرآن کے مولوی صاحبان مایہ ناز و فخر سمجھتے ہیں اونہیں دیکھتے کہ قرآن میں خدا ایسا دکھایا گیا ہی گویا کہ وہ انسان سا کیرکٹر رکھتا ہی اور انصاف اور قدوسی

کی صفات سے متصف نہیں ہی اور نہ یہہ دیکھتے ہیں کہ نجات کا کوئی راستہ بھی قرآن نہیں دکھاتا ہی۔ اگر محمد صاحب خدا کی قدوسی کا لحاظ رکھتے تو اُن کا مذہب کچھ اور ہی صورت اختیار کرتا اور وہ اپنی بدکرداریوں کو پہچانکر اور قابلِ نفرین کرتوتوں سے نافر ہوکر خاک و ٹاٹ اوڑھہ کر توبہ کر لیتے اور گردن نیاز جھکاکر نجات کی کھوج کے درپے ہوتے۔

اخلاق کے متعلق دو باتیں مدِ نظر رکھنی چاہئیں۔ اول مجھے کیا ہونا چاہئے دوم مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اگر میں پہلے اصول سے قطع نظر کرونگا تو اُس صورت میں ضرور دوسرا اصول صورت سہولیت اختیار کریگا۔ اِس حالت میں انسان اپنے لئے ایسے فرائض اور تعینات مقرر کریگا جو اُس کو اوہام باطلہ میں مبتلا یا رسومات و دستورات کا پابند کرکے اخلاقی شریعت سے دور چاہِ ضلالت میں پھینک دینگے جہاں سے نہ تو وہ خدا کی قدوسی کا لحاظ کریگا اور نہ ہی اپنی حالتِ زار سے آگاہ ہونے پاویگا۔ اگر نظرِ انصاف سے دیکھا جاوے تو انسان کے دل میں اخلاقی دوئی پائی جاتی ہی۔ وہ جانتا تو ہی کہ کیا کرنا چاہئے لیکن واجب فعل کی تعمیل و تکمیل سے عاری ولاچار ہوکر اور اِس معما سے بچنے کی خاطر ایک بے دین شخص بچاؤ کی ایسی تدابیر نکالتا ہی کہ جن سے فرائض دینی سہولت اختیار کرتے ہیں اور یوں خام تسلی پاکر وہ بدی اور نحوست میں بدستور مبتلا رہتا ہی اور اِس طرح سے ظاہری فرائض کی ادائیگی سے وہ اپنی ضمیر سے نفرین کی جگہ تحسین سے کام لیتا ہی اور آئندہ جزا یا نیک معاوضہ کا اپنے آپ کو مستحق ٹھہراتا ہی۔ لیکن حق کا طالب دنیاوی تعلقات میں

خدائی کو وابستہ پا کر اور اپنی تباہ حالت اور سیاہ دل سے آگاہ ہو کر خدائے حقیقی کے حضور تائب
اور نادم اور اُس کی مغفرت اور فضل کا خواستگار ہوتا ہے۔ محمد صاحب نے اس مسئلہ کو حل نہیں
کیا۔ قرآن میں گناہ کے مقابلہ میں خدائے عادل و قدوس دکھایا نہیں گیا ہے بلکہ وہ
کریم و رحیم ظاہر کیا گیا ہے اور اس طور پر ظاہر کیا گیا ہے گویا وہ گناہ سے چشم پوشی کرتا ہے اور
گنہگار انسان کو الزام و سزا کا مورد نہیں بناتا ہے بلکہ جو روزہ رکھتا۔ مقررہ نماز ادا کرتا اور
زکوٰۃ و خیرات دیتا ہے وہ بہشت کا وارث ہوتا ہے۔ یہہ طریقہ بہشت حاصل کرنے کا سہل تو
ہے لیکن اس میں انسان کو خدا کے قدوس چہرہ کی روشنی سے رحمت کی آڑ میں چھپایا
گیا ہے حتیٰ کہ وہ تاریکی میں چل کر آجتک نہ خدائے قدوس کو جاننے اور نہ ہی اپنے سیاہ دل
اور اپنی گناہ آلودہ زندگی سے آشنا ہونے پایا ہے۔ اگر بعض مقررہ رسومات کی قید و پابندی
ہی شریعت خدا ہے تو اخلاقی شریعت کا آپ ہی ستیاناس ہوا۔ کیونکہ اخلاقی شریعت کا
مدعا۔ جسکا لبِ لباب خدا کو بدل و جان اور حتی الامکان پیار کرنا اور اپنے ابنائے جنس
کو اپنے جیسا۔ بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اس شریعت کی بنیاد یہہ ہے کہ انسان کو حقیقی اور
اصلی کیا ہونا چاہیئے اور کیا کرنا چاہیئے۔ یہہ شریعت واجب فعل کی تعمیل کا حکم بایں سبب
کرتی ہے۔ حکم اِس لیئے کہ فعل مذکور بذاتہ واجب فعل ہے لیکن اس کے جبری حکم ہی کی وجہ
سے کوئی فعل یا ترک فعل واجب یا غیر واجب قرار نہیں دیا جاتا۔ اخلاقی شریعت کا پابند
تو نیکی ہی کی خاطر کرتا ہے مگر رسم کا پابند آئندہ خوشیوں کے لالچ سے مقررشدہ فرائض بجا
لاتا ہے۔ اُس کا پابند اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نالاں اور گریاں اور خدا کی مدد کا جویاں
ہوتا ہے لیکن اِس کا پابند اپنی نیکیوں پر نازاں ہوتا اور خدا کے حضور اپنے حقوق کا

دعویدار ہوکر آتا ہے۔ ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا۔ اور رفتہ رفتہ یہہ حال ہو جاتا
ہے کہ وہ اپنے بد افعال کو کم کراہیت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے حتیّٰ کہ سخت دل ہوکر سچی نیکی اور
سعادتمندی سے محروم ہو جاتا ہے اور اُس کی ضمیر بھی اُس کے اعمال کا صحیح موازنہ کرنا چھوڑ
دیتی ہے پس ظاہر ہے کہ سوال مذکور کے پہلے جملہ کے متعلق یہہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے
کہ وہ خدا کے قہر و غضب سے نجات پاوے اور اُس قدوس کے نزدیک آنا سیکھے۔ یہہ
بھی ضروری ولابدی ہے کہ وہ اپنی حقیقی حالت سے آگاہی پاوے ورنہ وہ خدا کو کچھ کا
کچھ سمجھیگا کیونکہ جیسا شروع میں بیان ہو چکا ہے انسان کا دل نہایت ہی دہوکہ دینے والا
ہے۔ ہم نے مذہب کی تعریف کرتے ہوئے یہہ کہا تھا کہ مذہب کل قوائے انسانی کو متحرک
کرتا ہے۔ لیکن جبکہ ہم کو خدا کا عرفانِ حقیقی ہوا ہی نہیں اور نہ اپنے آپ سے آشنائی ہے
تو اس صورت میں ہمارے کل قوائے خدا کی راہ میں ہرگز متحرک نہیں ہونگے۔ ہم ہرگز
خدا کو اپنے سارے دل (جذبات) اور اپنی ساری جان سے (روح) اور اپنی ساری عقل
سے اور اپنے سارے زور (حرکات باطنی) سے پیار نہ کرینگے اور نہ ہی خود غرضی اور خود ستائی اور
خود فضیحتی ہم سے دور ہوگی اور نہ ہی دوسروں کی خدمات بلا اجرت بجا لاوینگے اور نہ ہی
بھلائی کا رواج اور برائی کا انسداد پورا پورا ہم سے ہو سکیگا۔

اب ہم دوسرے جملہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنے یہہ کہ نجات کا انجام کیا ہے؟ اس
کے متعلق پہلے باب کی فصل دوم میں تجربکار تواریخی مشاہدہ ملاحظہ فرماویں۔ نجات کا انجام
بچنا نہیں ہے۔ یوں تو دیکھا جاتا ہے کہ انسان کچھ نیکی کا ذخیرہ جمع کرکے گناہوں اور مظالم
کا بھاری بوجھ کندھے سے اور معصیت کی پوٹ سینہ سے اتارنا چاہتا ہے لیکن اس کا نام

نجات نہیں ہی بلکہ نجات سے بھاگنا ہی۔ نجات کا مفہوم فقط یہی نہیں ہی کہ انسان خدا کی نظر میں ایک راستکار ہو یعنے ایک مجرم کی صورت میں نظر نہ آوے بلکہ نجات کا انجام یہہ ہی کہ انسان اپنی استعداد ودیعی کے وجب استعمال کو زینہ بزینہ اعلیٰ منار تک پہنچاوے۔ یعنے جس مقصد اور انجام کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہی وہ اسکو پورا کرے۔ جس کو انجیلی اصطلاح میں پاک بننا کہتے ہیں۔ پاک بنو جیسا خدا جو آسمان پر ہے پاک ہی۔ مبارک وہ ہیں جو پاک دل ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھینگے۔ اس انجام کے لئے انسان کو نئی زندگی کی ضرورت ہی کیونکہ لکھا ہی کہ وہ جو جسم سے پیدا ہوا ہی جسم سے ہی اور وہ جو روح سے پیدا ہوا وہ روح سے ہی۔ گناہ کی وجہ سے انسان میں روحانی موت وارد ہوئی ہی کیونکہ خدا کی وہ قربت اور نزدیکی جو آدم کو حاصل تھی گناہ کرنے کے باعث اُس سے اور اُس کی اولاد سے ہٹالی گئی ہی۔ مادہ سے جان ہویدا نہیں ہوسکتی کیونکہ اُس میں کوئی باطنی اصولِ زندگی موجود نہیں ہی جس کی بدولت وہ خود بخود بذریعۂ نشو ونما حیوانی طبقہ میں داخل ہوجاوے بلکہ جان کا دروازہ مادہ پر مسدود ہی۔ ہاں یہہ ہوسکتا ہی کہ جان کا دخل خارجاً بے جان میں ہوکر اُس کو بڑھاؤ کی صورت میں لاوے ورنہ بے جان شئے بدستور لا تبدیل رہیگی۔ لیکن یہہ یاد رکھنا چاہئے کہ جان اور بے جان کا باہم رشتہ علت ومعلول کا نہیں ہی بلکہ دونوں ایک دوسرے سے جداگانہ اصول پر قائم ہیں۔ مادہ تو از قسم حرکت ہی اور ذی جان از قسم جان با نشو ونما ہی۔ اِسی طرح سے نفسانی انسان جس کا دل اور روح مردہ ہی اُسکو نئی پیدایش کی ضرورت ہی۔ مسیح نے نقودیموس سے کہا کہ جب تک انسان از سر نو

پیدا نہ ہو وہ ہرگز خدا کی بادشاہت میں داخل ہو نہیں سکتا ۔ گناہ کی
وجہ سے انسان اور خدا میں ایک جدائی واقع ہوئی ہے اور اس حالت میں اُس کے اندرونی
تعلقات خدا سے وابستہ نہیں ہیں۔ اِس لئے اُس کو روح کی طرف سے مردہ کہا گیا ہے
نیچر کے طبقاتِ زندگی میں ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ کل زندگی باطنی اور خارجی دو حالتوں سے
وابستہ ہے۔ یعنے ہر نفسیکہ فروے رو دو برے آید اس میں خارج و باطن کا بھاری علاقہ ہے
انسان کا جینا نشو ونما کرنا خارجی تعلقات سے وابستہ ہے جہاں وہ تعلقات بند ہوئے
ہیں وہاں موت وارد ہوئی ہے۔ انسان میں جو کچھ جواہر و اوصاف عقلیہ ہیں اُن کا جواب
نیچر میں ملتا ہے۔ اگر انسان کا کان سُننے سے عاری ہو گیا ہے تو دلاویز گیت کا اثر اُس پر نہیں
پڑ سکتا اور نہ موسیقی کے میٹھے میٹھے زمزموں کی روانی میں وہ ہرگز حظ اُٹھا سکتا ہے۔ اگر
دیکھنے سے لاچار ہے تو پہاڑ اور میدان کا دلکش نظارہ اُس کے لئے کچھ حقیقت نہیں رکھتا
بہرہ دنیا سمعی کی طرف سے مردہ ہے۔ اندھا دنیا عینی یا بصری کی طرف سے۔ اسی
طرح سے جب گناہ کے سبب سے انسان کا تعلق خدا سے منقطع ہو گیا ہے تو وہ شخص
خدائی زندگی بسر کرنے کی طرف سے مردہ ہے۔ جیسے بہرے کو کان کی صحت کی ضرورت
ہے تاکہ اسکا تعلق دنیا سمعی سے از سر نو بحال ہو جاوے اور نابینا کو آنکھ کی ویسے ہی مردہ
دل انسان کو جسکو انجیلی اصطلاح میں نفسانی کہا گیا ہے نئی پیدایش یا روح کی پیدایش
کی ضرورت ہے تاکہ اُس کی نو پیدا روحانی زندگی خدا کی روح کے ساتھ از سر نو بحال
اور وابستہ ہو کر نشو ونما کرے جس طرح نیچر میں ذی جان اپنا ظہور بے جان میں پیدا
کرتا ہے اسی طرح نفسانی انسان میں خدا کا ظہور بذریعہ الہام پیدا ہوتا ہے +

یہہ یاد رہے کہ روحانی بننے کے لئے روحانی زندگی شرط ہی کیونکہ جان کے نشو ونما کے اصول دو ہیں۔ اول وہ خودبخود بلا اعانتِ غیر بڑھتی ہی۔ دوم اُس کے نشو ونما میں ایک راز مخفی ہی۔ جب کوئی بچہ یا پودا نشو ونما پاتا ہی تو اُس میں ارادہ عمل نہیں کررہا ہی۔ ارادہ اُس کے نشو ونما کا علت یا موجب نہیں ہی بلکہ وہ خودبخود بڑھتا ہی۔ اسی طرح سے وہ انسان جس نے نئی پیدائش حاصل کی ہی اُس کی آئندہ ترقی کا مدار اُس کی اپنی کوششوں یا اپنی محنت وکلفت پر نہیں ہی بلکہ خدا کے ساتھہ اُس کی زندگی از سرِنو بحال و وابستہ ہونے کی وجہ سے اُس کی ترقی نشو ونما کی صورت میں خودبخود ہوتی رہتی ہی جس طرح سے پودا خارجی حالات سے تسخیر ہوکر اُن میں سے بقدر ما یحتاج الیہ اپنے بڑھاؤ کے لئے اخذ کرلیتا ہی۔ اسی طرح سے روحانی شخص بوسائل دعا وثنا اور کلامِ مقدس کی تلاوت سے اپنی ترقی کے لئے خوراک لیتا رہتا ہی اور اسے اپنا معمول بنالیتا ہی۔ مسیح کی نسبت (جب وہ ابھی بچہ ہی تھا) یہہ مرقوم ہی کہ لڑکا دانائی وحکمت وفضل میں بڑھتا گیا۔ اُس معصوم بچہ کا بڑھنا ایسا تھا جیسا کہ غنچہ کا بتدریج گلِ صد برگ کی صورت میں تبدیل ہوتا جاتا ہی اُس کی زندگی شروع ہی سے خدا کی روح کے ساتھہ وابستہ تھی اور اس لئے روحانی زندگی کا پہلا اصول شروع ہی سے اُس میں ہویدا تھا +

پھر زندگی کے نشو ونما میں بھید مخفی ہی۔ مسیح فرماتا ہی کہ میں زندگی کی روٹی ہوں۔ پھر فرماتا ہی وہ جو مجھہ میں ہی۔ یعنے وہ جس کی زندگی میری زندگی کے ساتھہ وابستہ ہی وہ زندگی رکھتا ہی اور جو مجھہ میں نہیں ہی وہ زندگی نہیں رکھتا۔ پتھر خودبخود حیوانی طبقہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔ ہاں! البتہ جب اُس میں دخل ذی جان کا ہوتا ہی تب جان

نمودار ہوتی ہی۔اسی طرح سے مسیح کا یہہ قول کہ تم پستی سے ہو اور میں عالم بالا سے
ہوں۔ پر معنے ہی یعنے جب تک اُسکا ظہور بصورتِ الہام ہماری نفسانی زندگی میں پیدا
نہ ہو تب تک ہم روحانی کہلانے کا مجاز نہیں رکھہ سکتے۔ ہاں اکسی مشرب یا قانون کے
پابند ہوکر ہم اپنے آپ کو اخلاقی کہیں تو کہیں مگر روحانی کہہ نہیں سکتے۔ اخلاقی انسان
کو خواہ اُس نے شائستگی اور تہذیب و تمدن میں کتنی ہی ترقی کی ہو روحانی نہیں کہا
جاسکتا۔ کیونکہ اُس کی ترقی نشو و نما میں سے نہیں ہی اور نہ ہی اس میں کوئی مخفی راز ہی
نجات اور اخلاق میں فرق ہی۔ نجات اخلاق کو لاریب شامل کرتی ہی بلکہ صحیح اخلاق کا
مصدر نجات ہی ہی لیکن نجات کا انجام کاملیت حاصل کرنا ہی یعنے اس حالت میں
پُہنچنا ہی جس میں ہماری روحانی زندگی خدا کے ساتھہ وابستہ اور پیوستہ ہوکر بڑھے۔
پھولے اور پھلے۔ وہ جو روحانی زندگی سے محروم ہی اُسکے اخلاق نشو و نما کے اصول
میں سے نہیں ہیں۔ اُن کی وجہ و جہ ترقیات بیان ہوسکتی ہی۔ اخلاقی ترقی کا سبب
انسان کا باہمی اختلاط اور میل جول ہی جس سے ایک دوسرے کا تبادلہ خیالات کے ذریعہ
معمول ہوتا ہی۔ یا نیک کی صحبت سے بھی اکثر انسان کے دل و دماغ میں اخلاقی نقشہ
منعکس ہوتا رہتا ہی جو قوی الاثر ثابت ہوا ہی۔ یا تعلیم و تربیت یا سفر و سیاحت سے
بھی انسان کے اخلاق ترقی کرتے ہیں۔ لیکن جس کی ترقی ظاہر و بیان ہوسکے اور
جو نشو و نما کے اصول میں سے نہ ہو اور نہ اُس میں کوئی راز مخفی ہو وہ اخلاق مذہب کا
نام نہیں رکھہ سکتے۔ قدرتی او مصنوعی پھول میں بدیہی تمیز ہی کہ ایک تو خود بخود
نشو و نما کرتا اور دوسرا محض نقل ہی۔ وہ تو اندیکھے باطن سے بڑھتا ہی اور یہہ محض خاکہ ہی جو

خارجاً رنگا جاتا ہی۔ اسی طرح سے اخلاقی شخص خواہ کتنا ہی ذخیرہ عمل صالح کا فراہم کرے اور ثواب وخیرات کو مقدم واولی سمجھے لیکن تاہم وہ مردہ ہی کیونکہ باطنی زندگی کا محتاج ہی۔ جیسا کوئی مصوّر کسی سادہ کاغذ پر جوانی کی سی آتش خیز قوت متخیلہ کو کام میں لاکر کسی ماہ جبین کے چہرہ اور خط وخال کا ایسا نقش ونگار اتارتا ہی جسکو دیکھتے ہی مصوّر کے ہنر وآفرینی کی طبیعت بےساختہ داد دیتی ہی لیکن پھر بھی اصل اور نقل میں آسمان وزمین کا فرق نظر آتا ہی۔ اس میں جان نہیں اُس میں جان ہی۔ اس میں حس وحرکت نہیں اُسکے حرکات وسکنات میں جان۔ اُس کی نگاہوں میں حسرت آمیز تبسّم جو بجلی کا سا اثر پیدا کر جاتی ہی۔ اُس کے رخساروں میں ماہ تاباں سی جھلک اور اُس کی چال میں رقص۔ اسی طرح سے ایک نفسانی شخص اپنے کیرکٹر پر اخلاقی دلق ملمع چڑھا کر پبلک کے سامنے اپنے آپ کو مستوجب تحسین کی صورت میں پیش کرتا ہی لیکن اُس کی ترقی کی صورت از قسم اصولِ زندگی نہیں ہی کیونکہ اُس میں نہ تو نشو ونما کا اصول پایا جاتا ہی اور نہ ہی اُس کی ترقی میں کوئی راز مخفی ہی۔ نئی پیدائش کی صورت یہہ بیان کی گئی ہی کہ "ہوا جدھر چاہتی ہی چلتی ہی مگر کہاں سے آتی ہی اور کہاں کو جاتی ہی تو نہیں جانتا اسی طرح سرِ نو پیدا ہوتا ہی"۔

روحانی انسان کی ترقی از قسم نشو ونما ہی۔ ظاہراً تو اُس کا بڑھنا اور ترقی کرنا نظر نہیں آتا لیکن اندیکھے وہ مسیحی خوبیوں یعنے حلیمی۔ فروتنی۔ تحمل۔ محبت۔ پرہیزگاری صبر وپاکیزگی وغیرہ میں برابر ترقی پذیر ہوتا ہی اور یہہ تا ہنوز معلوم نہیں ہوا کہ وہ کیا کچھہ ہوگا۔ لیکن غیر مسیحی سے جو نیکیاں ظاہر ہوتی ہیں وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائش

اختیار کرتی ہیں۔ اگر نماز ادا کی جاتی ہی تو تسبیحیں اور مالا ہاتھ میں پکڑ کر مسجدوں اور مندروں کی بلند چوٹیوں پر اور راستوں کے کونوں پر کھڑے ہوکے۔ اگر روزے رکھے جاتے ہیں تو چہرے اوداس ہیں اور منہہ بگاڑے جاتے ہیں۔ اگر خیرات کی جاتی ہی تو ڈھول بجاکر۔ لیکن ایک مسیحی کی نیکیاں خفیہ اور اندیکھی بطور شکرگذاری اور نذرانہ کے خدا کے سامنے خوشبوی کے دھوئیں کی طرح ہیں جو دل کی قربانگاہ سے اُٹھتا رہتا ہی +

پس انسان کی نجات کے لئے متذکرہ بالا دونوں جملوں کی شرط کا پورا ہونا ضروری ہی صحیح اخلاقی طریق جس کی تطبیق و تبلیغ ضروری ولابدی ہو وہ ہی جسکا بانی مبانی اور اُسکو انجام تک پہنچانے والا خدا خود ہی۔ ہماری زندگی کی مساعی و کوششیں اسی اخلاق کی بنیاد پر ہونی چاہئیں اور اسی کی ترقی کے لئے اپنی زندگی بسر کرنا چاہئے کیونکہ انسان کی حقیقی نیکی اور سعادتمندی یہی ہی۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاوے کہ خدا کا جلال ظاہر کرنا انسانی زندگی کی علتِ غائی ہی اور اس کی انجام دہی کے لئے پاکیزہ زندگی بسر کرنا فرض ہی۔ تمام نیکی کی بنیاد محبّت پر ہی یعنی خدا کو بدل و جان پیار کرنا اور اپنے ابنائے جنس کو اپنے جیسا اور جب خدا کے انتظام و بندوبست میں انسان کو بھی حصّہ دیا گیا ہی یعنے اُسکے کل تعلقات خانگی، معاشرتی و معادی خدا کی نظر میں ہیں بلکہ اُسی کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں تو اُن تعلقات کی واجب قدر کرنا اور اُنہی کو بطوع خاطر ملحوظ رکھنا اور پسند کرنا حقیقت میں خدا کے مقرر کردہ اخلاقی طریق کے مقصد و انجام کے پورا کرنے میں خدا کا ہاتھ بٹانا یا اُسکا ہم خدمت بننا ہی۔ اِس لئے اگر خدا کی محبّت کسی انسان کے دل میں افضل ہی اور باقی ہر ایک شی پر

اُسکا دل خدا کو ترجیح دیتا ہی تو اُس محبّت کے چشمہ سے اور شاخیں بھی پھوٹ پڑتی ہیں اور
خدا کے ساتھ ہم اُس طریق کو پیار کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے مقرر ہی اور خدا کی محبّت سے
ہم اپنے ابنائے جنس کو بھی پیار کرنے لگتے ہیں اور اگر دیکھا جاوے تو فی الحقیقت ہماری
پاکیزگی کا ظہور اُس وقت سے شروع ہونے لگتا ہی جب ہم خدا کے ساتھ ہم خدمت
ہو کر اُسکی بادشاہت پھیلانے میں ساعی اور کوشاں ہوتے ہیں۔ لیکن جس محبّت
میں خدا اور اُس کا انتظام اور بندوبست افضل نہیں ہوتا اُس محبّت کا اُمڈا ہوا بہاؤ
نفسانی آمیزش کو ساتھ لیکر صحیح اخلاق کو دل سے اچھال پھینکیگا اور دو ضلالت
کے ساحل پر اُن کو گرا دیگا کیونکہ جب خدا ہمارے دل میں مقدم نہیں ہوگا تب خودی
کا تسلط ہوگا اور جس دل میں خودی کا راج ہوگا اُس جگہ دنیاداری اور بے دینی
پیدا ہوگی اور اس دنیاداری اور بے دینی کا ظہور دو طرح کا ہوتا ہی۔ ایک قسم کے لوگوں
میں تو کھلم کھلا لیکن دوسرے قسم کے لوگوں میں ظاہرداری کے دینی لباس میں
چھپا ہوا۔ ان دونوں جماعتوں کی نظیریں انجیل میں فریسیوں اور محصول لینے والوں
میں دیکھی جاتی ہیں۔ پاکیزگی میں الٰہی شریعت کی پابندی اس لئے ہوتی ہی کہ انسان
خدا کو افضل پیار کرنے کی وجہ سے اُسکی فرمانبرداری بدل وجان قبول کرتا ہی۔ مسیحی
مذہب کے علاوہ اگر دوسرے مذہبی طریقوں کو نقاد نگاہ سے دیکھا جاوے تو ظاہر
ہوگا کہ اُن کے متبع کی نگاہوں میں گناہ اور سچّائی کا موازنہ اُن موضوع قوانین کے
تقلیدی عمل پر ہوتا ہی جو اُن کے پیشواؤں نے مقرر کئے ہیں جنکی بنیاد پر وہ اپنے افعال
یا ترک افعال پر نظر دوڑا کر اُنکو اچھا یا ناقص و مکروہ قرار دیتے ہیں مثلاً قضائے نماز

یا وضو کئے بغیر قرآن پڑھنا یا روزہ نہ رکھنا اور اسی طرح سے چاند گرہن یا سورج گرہن میں اشنان نہ کرنا گناہ شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر مسیحی مذہب میں گناہ خدا کی مخالفت بیان کیا گیا ہی۔ اُس کو بدل وجان پیار نہ کرنا۔ اُس کی بادشاہت پھیلانے میں اُس کا ہاتھ نہ بٹانا یہہ گناہ شمار کیا گیا ہی۔ اِس صورت میں جب کہ خدا پاک ہی اور بندہ گنہگار ہی تو دونوں میں میل کرانے کے لئے الٰہی قدوسی کا محافظ کوئی ہونا چاہئے۔ گناہ کی وجہ سے جب انسان الزام کا مورد بنا ہوا ہی اور مستوجب سزا ہی تو کیا توبہ یا اصلاح سے گناہ کی معافی ہو سکتی ہی؟ ہرگز نہیں! کیونکہ انسان کے جرائم اور اُسکا مستوجب سزا ہونا بدستور قائم رہتے ہیں۔ یہہ لابدی اور ضروری ہی کہ گنہگار انسان توبہ کی راہ سے خدا کی راست خوشنودی کا علم حاصل کرے۔ ہم نے کہا راست۔ کیونکہ اگر یہہ نہ ہو تو الٰہی قدوسی کا محافظ کوئی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اُس سے اخلاقی حکومت کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ تب تو شریعت شریعت نہیں بلکہ حکم ہی کی قید لگنے سے شریعت قائم ہوئی ہی اور یوں شریعت بذاتہ راست نہیں۔ یہہ یاد رکھنا چاہئے (دیکھو باب اول) کہ خدا صرف نعمتوں کا عنایت کرنے والا ہی نہیں ہی بلکہ وہ اپنی نعمتیں ایسے اشخاص کو عطا کرتا ہی جو اپنے اعمال میں نیک ثابت ہوتے ہیں۔ خدا نے جیسی فطرت اور ذات انسان کو عنایت کی ہی اس کے مناسب حال فرائض اور واجبات بجالانے کی توقع اُس سے کی جاتی ہی محض خوشی کا مہیا کرنا ایک امر ہی اور انسان کا راستی اور سچائی کی خاطر نیک بنکر خوش وخرم رہنا امر دیگر ہی +

شریعت فی نفسہ پاک ہی اور نہ نہ اچھی اور کامل ہی کیونکہ وہ پاک ہی اور دانا خدا کی

کامل مرضی کا اظہار ہی۔ جیسے نیچر کے ضوابط ظاہر کرتے ہیں کہ خدا کا طریق عمل بےضابطہ
نہیں ہی اسی طرح سے شریعت خدا کی کامل مرضی کا اظہار ہی اور وہ مخلوق انسان
سے بھی اُس مرضی کے اظہار کا مطالبہ کرتی ہی۔ پاک ہو کیونکہ میں پاک ہوں
اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ انسانی مرتبہ نہایت ہی اعلیٰ وارفع ہی ویدانتی اور صوفی نے خدا
میں محو ہوکر انسانی مرتبہ کو حقیر سمجھا ہی مگر مسیحی مذہب انسانی رتبہ کو ارفع اور اعلیٰ
قرار دیتا ہی اور چونکہ یہہ شریعت کامل شارع کی طرف سے ہی اس لئے وہ تکمیل کا مطالبہ
بھی خدا کے اختیار سے کرتی ہی اور فعل یا ترک فعل کے پاداش یا انعام پر فتویٰ سزا
یا جزا کا بھی عائد کرتی ہی۔ اس شریعت کی تکمیل و تطبیق پر نہ صرف انسانی بہبودی
کا بلکہ تمام خلقت کے نیک انجام کا مدار اور انحصار ہی۔ نیک انجام پیدا کرنے کے لئے
یہہ شریعت انسان سے پاکیزگی طلب کرتی ہی کیونکہ پاکیزگی ہی میں انسان کی حقیقی بھلائی
متصور ہی۔ رسمی شریعت کا پابند صرف رسوم ہی کی بجاآوری ثواب سمجھتا ہی مگر روحانی شخص اخلاقی
شریعت کا پابند ہوکر باطن میں نگاہ ڈالتا ہی اور جو باطن میں نگاہ ڈالتا ہی اُسکا پہلا تجربہ یہہ
ہوتا ہی کہ شریعت کے ساتھہ اُس کی روش کی مطابقت اور موافقت نہیں ہی اس صورت
میں اپنی خستہ حالت کا نظارہ اُسکی آنکھوں کے سامنے سے پھر جاتا ہی اور اپنی تباہ
حالت سے آگاہ ہوکر وہ فضل اور بالائی توفیق کا سہارا مانگتا ہی۔

شریعت کی تطبیق کی حد کی انتہا وہاں تک ہی جہانتک انسان کا کامل منشا امکان
سے ہی یعنے خدا کو اپنے تمام دل اور روح اور عقل اور زور سے پیار کرنا اور اپنے ابنائے
جنس کو اپنے جیسا۔ آپنے پر تاکید ہی۔ یہہ نہیں کہا گیا ہی کہ تو فرشتہ کی سی محبت خدا

سے رکھے بلکہ یہہ کہ جہانتک تیری رسائی کا امکان ہی اُس پیمانہ تک پہنچ جا۔ اس شریعت کا پورا کرنا کل بنی نوع انسان کے لئے لازم و واجب اور فرض ہی۔ وہ انسان کو ایک طور سے مجبور کرتی ہی کہ اُس کے ساتھہ موافقت اور مطابقت پیدا کی جاوے اور اُس کے جبر میں کبھی بھی انقلاب واقع نہیں ہوتا کیونکہ یہہ وہ راستہ دکھاتی ہی جسپر انسان کو ہر حالت اور ہر موقع میں چلنا چاہئے اور گو کوئی بفرض محال اس شریعت کا پابند ہونا منظور بھی نہ کرے تو بھی یہہ اپنی پابندی کا بدستور مطالبہ کرتی رہتی ہی اور انسان کو ذمہ وار ٹھیراتی ہی۔

اب اگر انسان کی موجودہ حالت کی طرف دیکھا جاوے تو ظاہر ہی کہ اول اُسکی روحانی زندگی میں موت وارد ہوئی ہی اور یہہ موت خدا اور انسان میں جدائی کی وجہ سے پائی جاتی ہی۔ اُس میں خدا کی قربت کی جگہ نفسانی خواہشات دل میں جاگزیں ہیں جس کی وجہ سے وہ خدا پسند نیکی کرنے کے قابل نہیں رہا ہی۔ دوم جدائی کی وجہ سے وہ جرم کا مرتکب بنا ہی اور گناہ کی پاداش کی اول صورت یہی نظر آتی ہی کہ انسان دُکھہ مصیبت اور ضلالت کی دلدل میں مبتلا ہی۔ سوم علاوہ موجودہ زندگی میں دُکھہ مصیبت اور رنج کا شکار رہنے کے اُسپر جسمانی موت بھی وارد ہوئی ہی جو انگشتِ شہادت کی طرح آنے والی غیر متناہی موت کو دکھاتی ہی جس پر رحمت کا دروازہ ہمیشہ بند ہی اور جس میں امید کو کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور اُس میں انسان ہمیشہ کے لئے جہنم کا عذاب جھیلتا رہتا ہی۔ جب آدم سے گناہ سرزد ہوا تو اُسی وقت سے روحانی موت کا بیج اُس میں پڑ گیا اور جسمانی موت کی لعنت کا

عمل بھی خدا سے جدا ہونے ہی اُس میں شروع ہونے لگا کیونکہ نفسانی خواہشات کا وہ ایسا تابع ہو گیا کہ جن کے بے جا استعمال سے اُس کی بدنی ترکیب میں رخنہ اور خلل پیدا ہوتا گیا حتیٰ کہ اُسکو جسمانی موت کا مُنہہ دیکھنا پڑا اور یہہ موت اُسکو ہمیشہ کی موت کا بھی لقمہ بناتی اگر خدا اپنے فضل کے ہاتھہ سے اُسکا دستگیر نہ ہوتا +

گناہ کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی تکبر و نخوت کی صورت جس میں انسان خدا سے کچھہ واسطہ رکھنا نہیں چاہتا۔ دوسری نفسانی خواہشات کی۔ جو دنیا داری میں اُس کو پھانستی ہے۔ انسانی تجربہ اس کا شاہد ہے کہ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے تب سے اُس نے اپنے آپ کو گنہگار ہی پایا ہے۔ کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جو یہہ شہادت نہیں دیتا کہ انسان گنہگار ہے۔ سب نے کسی نہ کسی صورت میں گناہ کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے لیکن ہمارا تجربہ یہہ نہیں بتا سکتا کہ کب سے ہم نے گناہ کرنا شروع کیا۔ وہ تو فقط یہی جتاتا ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تب سے ہماری طبیعت کا میلان اور ہمارا قلبی رجحان نفسانی ہے اور اس حالت میں انسان نے اپنے آپ کو برابر قصوروار ٹھہرایا ہے اور خدا کی رحمت پر تکیہ کیا ہے۔ علاوہ اس کے جب حقیقی اخلاقی شریعت کی کرنیں ہمارے تاریک دل میں پڑتی ہیں تب یہہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہم نے خدا کا قصور کیا ہے اور اس لئے اُس کے غضب کے نیچے ہیں جس سے بریت ہونی مشکل ہے۔ خاصکر مسیحی تجربہ اسکا شاہد ہے۔ ایوب نے خدا کی حقیقت دریافت کرتے ہی اپنے آپ کو حقیر سمجھا۔ داؤد خدا کی حقیقت دریافت کرتے ہی پکار اُٹھا کہ مینے خدا کا گناہ کیا ہے۔ پطرس نے مسیح کا الٰہی نظارہ دیکھتے ہی کہا اے خداوند

مجھہ سے دور ہو کیونکہ میں گنہگار ہوں۔ اِسی طرح سے رسولوں کے احوال سے اور بڑے
بڑے مسیحی بزرگان مثلاً لوتھر اور اگسٹین جیسوں کی سرگذشتوں سے اور آجتک تمام
مسیحیوں کے تجربوں سے یہی ثابت ہوا ہی کہ جونہی اُنہوں نے الٰہی اندازہ سے اپنے اعمال
کا موازنہ کیا اپنے آپ کو نہایت ہی گنہگار اور قصوروار پایا۔ رومیوں کے ساتویں باب
میں گناہ کی نفاذ تک ٹوہ لگا کر خطا کاری اور جرم کا پورا نقشہ کھینچکر دکھایا گیا ہی ۲۳
ویں آیت میں مرقوم ہی کہ میں اپنے عضووں میں ایک اور قانون یعنے گناہ کے قانون
کو دیکھتا ہوں جو مجھپر تسلط کر رہا ہی۔ یہہ رسول کو کس طرح سے معلوم ہوا؟ وہ اسکا جواب
خود دیتا ہی یعنے یہہ کہ شریعت سے گناہ کا علم ہوتا ہی۔ ہاں! گناہ تو پہلے ہی سے
موجود تھا مگر شریعت اُسکو آشکارا کر دیتی ہی۔ جیسے ناتن کی معرفت داؤد کا گناہ
اُسپر ظاہر کیا گیا اسی طرح شریعت سے گناہ کا علم ہوتا ہی اور یہہ تجربہ ہر ایک
دیندار اور عابد کا ہوتا آیا ہی۔ یہہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہی کہ محض حکم کی قید ہی
کسی فعل یا ترک فعل کو اچھا یا بُرا قرار دیتی ہی بلکہ یہہ خیال صحیح ہی اور تجربہ بھی اس کا
شاہد ہی کہ گناہ کا علم ہونے سے پیشتر گناہ ہمارے دل میں موجود ہوتا ہی اور گناہ اور خطا
کی حقیقت تب ہی ہم پر آشکارا ہوتی ہی جب خدا کی روح ہمارے تاریک دلوں میں
شریعت کی روشنی کو ڈالتی ہی۔ اُسوقت ہم کو معلوم ہو جاتا ہی کہ ہمارے دلوں میں گناہ
اور گناہ کی نجاست موجود ہی جسکی وجہ سے خدا کے غضب کی تلوار ہمارے سر پر جھوم
رہی ہی جس سے کسی صورت میں ہماری رہائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ فضل کا
بالائی ہاتھہ ہماری مخلصی کے لئے بڑھایا نہ جاوے۔ اُس چور کا خیال کیا جاوے

جو مسیح کی بائیں طرف اپنی صلیب پر آویزاں تھا۔ یہہ وہ شخص تھا جو اپنے تمام زمانہ شباب میں بدکرداریوں کا مرتکب ہوا تھا۔ جسکے ہاتھ چوری اور رہزنی سے رنگے ہوئے تھے اور خونریزی کے مشاق ہو گئے تھے۔ جس کی تلوار نے کئی سر بدن سے جدا کئے ہونگے۔ جسکا بدن گناہ کرتے کرتے خطاکاری کا پیکر بن گیا تھا۔ اُس نے پرائے مال پر ہاتھ صاف کر کے بہتوں کی خانہ بربادی کی تھی۔ اُسکا دل پتھر سا سخت ہو گیا تھا اور وہ جرائم کی زندہ مثال ہو کر مظالم اور معصیت کی پوٹ لیکر اب صلیب پر اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا تھا اور اب صلیبی موت کا مزہ چکھ رہا تھا۔ لیکن اس حالتِ ناگفتہ بہ میں بھی جب ملک الموت اُس کی روح کو اُس کے قفسِ عنصری سے لینے کو تیار کھڑا ہی تب بھی وہ کفر آمیز کلمات کہنے سے باز نہیں آتا۔ جونہی اب جانکندنی کی سی حالت طاری ہونے لگتی ہی۔ وہ یکایک ہوش میں آجاتا ہی۔ ایک طرف تو خداوند مسیح کی پاکیزہ زندگی کا نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہی جسکے دیکھتے ہی اُسکا سخت دل موم کی طرح پگھل جاتا ہی۔ دوسری طرف اپنی خطاؤں اور ناقابل معافی جرائم کا نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے پھر جاتا ہی اور وہ اپنے آپ کو نہایت ہی بے تابی اور بے چینی کی حالت میں پاتا ہی۔ اس آخری وقت میں اب اُس کو یہہ معلوم ہوا کہ میں خدا کی نظر میں نہایت ہی گنہگار ہوں۔ اب اُس کو نظر آتا ہی کہ اُس غضب کی تلوار کا سزاوار جو اس بے گناہ پر چل رہی ہی میں خود ہوں اس حالت بے تابی اور بے چینی میں وہ خداوند مسیح کی طرف دیکھنے لگتا ہی اور اُس سے مخاطب ہو کر کہتا ہی کہ اے خداوند جب تو بہشت میں جاوے

تو مجھ گنہگار کو بھی یاد کرنا۔ گناہ تو چور میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن حقیقی آشنائی گناہ کی اُس کو صلیب پر ہی خداوند مسیح کو دیکھکر ہوئی۔ یہی حال ہم سب کا ہی لیکن ایسے بہت کم ہیں جن کو اپنے گناہوں سے حقیقی آشنائی ہوتی ہی٭

یہہ گناہ جو ہمارے تجربہ سے پہلے ہم میں موجود ہی کہاں سے آیا؟ اسکا جواب فلاسفی کیا دیسکتی ہی؟ ہاں اتنا جواب دیسکتی ہی کہ انسان کا نسلاً بعد نسلٍ ایک دوسرے کے ساتھ خاندانی علاقہ ہونے کی وجہ سے باپ دادوں کے خصائص اور خصائل ہم تک پہنچے ہیں۔ یہہ سچ ہی اور اس کی مستند تصدیق کتب مقدسہ سے ہوتی ہی۔ جہاں یہہ بیان کیا گیا ہی کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے تمام نوع انسان نے جو اُسکی نسل سے ہوئی گناہ میں وجود پایا ہی اور اس لئے دُکھ مصیبت۔ رنج اور موت ہمارا حصّہ ہوا ہی۔ ہمارا قلبی رجحان گناہ کی طرف ہی اور ہم زیر ملامت ہیں۔ جو شخص گناہ کی اس حقیقت کو دریافت کرتا ہی وہ چور مذکور کی طرح فضل کا آسرا ڈھونڈھتا ہی لیکن جو اپنی مساعی اور کوششوں پر تکیہ رکھکر بہشت حاصل کرنا چاہتا ہی وہ نہ تو خدا ہی سے آشنا ہوا ہی اور نہ ہی اپنی ذات سے۔ انسان نے کوئی نہ کوئی اپنا ہیرو بنا کر اُس کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر سمجھنا گوارا کیا ہی کیونکہ اُس کی آڑ میں ہو کر وہ گرے ہوئے ٹکڑوں کی آس کرتا ہی اور اپنے دل میں ایک قسم کی خام تسلی پیدا کر لیتا ہی۔ کیونکہ ہیرو کے احکام اُسکو سہل اور ہلکے معلوم ہوتے ہیں مگر ہائے افسوس! یہہ نہیں دیکھتا ہی کہ وہ خدا کی نظر میں کیسا حقیر و ذلیل ہو گیا ہی اور اُسکی رہائی غیر ممکن ہی۔ اُس نے اپنے ہیرو کے مقابلہ میں

تو اپنے آپ کو حقیر سمجھا مگر خدا کے سامنے اپنے تئیں گنہگار نہیں سمجھا +

آدم کا گناہ جو ہم پر عائد ہوتا ہی اس سے یہہ مراد ہی کہ آدم نے بحیثیت ایک قائم مقام شخص کے گناہ کیا اور اُس کے گناہ کرنے سے اُس کی تمام نسل کی ذاتی حالت خراب اور خستہ ہو گئی۔ اب یہہ دیکھنا چاہیے کہ آیا خدا کا اخلاقی سلوک ہمارے ساتھہ صرف یہی ہی کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی یعنے آیا جیسا انسان اپنی منفردی زندگی میں جدا جدا گناہ کرتا ہی اُسکے مطابق اُس سے سلوک ہوتا ہی یا کہ اُسکا سلوک ہمارے ساتھہ جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول سے اعلےٰ و ارفع ہی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول میں تو خدا گویا ایک قانونی رشتہ انعام و پاداش کا قائم کرکے آپ دنیا سے دست بردار ہو بیٹھا ہی۔ لیکن اگر خدا دنیا سے دست بردار نہیں ہو بیٹھا ہی بلکہ دنیا کے مقصد و انجام میں اُسکا دخل برابر جاری ہی تو یہہ قابلِ تسلیم بات ہی کہ وہ انسان کی نجات کا علاوہ اس اصول کے اور طرح سے بھی انتظام کریگا۔ ہم نے دوسرے باب میں یہہ کھول کر بیان کیا تھا کہ دنیا میں بے ثباتی ہی۔ بے ثباتی فنا کی دلیل ہی مگر دنیا کو قیام دینے والا خدا ہی جو دنیا کے کام سے خصوصاً اخلاقی مقصد و انجام کے لحاظ سے ہرگز دست بردار نہیں ہو گیا ہی۔ اسی طرح سے جب ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ گناہ ہمارے ہیں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی موجود تھا یعنے اُس سے پیشتر کہ عملاً گناہ ہم سے ظہور میں آیا ہمارا قلبی رجحان گناہ کی طرف تھا۔ اس صورت میں جیسی کرنی ویسی بھرنی کی بنیاد پر ہماری نجات کی کوئی صورت بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں البتہ اگر خدا کا علاقہ ہماری زندگی کے ساتھہ بدستور جاری ہی تو وہ ضرور خود ہماری نجات کا سامان مہیا کریگا۔ اگر یہہ مانو کہ انسان واقعی پاپ میں جنم لیتا ہی یعنے گناہ کے عملاً ظہور میں آنے

سے پیشتر ہی اُس کی ارادی حالت نفسانی ہوتی ہی تو پھر یہہ بھی ماننا پڑیگا کہ نجات ایسے فضل کے ذریعہ سے ہو سکتی ہی جسکا بانی مبانی خدا خود ہو۔ گناہ کو خدا نے کیوں اذن کیا؟ یہہ بھاری بھید ہی اسکا جواب عقل دے نہیں سکتی لیکن گناہ کے ساتھ اگر خدا نے اپنی اخلاقی حکومت میں نجات کو بھی بہم پہنچایا ہی تو یہہ ادق مسئلہ بآسانی حل ہو جاتا ہی۔ جس میں ہمارا العجز خدا کے انتظام میں صاد دینے کے حرف لگانا کام نہیں ہی گناہ کے متعلق دو صورتیں مدِ نظر رکھنی چاہئیں۔ اول انسانی فطرت پیدائش ہی سے گناہ میں رنگی ہوئی آئی ہی اور دُکھہ اور رنج اور موت اس حقیقت کی دلیل ہی جو بچّے سے لیکر بوڑھے تک لاحق ہیں اور جن سے ایک بھی مستثنیٰ نہیں ہی۔ لیکن ساتھہ ہی ہر ایک انسان جُدا جُدا اپنے ہی گناہ کے ارتکاب سے مجرم ٹھہرتا ہی۔ پہلی حالت میں اُس کا دلی میلان نفسانی ہوتا ہی۔ دوسری صورت میں وہ اپنے میلان کو عمل میں لاکر گناہ کا مرتکب ہوتا ہی اور تب اُسپر آشکارا ہوتا ہی کہ وہ اپنے عمل کا ذمہ وار اور جوابدہ ہی۔ اکثر یہہ سمجھا جاتا ہی کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی کی بنیاد انسان کی ذاتی لیاقت پر رکھی گئی ہی یعنے اخلاقی انسانوں کے قوائے اور طاقتیں ایسی ہیں کہ جو افعال اُن سے ظہور میں آتے ہیں وہ اُن کے پورے مختار ہیں یعنے وہ اپنی طبعی لیاقت کے انتہائے حد تک جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہہ سچ ہی کہ انسان کی فطرت میں یہہ مرکوز ہی کہ وہ خواہ نیکی کرے خواہ بدی لیکن یہہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ گو انسان میں نیکی اور بدی کرنے کی ذاتی یا طبعی لیاقت موجود ہی مگر اخلاقی طاقت کی کسر اُس میں پائی جاتی ہی یعنے انسان کے دل اور ارادہ کی حالت ایسی خستہ ہی کہ وہ گُناہ ہی کرتا ہی یعنے خدا پرستی کی جگہ وہ نفس پرستی پسند کرتا ہی اور اس

لئے جو کرسکتا ہی اُسکو کرتا نہیں کیونکہ ارادہ کے عمل نے شروع ہی سے دنیا کو پسند کیا ہوا ہی اس لئے خدا پسند نیکی کرنا نہیں چاہتا ہی یعنے جس لیاقت کو وہ کام میں لاکر نیکی کرسکتا تھا اُسکو اُس نے دنیا کی طرف لگایا ہوا ہی۔ اسلئے گو ذاتی یا طبعی لیاقت تو اُس میں موجود ہوتی ہی مگر ارادہ رجوع نہیں ہوتا۔ پولوس رسول بھی اس کی تصدیق کرکے کہتا ہی کہ ارادہ تو موجود ہوتا ہی مگر اُسکا عمل میں لانا موجود نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہی؟ اسکی وجہ صرف یہہ ہی کہ ہماری فطرت پیدایش ہی سے خستہ ہی۔ انسان کے ننھّے بچے کو بنظر غور دیکھیئے۔ ابتدا ہی سے اُسکے مزاج میں تندی۔ نافرمانی کی طبیعت اور پیشانی پر خفگی کے آثار بلکہ تیوریاں چڑھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہہ کیا معمّا ہی؟ اسکا جواب فقط یہہ ہی جو الہامی کتاب بتاتی ہی کہ انسان کا ارادہ خستہ ہونے کی وجہ سے ابتدا ہی سے اُسکا عمل نفسانی ہوا ہی اس لئے ذاتی لیاقت نیکی کرنے کی فطرت میں رکھکر بھی اُس کی ارادی طاقت نیکی کرنے کی مانع ہوتی ہی۔

جب یہہ حال ہی تو جاننا چاہیئے کہ انسان کی نجات کا انتظام اُس کے اپنے ہاتھہ میں سونپا نہیں گیا ہی بلکہ وہ خدا کے ہاتھہ میں ہی۔ اگر اُس نے گناہ کو دُنیا میں اذن کیا ہی تو اُس کے ساتھہ ہم کو الہام کی روح سے یہہ جواب بھی ملتا ہی کہ خدا نے خود انسان کی مخلصی اور نجات کے لئے انتظام کیا ہی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول کے مطابق نجات انسان کے اپنے اختیار میں ہی اور اس طرح سے بہشت ایک لین دین کا سودا متصور ہی جس میں انسان بحیثیت مدعی بہشت لینے کا دعویدار ہوکر آتا ہی لیکن فضل کے بندوبست میں خدا ہی ہم کو راستباز ٹھہراتا ہی اور مسیح میں وہ زندگی عنایت کرتا ہی جو پاکیزگی میں نشو و نما کرتی ہی۔

یہہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا ہم سے دو چیزوں کا مطالبہ کرتا ہی۔ ایک تو شریعت کا جسکو

ہم نے عدول کیا ہی اور عدول کرنے کی وجہ سے خدا کی عدالت اور قدوسی یہہ مطالبہ کرتی
ہی کہ انسان سزا پاوے۔ لیکن ساتھہ ہی الہام کے ذریعہ سے ہم پر یہہ منکشف کیا جاتا ہی
کہ پہلے آدم کی بدولت جو خدا کی صورت و شکل پر بنایا گیا تھا۔ جس کو باغ عدن میں رکھا گیا
جہاں خدا کی قربت و رفاقت اُسکو حاصل تھی۔ جس کی طبعی اور ارادی طاقت بالکل صحیح
اور قائم اور عمدہ تھی تاکہ فرمانبرداری کی راہ سے وہ اپنی آئندہ نسل کی قائم مقامی میں ثابت
قدم رہکر ہمیشہ بہشت میں اپنی نسل کا سرتاج ہوکر راج کرے اُسکی بدولت گناہ ظہور میں
آیا اور وہ باغِ عدن سے نکالا گیا اور اُسکی تمام نسلوں کو باغ عدن سے باہر پیدا ہوکر
اُسکی لعنت اور سزا میں شریک ہونا پڑا کیونکہ تمام نے گناہ کیا۔ اسکے ساتھہ ہی ہم پر یہہ بھی
منکشف کیا جاتا ہی کہ دوسرے آدم یعنے مسیح نے ہمارے بدلا میں قائم مقامی اختیار کرکے
شریعت کے ہر ایک شوشہ اور نقطہ کو پورا کیا اور ساتھہ ہی دُکھہ اُٹھایا اور موت کا مزہ بھی
چکھا اور شریعت کو پورا کرکے اور موت پر غالب آکر انسان کی نجات اور مخلصی اور بہشت
کا دروازہ کھول دیا +

کتب مقدسہ میں شریعت اور فضل دونوں انتظاموں کو مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہی۔
پہلے آدم میں گناہ اور موت کو جو کل نوع انسان میں وارد ہوئی دکھایا ہی۔ دوسرے
آدم یعنے مسیح میں راستی اور زندگی ظاہر کی گئی ہی۔ پہلے آدم میں ہم تحتِ فتویٰ دکھائے
گئے ہیں۔ دوسرے میں بصورت بریت یعنے راستبازی کی حالت میں نظر آتے ہیں۔ پہلے
آدم کے ساتھہ ہم جسمانی موت میں مبتلا ہوئے۔ دوسرے آدم میں موت پر غالب اور
جلالی زندگی میں راج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہی کہ کتب مقدسہ

کس نظر سے انسانی فطرت اور انسانی علت غائی کے خدائی تعلق کو دیکھتی ہیں۔ یعنے پہلے
آدم سے گناہ وارد ہوا اور گناہ کے ورود سے موت دوسرے آدم کے ساتھ ہم فضل کی
راہ سے زندگی میں پیوند ہو کر پاکیزگی یا قدوسی میں ترقی کرتے ہیں۔ نوع انسان فقط افرادی
مجموعہ نہیں ہیں بلکہ کیا بلحاظ صورت تناسل اور کیا بلحاظ اخلاق آپس میں ایک نزدیکی
علاقہ و رشتہ رکھتے ہیں۔ نوع انسان بحیثیت مجموعی ایک خاندان ہی۔ سب ایک ہی نسل سے
ہیں جو ایک کا وصیتی حصہ ہی وہی دوسرے کا بھی ہی۔ اس لئے جو ایک نے کیا وہ دوسرے
میں بھی مرکوز ہی۔ اس کے علاوہ ہم یہہ بھی تجربہ سے معلوم کرتے ہیں کہ گناہ کا وجود ہم سب
میں پایا جاتا ہی اور جب ہم اپنا گناہ معلوم کرتے ہیں تو ہم کو یہہ بھی نظر آتا ہی کہ ہماری ابتدائی
حالت عصمت کو ساتھ لئے ہوئے نہیں ہی دیکھ لیویں کہ دُکھ اور رنج کل نوع انسان کا
حصہ ہی اور کل پر موت بھی لاحق ہی۔ یہہ سب گناہ کا نتیجہ ہی۔ گناہ کی مزدوری موت ہی۔
اس مسئلہ کی عقدہ کشائی کتب مقدسہ یوں کرتی ہیں کہ ہم آدم کی اولاد ہیں اور اُس کی
وراثت میں ہمارا حصہ ہی کیونکہ وہ ہمارا قائم مقام تھا۔ چنانچہ مرقوم ہی کہ جیسے ایک آدم
کے ذریعہ سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ سے موت آئی اور وہ موت سب پر عائد ہوئی کیونکہ
تمام نے گناہ کیا، کیا صبح زندگانی کا طفل نوخیز اور کیا زمانہ شباب کا نوجوان اور کیا
شام حیات کا پیر سال خوردہ۔ ایک کی نافرمانی سے سب مجرم ٹھہرے"۔ اسی طرح سے
دوسرے آدم میں خدا کا فضل ظاہر کیا گیا ہی۔ اس میں مخلصی اور زندگی کا طریق دکھایا
گیا ہی۔ ایک سے گناہ اور گناہ کی وجہ سے ہم راستباز قرار دئے گئے۔ ایک سے موت
دوسرے سے زندگی۔ ایک پاکدامنی اور عصمت سے ہاتھ دھو بیٹھا اور موت کا لقمہ ہوا۔

دوسرا عصمت کی راہ سے پاکیزگی کے درجہ کو پہنچا اور وہ بھی مقابلہ اور مشکلات کی راہ سے غالب پر غالب ہو کر حتیٰ کہ مرتے ہوئے کہا کہ نجات کا کام پورا ہوا اور فی الآخر موت کا ڈنک توڑ کر اور گور کا دروازہ وا کر کے زندہ باہر نکل آیا۔ پہلے آدم میں خدا اور انسان میں جدائی ہوئی اور عدالت نے رحمت کا دروازہ بند کیا جیسا مرقوم ہے۔ اسلئے خداوند خدا نے آدم کو باغ عدن سے باہر کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور کروبیوں کو چمکتی ہوئی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درخت حیات کی راہ کی نگہبانی کریں" دوسرے میں عدالت اور رحمت دونوں نے بوسہ لیا اور خدا اور انسان میں میل کرایا۔ چنانچہ مرقوم ہے "کہ دیکھو ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا (یہہ پردہ اہل یہود کو خدا اور انسان کے درمیان جدائی کی دیوار کو دکھاتا رہا) اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت سی لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھے اٹھیں" الخ پہلا آدم ہمارا جسمانی سر ہوا۔ دوسرا آدم روحانی پہلا سزا کو لایا دوسرا راستی کو۔ پہلے میں ہم روحانی موت میں مبتلا ہوئے۔ دوسرے میں روحانی زندگی میں شریک ہوئے۔ پہلے میں فنا ہمارا لباس ہوا دوسرے میں بقا۔ پہلے میں جدائی دوسرے میں میل۔ پہلے میں ہماری فطرت پر ظلمت کا پردہ اور موت کا گھٹا ٹوپ سایہ چھا گیا۔ دوسرا آفتاب صداقت ہو کر آیا جو ہماری فطرت میں زندگی کا دم پھونکنے والا ثابت ہوا +

اگر شروع سے کتب مقدسہ کا ملاحظہ کیا جاوے تو یہہ صاف صاف ظاہر ہوگا کہ مسیحی مذہب کی بنیاد کسی مشرب یا سوشل اخلاق کے قائم اور جاری رکھنے پر نہیں ہے وہ ایسے اصول پر مبنی نہیں ہے جن کو خدا قائم کر کے خود اُن سے دست بردار ہو گیا ہے اور اُن کی تعمیل

اور تکمیل کو انسانی تواریخ ہی پر چھوڑ دیا گیا ہی بلکہ مذہب کو قائم کرنے والا اور اُسکو انجام تک
پہنچانے والا خدا خود ہی جو اپنی قدوسی اور راستی کے لباس میں ظاہر ہو کر انسانی تواریخ
کا ہادی اور حامی ہوتا ہی اور گو اس مذہب کا ظہور انسانی تواریخ میں شروع ہوتا ہی مگر ساتھ
ہی الٰہی نگرانی میں ترقی کرتا جاتا ہی اور آخر انجام کو پہنچتا ہی۔ اِسی واسطے یہہ مذہب عالمگیر
کہلانے کا مجاز رکھتا ہی کیونکہ اس میں ابتدا ہی۔ ترقی ہی اور تکمیل کو پہنچا ہوا انجام ہی۔ اس
کی تعلیم حسب زمانہ ہی اور اُس میں انجام کو بھی دکھایا گیا ہی۔ خدا کے ازلی ارادہ نے
انجام کو تو شروع ہی سے مقدم رکھا ہی اور نبوّت کی راہ سے اُس ارادہ کو ظاہر کیا ہی جو انسانی
تواریخ میں بتدریج ظہور پکڑتا ہی۔ اُس کا بار یکبارگی ہی پہاڑ کی طرح ٹوٹ نہیں پڑتا ہی بلکہ
توحیدی انجام اتحاد کو دکھا کر انسانی تواریخ میں اُسکا ظہور پہلے بیج کی صورت اختیار
کرتا ہی پھر پودا کی اور پھر درخت کی اور پھر پھل کی صورت جس سے ثابت ہوتا ہی کہ انسان
کا نگران برابر کوئی موجود ہی جو اُس کی علّت غائی اور انجام کو پورا کر رہا ہی۔ مثلاً کتب مقدسہ
کی نبوت کا مدعا یہہ نظر آتا ہی کہ اس امر کو ظاہر کرکے کہ اس برگشتہ دنیا میں راستبازی کی
سلطنت قائم ہوگی اور شیطنت بیخ و بُن سے اُکھاڑی جاویگی لیکن انسانی تواریخ میں تو
انقلاب واقع ہوتے رہتے ہیں اسلئے اہل یہود کے زمانوں میں نسل در نسل یہہ نبوت
حسب ترقی زمانہ کے بھی اُن سے سلوک کرتی جاتی ہی اور ایک ہی پیمانہ سے پشتوں کا اندازہ
نہیں کیا ہی۔ جیسا نیچر میں خدا کی حکمت و قدرت اور رحمت ظاہر ہوتی ہیں ویسا ہی
نبوت سے خدا کا کمال اور کیرکٹر نمایاں ہوتا ہی۔ وہ نبوت انسانی تواریخ کی ہم پلہ ہو کر ظاہر
ہوتی ہی۔ اُس سے تواریخ کا سلسلہ ظاہر ہوتا ہی اور تواریخ جسقدر انجام کو پہنچتی ہی نبوت

کو پورا کرتی ہی مثلاً عہد عتیق آئندہ پر ایسا کرتا ہی۔ اسکے علامات ونشانات دیدۂ آرزو کو آئندہ پر جاتے ہیں"

ہم دیکھتے ہیں کہ اول خدا اپنے آپ کو بحیثیت الوہیم یا قادر مطلق ظاہر کرتا ہی چنانچہ مرقوم ہی کہ ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا جس سے یہہ جتایا گیا ہی کہ مادہ اور جان کا خدا خالق ہی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہہ ہماری عقل میں نہیں آتا کہ مادہ اور جان کیوں مخلوق کہے جاتے ہیں؟ اس کے جواب میں ہم یہہ کہتے ہیں کہ عقل کی اصابت کے درجوں میں ایک بداہت ہی دوسرا نظر۔ پہلے میں وہ قانونِ استخراج کو کام میں لاتی ہی مثلاً حسابی اصول اس زمرہ میں آسکتے ہیں۔ مگر دوسرے میں وہ قانون استقرار سے کام لیتی ہی۔ اس میں مشاہدہ کیا جاتا ہی اور بعد میں فکر دوڑایا جاتا ہی۔ مشاہدہ حقیقتوں کا ہوتا ہی۔ انکی تفصیل و تشریح اور تفریق و تشبیہہ کی جاتی ہی اور اسی طرح سے عمل کرکے عقل مرتبہ یقین حاصل کرتی ہی اور اپنے معلومات کو بڑھاتی ہی۔ اب مادہ یا جان کی نسبت ہم بداہتاً کیا کہہ سکتے ہیں؟ کچھہ نہیں۔ وہ تو بطور حقیقت ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ ہمارا کام اُنکا مشاہدہ کرنا ہی۔ یعنے یہہ دیکھنا کہ وہ بجائے خود اپنی اپنی نسبت کیا شہادت دیتے ہیں۔ مگر ہماری عقل کا یہہ کام نہیں کہ ذہنی مخترعات سے اُن کی نسبت قیاس جمائیں اور زعم میں یہہ ٹھان لیں کہ مادہ یا جان انادی ہیں۔ وہ عقل سے قانونِ استقرار کے کام میں لانیکا مطالبہ کرتے ہیں اور اُس کے متعلق جو کچھہ پہلے باب میں مادہ کے بارہ میں بیان ہوا ملاحظہ فرماویں تو یہہ حقیقت بخوبی آشکارا ہوجاویگی کہ مادہ خلق کی شہادت اپنے ذات و خواص میں رکھتا ہی اور اس شہادت کی بااختیار او مستند تصدیق

خدا خود الہامی کتاب سے کرتا ہے کہ آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ تم مادہ میں مستغرق نہ ہو جاؤ۔ بلکہ میرے نشانات و علامات کو اُن میں دیکھ کر مجھ خالق کی بزرگی اور حشمت بجا لاؤ اور زیادہ میری کھوج کے درپے ہو تو تم مجھکو پاؤ گے کیونکہ میں کسی سے بھی دور نہیں ہوں بلکہ ہر ایک کے نزدیک ہوں۔ اسی طرح سے انسان کا خالق بھی خدا ہے اور اُس کا ابتدا میں باغ عدن میں رکھا جانا اور اُسکو عطیات کا مرحمت فرمانا اور اپنی قربت میں رکھنا یہہ ظاہر کرتا ہے کہ آدم کی کیا حیثیت تھی۔ لیکن اُس کی برگشتگی کے بعد ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ خدا ہم سے بالکل دست بردار نہیں ہو گیا ہے بلکہ اُن پر جو توبہ اور ایمان کی راہ سے خدا کو پکارتے تھے وہ ظاہر ہوتا رہا۔ چنانچہ حنوق اور نوح جو آدم کی متصل اولاد میں سے تھے مثال کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔ نوح کے بعد ہم خدا کا وہ کام دیکھتے ہیں جس میں وہ ایک ایسے بندہ کو منتخب کر لیتا ہے جو آئندہ ایمانداروں کی نسل کا باپ قرار دیا جاوے یعنے ابراہام۔ اُس میں ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جس کا ایمان ہر ایک مشکل کا سامنا کر کے غالب ہوتا ہے لیکن اُسکے ایمان کے ساتھ خدا کا فضل بھی دکھایا گیا ہے تاکہ یہہ ظاہر ہو کہ آدم جو اپنی فعل مختاری کے سبب اُس آزمایش میں جس میں وہ فضل کا ہاتھ نہ پکڑ کر پورا نہیں نکلا بلکہ برگشتہ ہوا تاہم ابراہام فضل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آزمایش میں پورا نکلا۔ وہ اپنے وطن مالوف سے نکل پڑتا ہے۔ در سے بے در ہوتا ہے۔ خانہ سے خانہ بدوش ہو کر خیموں میں گذران کرتا ہے آج یہاں کل وہاں۔ گویا وہ کہتا ہے کہ دنیا ایک دو سرائے فانی ہے۔ یہہ میرا وطن نہیں ہے بلکہ میں اُس ملک کا باسی ہوں جہاں خدا میرے گھر کا چراغ اور میرے وطن کا آفتاب ہے۔ اس طرح ہر مشکل پر غالب آ کر اور ہر آزمایش

میں پورا اٹکل کروہ برکتوں سے مالامال کیا جاتا ہے اور وعید کا بندہ ہوکر اور اپنی بڑی قوم ونسل کا بفضل خدا تخم ڈالکر ملک جاوید کو سدھارتا ہے۔ ابراہام اور اضحاق کے بعد یعقوب پیدا ہوتا ہے جس کے بیٹوں میں قوم کا بیج پڑجاتا ہے اور جو بعد میں بحیثیت قوم ہوکے دشمنوں کے ہاتھ سے محفوظ رکھے جاتے ہیں اور مصر کی غلامی میں اُن کو یہہ سکھلایا جاتا ہے کہ اِس غلامی سے رہا کرنے والا خود خدا ہے تاکہ قوم فضل کے بندے ہوکر خدا کو پہچانیں چنانچہ موسیٰ کی معرفت جب مصر کی غلامی سے اُن کو رہا کیا گیا اور اس سے پیشتر کہ اُن کو ملکِ موعود عطا کیا گیا شریعت کے دس احکام اُن کو دئے گئے اور یہہ کہکر دئے گئے کہ خداوند تیرا خدا (یہوواہ الوہیم) جو تجھے زمین مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں (خروج ۲۰: ۱ و ۲) اس میں غور طلب بات یہہ ہے کہ اس موقع پر شریعت کو دیتے ہوئے خدا کن سے مخاطب ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں وہ آدم سے مخاطب ہوا اور امر اور نہی کی صورت میں اپنے احکام کو پیش کیا لیکن اب خدا اُس قوم سے مخاطب ہوتا ہے جسکو اُس نے آدم کی برگشتگی کے بعد ابراہام کی قائم مقامی میں اُس کی نسل میں سے چن لیا اور جس میں اُس نے اپنے فضل کا کام شروع کر دیا تھا۔ آدم تو معصوم پیدا کیا گیا تھا اور خدا کی قربت اُسکو حاصل تھی لیکن آزمائش میں پڑکر وہ اپنی عصمت میں قائم نہ رہا اور اس لئے باغ عدن سے خارج کیا گیا اور معرض عتاب میں پڑا۔ اب ابراہام کی قائم مقامی میں خدا ایسی قوم کو چن لیتا ہے جس میں اُس کے فضل کا کام شروع ہوتا ہے اور اِس قوم سے خدا مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں۔ میں ھوں پر تاکید کی گئی ہے یعنے خدا کی ہستی کی شہادت

تو نیچر سے بھی ہم کو ملتی ہے اور اُس شہادت کی سند تصدیق پیدایش کی کتاب خود کرتی ہے چنانچہ مرقوم ہے کہ ابتدا میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ مگر اس الہامی جملہ سے ہم پر یہہ منکشف نہیں ہوتا ہے کہ یہہ کون اور کیسا خدا ہے ہاں البتہ باغِ عدن میں آدم کو اُس کی قربت حاصل تھی اور ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ برگشتہ ہونے کے بعد آدم نے خدا کو باغ میں پھرتے ہوئے دیکھا یعنے ہو بہو اور روبرو نہیں دیکھا کیونکہ وہ اُس کے ہو بہو دیکھنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو خدا کی نظر سے درختوں کے پتوں میں چھپاتا تھا اور اِس لئے خدا بھی مجسم صورت میں اُسکو نظر آیا۔ لیکن اب اہلِ یہود کے سامنے جو آدم کی اولاد میں سے تھے اور باغ سے باہر پیدا ہوئے اور اُن کی خدا سے جدائی ہوگئی تھی وہ اپنی شریعت دیتے ہوئے اپنی پہچان کے لئے معجزہ کی نشانی دیتا ہے یعنے خداوند تیرا خدا جو تجھے زمین مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لئے کوئی دوسرا خدا نہ ہووے وغیرہ۔ اس میں قرآن کی طرح یا وید کی تعلیم کی طرح صرف تعلیم توحید پیش نہیں کی گئی ہے جسکا مفہوم جیسا ہم دکھا چکے ہیں لوگوں کے درمیان مختلف طور کا ہوا ہے بلکہ خدا خود اپنے آپ کو بڑے بڑے معجزے دکھا کر اور قوم کو اپنے قوی بازو کے زور سے غلامی سے چھوڑا کر اُن کو یہہ کہتا ہے کہ میرے حضور تیرے لئے کوئی دوسرا خدا نہ ہووے۔ پھر اہلِ یہود کو یہہ سکھلاتا ہے کہ جس طرح مصر کی غلامی کے گھر سے نکال کر اُن کو ملکِ کنعان عطا کرتا ہے اسی طرح سے گناہ کی غلامی سے بھی چھڑانے والا اور آسمانی جگہوں پر بٹھانے والا اور روحانی کنعان تک پہنچانے والا وہی خدا ہے۔ چنانچہ خدا خود اُن کا رہنما اور ہادی بنکر اُن راہوں پر پہنچاتا ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہیں اور کتب مقدسہ میں نبوت خدا کے

اصلی وحقیقی مقاصد واغراض کو منکشف کرتی ہی۔ جو تواریخ میں پورے ہوتے ہیں جن میں نبوت بطور روشنی کے یہہ ظاہر کرتی ہی کہ انسانی تواریخ کا انجام کیا ہوگا*

عہدِ عتیق میں خدا کے طریقِ اعمال اور لوگوں کے افعال آئندہ کے لئے بطور ترقی تبدیلِ صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ مختلف زمانوں کے لحاظ سے خدا اپنے آپ کو پورا پورا ظاہر نہیں کرتا بلکہ اُسی قدر جتنا اُسکا ظہور لوگوں کو گناہ کے خطروں اور بدیوں سے محفوظ رکھنے اور خصوصاً اُن کے دلوں میں اطاعت اور ایمان پیدا کرنے اور آنیوالے جلال کی طرف جس میں خدا کی نجات کا کام پورا ہوتا ہی اُن کے دیدۂ آرزو و اُمید لگانے کے لئے کافی ہو۔ پرانے عہدنامہ میں نبوت مسیح کی الوہیت اور عبودیت کا علمی نمونہ ہی۔ وہ دیوار جدائی جو کہ مابین خدا و انسان واقع ہوئی خدا نے آدم کی برگشتگی کے بعد ہی سے اُس کے منہدم کرنے کے بندوبست کو شروع کردیا اور اُس بندوبست کو نبوت اور کہانت اور بادشاہی کے کاموں میں ظاہر کیا۔ کہانت کے کام میں انسان کو یہہ سکھایا گیا کہ بغیر خون بہائے نجات نہیں ہی اور خدا کے حضور آنے کے لئے کاہن کے درمیانی ہونے کی ضرورت ہی۔ کیونکہ گنہگار انسان خود بخود جدائی کے سبب سے اُس پاکترین جگہ یعنے درگاہِ الٰہی میں داخل ہونے کے لائق نہیں رہا ہی اور ساتھ ہی دیدۂ آرزو کو اُس کامل کاہن اور کامل قربانی کی طرف لگایا گیا ہی جنکی مسیح میں تکمیل ہوتی ہے اور بادشاہی میں یہہ ظاہر کیا گیا ہی کہ گو ابراہام سے ایک بڑی قوم بنی اور ملکِ کنعان اہلِ یہود کے زیرِ تصرف ہوا اور سلطنت داؤد کے وقت سے شروع ہوکر کل سلاطین کے زمانوں میں مروج رہی تاہم یہہ بھی دکھایا گیا ہی کہ داؤد کی جسمانی بادشاہت

کو زوال آجاویگا لیکن روحانی بادشاہت کو ہرگز زوال نہیں آویگا مثلاً حضرت ناتن کا کلام داؤدی بادشاہت کے زوال کا ذاکر ہے۔ چنانچہ جب زمانہ سلاطین میں داؤدی مسکن کو زوال آیا اور اہل یہود بابل کی اسیری میں گرفتار ہوئے اُس وقت اگرچہ زروبابل کی معرفت خدا نے داؤدی دودمان کو پھر بحال کیا مگر وہ بحالیت چند روزہ تھی اور اُس پادشاہی زوال کے بعد انبیائے آخرالزمان خصوصاً حجی وملاکی آئندہ امامت وکہانت پر زور دیتے ہیں اور زروبابل کے بجائے جو کہ شاہی خاندان میں سے تھا اور جس نے اہل یہود کو بابل کی اسیری سے واپس لاکر یروشلم میں ہیکل کی مرمت شروع کی اور جو مرمت ہونے کے بعد کچھ تھوڑے ہی عرصہ تک قائم رہی وہ انبیا یشوع سردار کاہن کا بطور پیشین گوئی ذکر کرتے ہیں ملاکی (باب ۲) نہ کہ بادشاہی کا اور یہہ کہ کس طرح سے اُس امامت کو جو اولادلیوی نے خراب وخستہ کی تھی پاک وکمل کریگا گویا وہ یہہ ظاہر کرتے ہیں کہ مسیح جو داؤد کی نسل میں سے ہوگا اُسکا پہلا نزول امامت کا ہوگا۔ اگر اہل یہود موسوی شریعت کی تاویل وتشریح کتب الہامیہ کے مطابق کرتے تو اس خدشہ ودغدغہ میں نہ پڑتے کہ مسیح کی پہلی آمد میں دنیاوی حکومت کی راہ تاکتے بلکہ نبوت سے بخوبی دریافت کرسکتے تھے کہ مسیح کی پہلی آمد عجز وانکسار کی ہوگی +

نبوت۔ کہانت اور بادشاہت کے کام پرانے عہدنامہ کی تواریخ میں ادھورے تھے کیونکہ وہ تو مسیح کے مجسم ہونے اور فداکاری کے کام کو پورا کرنے کی طرف اپنا انجام ظاہر کرتے تھے۔ مسیح میں اُن نبوتوں کی تشریح وتفصیل ہوسکتی ہے کیونکہ وہی کل کام کرنیوالا اور پشتیبان ہے +

کتب مقدسہ میں تواریخ ونبوت دونوں ایک دوسری کی ہم پلہ ہیں۔ نبوت سے سے تواریخ ظہور میں آتی ہی اور تواریخ جوں جوں انجام کو پہنچتی ہی نبوت کو پورا کرتی جاتی ہی۔ خدا کے نزدیک توازمنہ ثلثہ آج کی صورت میں ہیں لیکن انسانی تواریخ میں خدا کے ازلی ارادہ کو نبوت منکشف کرتی اور انجام کو دکھاتی ہی اور گو ظہور نبوت انسانی واقعات کے مطابق ہوتا ہی مگر اُس کا ظاہر کرنے والا خدا خود ہی اور اس لئے نبوت میں انجام کو مقدم رکھنا چاہیے مثلاً ۱۱ ویں زبور کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ کہانت کا کام جو اہل یہود میں شروع ہوا وہ گویا ایک تعلیمی مدرسہ تھا جس کی آخری ڈگری یہہ تھی کہ وہ کہانت جو ملک صدق کے طریق پر ابراہام پر ظاہر ہوئی مسیح میں پوری ہوتی ہی اسی طرح سے اور معاملات میں بھی نظر آتا ہی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہد جدید کے رسول یہودی قوم کی تواریخ کا اکثر حوالہ دیتے ہیں اور یہہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہودیوں کی تواریخ ایک قسم کا تمہیدی زمانہ تھا جس میں نئے عہد نامہ کی صداقتوں اور حقیقتوں کے نشانات وآثار پائے جاتے ہیں مثلاً مسکن کا بیابان میں معہ لوازمات عبادت قائم ہونا اُس میں اُس زمانہ کے یہودیوں کو تعلیم وتربیت دی گئی ہو مگر ساتھ ہی اُن کی نبوتی صورت بھی دکھائی گئی ہی یعنے کہ وہ اپنی ذات میں کمال بے نظیر ہی مثلاً صیہون کا پہاڑ اور داؤد کی بادشاہت اور زیتون کے پہاڑ پر تعمیر ہیکل اور رسوم قربانی وغیرہ وغیرہ۔ یہہ سب چیزیں نبوت کی تھیں اور حقیقی باتوں کی جو آنے والی تھیں علامات تھیں نشانیاں تھیں جو مسیح کی آمد پر حقیقتوں سے متبدل ہو گئیں لیکن منسوخ نہیں ہوئیں بلکہ نئی صورت پکڑ کر تمام حالت سے کمال کو پہنچیں

پرانے عہدنامہ کی روح تو مسیح اور اُس کے رسولوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کیونکہ اُس درخت کا جو اہل یہود کی کھیتی میں بویا گیا تھا مسیحیت ہی پھول اور پھل ہے +

اہل یہود کو دو پہلوؤں سے دیکھنا چاہیئے۔ ایک بحیثیتِ قوم دوسرے بحیثیت اُمّتِ خدا۔ خدا کی برکتوں کے وارث بنی اسرائیل بحیثیتِ اُمّت ہیں نہ بحیثیت قوم مثلاً یسعیاہ ۱: ۲۴ اور ۶: ۱۳ سے عیاں ہے کہ نبی مذکور اسرائیل کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ اہل یہود کے بُرے لوگ بذریعہ عدالت برطرف کئے جاوینگے اور صرف بقیہ مقدس تخم کا رہجاویگا اور پھر ۱۰: ۲۲ میں اُس بقیہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو اہل یہود میں سے خواہ اُس کی تعداد سمندر کی ریت کے برابر بھی کیوں نہ ہو انتخاب کیا جاتا ہے۔ اور پھر عاموس (۹: ۱۰) کہتا ہے کہ میری امت کے تمام گنہگار تلوار سے کاٹے جاوینگے۔ اسی طرح سے (۷: ۱۴) میں اہل یہود کا قبضہ ہیکل اور اُس زمین پر جو اُن کو عطا ہوئی اُن کی نجات کا باعث نہیں ہونگے اگر وہ نافرمان اور باغی رہے۔ یرمیاہ نبی کو اچھی اور بُری انجیروں کی تشبیہہ سے اور حزقی ایل کو رویا میں علامتہً دکھایا جاتا ہے کہ شریر ظاہرا خواہ کسی طرح کا رشتہ حقیقی بنی اسرائیل کے ساتھ رکھیں مگر اُن کے ساتھ اُن کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے۔ پھر یسعیاہ (۵۶: ۳-۸) میں ہے کہ جب اجنبی اور غیر قوم کے لوگ خدا کی خدمت میں حصہ لیتے ہیں تب وہ بھی اُس کی امت کے ساتھ واجبات اور مساوات میں حقدار ہونگے۔ مصر اور اسور جب خدا کی خدمت کریں تو وہ بھی مساوی حقوق میں بنی اسرائیل کے ساتھ شریک ہونگے ذکریاہ ۲: ۱۱ میں مرقوم ہے کہ اُس دن بہتیری قومیں خداوند سے میل کرینگی اور دے میرے لوگ ہونگے وغیرہ پھر زبور ۸۷: ۴ میں ہے کہ میں رہب

اور بابل کو مذکور کرونگا کہ وہ میرے پہچاننے والوں میں شامل ہیں۔ دیکھ فلستین اور صور کوش سمیت یہہ وہاں پیدا ہوا . . . . . اور پھر یسعیاہ (۲: ۲ و ۴) میں ذکر اقوام ہوا ہی کہ وہ دن آنے ہیں کہ جو غیر قومیں خدا کی عبادت کرینگی وہ اُن کی ہدایت کریگا پھر دیکھو ۶۶: ۱۹ و ۲۰۔ ان متذکرہ بالا آیات سے جو بطور نمونہ نبوت کی کتابوں میں سے لیکر دکھائی گئی ہیں صاف ظاہر ہوتا ہی کہ خدا کی اُمت یہودی قوم پر مخصوص نہیں ہی بلکہ بحیثیت قوم یہہ جتا یا گیا ہی کہ وہ قوم نہیں رہیگی لیکن ہاں بحیثیت امت اسرائیلی رشتہ برقائم رہیگا اور واقعی دیکھنے میں بھی یہی آتا ہی کہ یہودی قوم تو نہیں رہی کر لیکن خدا کی اُمت جو اُس کی عبادت کرتی اور خدا سے ڈرتی رہتی ہی اور کمال عزت اور تعظیم سے ساتھ خدا کے کلام کو جو موسیٰ اور انبیا کی معرفت دیا گیا قبول کرتی ہی۔ اُس کی تعداد کی افزائش اور ترقی روز افزوں ہی۔ اس امت کے لوگ ہر ایک قوم میں سے لئے گئے ہیں اور یہی حسب مراد انبیا حقیقی اسرائیلی قوم ہی جس میں ذاتی نسب و نسل کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہی بلکہ روحانی رشتہ ملحوظ خاطر ہی۔ حتیٰ کہ خدا کی امت کی بڑی جماعت بنتی جاتی ہی۔ حقیر پتھر پہاڑ کی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہی وہ ادنیٰ رائی کا دانہ ایک سایہ دار درخت بنتا جاتا ہی۔ ابن داؤد اپنے دائمی تخت پر جلوس فرما ہی اور قوموں کو فتح کرتا چلا جا رہا ہی اور اُس کی سلطنت کی برکتیں انسانی تجربہ میں روز روز آتی جاتی ہیں بنی اسرائیل کی امید خداوند مسیح میں اور اُسکی انجیل میں بر آئی ہی۔ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہی کہ دیگر اقوام نے اپنی اپنی قوم کا پاس کرکے دوسروں کو ملیچھ یا باربرین یا غیر قوم یا فارن ڈاگس یا شودر کے ناموں سے یاد فرمایا ہی مگر خدا نے کسی قوم کا بھی پاس نہ کرکے ہر ایک

میں سے اپنی اُمت کے لئے لوگ چن لئے ہیں اور چنتا جاتا ہے اور زمانوں کے اختتام تک چنتا جائیگا۔

انبیاء صحف عتیقہ کی تعلیم کی ظاہری صورتوں اور باطنی یا روحانی صورتوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ ایک کو ناتمام اور مقید ہوئے اور دوسرے کو انجام اور کمالیت کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ مثلاً یسعیاہ کہتا ہے کہ خدا مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں اور بیلوں اور بھیڑوں اور بکروں کا لہو نہیں چاہتا ہے بلکہ خداوند فرماتا ہے کہ میں جھوٹے ہدیوں سے خوش نہیں ہوں۔ لبان سے مجھے نفرت ہے۔ چاند اور سبت اور عیدی جماعت سے میں بیزار ہوں۔ وہ سب بوجھ ہیں بلکہ اپنے تئیں دھوؤ۔ آپ کو پاک کرو اور بُرے کاموں کو میری آنکھوں کے سامنے سے دور کرو۔ بدفعل سے باز آؤ نیکوکاری سیکھو۔ انصاف کے پیرو ہو مظلوموں کی مدد کرو۔ یتیموں کی فریادرسی کرو۔ بیوہ عورتوں کے حامی ہوئے وغیرہ۔ اور اسی طرح سے گو یہوواہ کی عبادت کے واسطے زمانۂ تیاری میں ایک خاص جگہ مقرر تھی مگر یسعیاہ (۶۱: ۸) اور استثنا (۱۲: ۵) اور یرمیاہ (۳۱: ۳۱) حزقی ایل (۱۱: ۱۶ و ۲۳) کی آیات میں آئندہ روحانی عبادت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ دوسرے باب میں یسعیاہ کہتا ہے کہ "آخری دنوں میں خدا کے گھر کا پہاڑ پہاڑوں کی چوٹی پر قائم کیا جاویگا اور ٹیلوں سے اونچا کیا جاویگا اور ساری قومیں اُس کی طرف روانہ ہونگی وغیرہ۔ جس میں یہہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ وقت آویگا کہ قومیں یروشلم کے حج کی جگہ روح اور راستی سے خدا کی پرستش کرینگی چنانچہ یسعیاہ (۶۶: ۱-۳) میں مرقوم ہے "کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ آسمان میرا تخت ہے اور زمین میرے پاؤں رکھنے کی چوکی وہ گھر کہاں ہے کہ میرے واسطے بنایا چاہتے ہو اور میری آرامگاہ کہاں ہے . . . مگر میں

اُس شخص پر نگاہ کرونگا۔ اُس پر جو غریب اور شکستہ دل ہے" اور پھر ۲۳ ویں آیت میں
کہتا ہے کہ " ایسا ہوگا کہ ایک نئے چاند سے دوسرے تک اور ایک سبت سے دوسرے
تک سارے بشر میری عبادت کے لئے میرے حضور آوینگے"۔ اس آیت سے صاف
ظاہر ہے کہ اگر کوئی مکانی حج مراد ہوتا تو یہہ بالکل ناممکن ہوتا کہ ہفتہ وار تمام دنیا کے لوگ
ایک پہاڑ پر آکے خداوند کو سجدہ کریں۔ علاوہ اس کے شریعت کے مطابق مکانی عبادتگاہ
کا حج سال میں تین بار مقرر تھا اور وہ بھی اُس دُنیا کے لئے جو پالیسٹین اور اُس کی
سرحدوں سے متعلق تھی۔ لیکن اس میں تاکید و زور خدا کی عبادت پر دیا گیا ہے۔ وہی
خدا جس نے عیدیں مقرر کیں اور ایک خاص مکان عبادت کا بھی مقرر کیا کہ لوگ اُس
کے پاس آسکیں۔ اُسی خدا نے انبیا کی معرفت یہہ بھی ظاہر کیا کہ یہہ تمام رسومات
و دستورات و لوازمات عبادت ہمیشہ کے لئے مقرر نہیں کی گئی ہیں بلکہ ناتمام اور محدود
طور پر اُن کا انقیادی تعلق محض عارضی تھا جو آئندہ کی طرف ایما کرتا تھا اور مسیح میں پورا
ہونے والا تھا۔ چنانچہ شروع میں جب فضل کے بندہ ابراہام کو منتخب کیا گیا تو اُسکی عبادت
گاہ کوئی خاص جگہ نہیں تھی اور اسی طرح سے شریعت کے متعلق ظاہری رسومات بھی
ناتمام اور مقید تھیں چنانچہ یرمیاہ اُس آنے والے زمانہ کی آس میں کہتا ہے کہ " دیکھ وہ
دن آتے ہیں کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھونگا
اُس عہد کے موافق نہیں جو میں نے اُن کے باپ دادوں سے کیا جس دن میں نے اُن کی
دست گیری کی تاکہ زمین مصر سے اُنہیں نکال لاؤں اور اُنہوں نے میرے اس عہد کو
توڑا اور میں نے اُنہیں ترک کر دیا بلکہ یہہ وہ عہد ہے ..... کہ میں اپنی شریعت کو اُن کے

اندر رکھونگا اور اُن کے دل پر اُسے لکھونگا اور میں اُن کا خدا ہونگا اور وہ میرے لوگ ہونگے"
یرمیاہ (۳۱: ۳۱-۳۴) حزقیئیل نے بھی رویا میں دیکھا کہ خدا کے جلال نے ہیکل اور
اُس کے شہر کو فراموش کیا (۱۱: ۲۳) اور ۱۹ ویں آیت میں "میں اُنہیں ایک ہی دل
دونگا اور نئی روح تمہارے اندر ڈالونگا اور سنگین دل اُن کے گوشت میں سے جدا کرونگا"
..... پھر ۲۰ ویں آیت میں "وہ میرے لوگ ہونگے اور میں اُن کا خدا ہونگا" بلکہ
آخری نبی ملاکی بھی کہتا ہے کہ "تمہارے ہاتھوں کا ہدیہ ہرگز قبول نہ کرونگا کیونکہ آفتاب
کے طلوع سے اُس کے غروب تک میرا نام قوموں کے درمیان بزرگ ہوگا اور ہر مکان
میں میرا نام قوموں کے درمیان بزرگ ہوگا رب الافواج فرماتا ہے" (۱: ۱۱) ان آیتوں
سے ظاہر ہے کہ پرانا عہدنامہ منسوخ نہیں ہوا بلکہ مسیح میں اپنے انجام کو پہنچا۔ اہل یہود
گویا کھیتی تھی جس میں خدا نے فضل کی بادشاہت کا بیج بویا تاکہ وہ درخت ہوکر
سب کو بسیرا دیوے۔ یہودی قوم کو تو زوال آگیا لیکن حقیقی روحانی اسرائیل کا بقیہ
ایک بڑا گروہ بن گیا ہے۔ ابن داؤد تو اپنے قدیمی تخت پر جلوس فرما ہوچکا ہے اور اکثر اقوام
اُس کے ماتحت ہوگئیں ہیں اور اُسکی سلطنت کی برکتیں تمام جہان میں مشاہدہ ہورہی
ہیں مسیح اُن کی اور ہماری امید کا پھل تھا جو آج ہم کو نصیب ہوا ہے +

نبی میں دو پہلو پائے جاتے ہیں ایک پہلو میں وہ پیغام کا لینے والا ہوتا ہے
دوسرے میں وہ پیغام کو دوسروں تک پہنچانے والا ہوتا ہے وہ گویا کہ خدا اور
انسان میں درمیانی ہوکر خدا کی طرف سے سچائی اور راستبازی کا محافظ بنتا ہے
مثلاً ابراہام اور موسیٰ دونوں خدا کے دوست متصور تھے اور دونوں خدا کے بھیدوں

سے واقف کئے گئے۔ اور بالخصوص موسیٰ نے خدا سے بالمواجہ گفتگو کی کیونکہ خدا نے اپنی بادشاہت کی ابتدائی صورت کو موسیٰ کی معرفت قائم کیا۔ دنیا میں بہت ایسے اشخاص ہوتے چلے آئے ہیں جن میں حقائق کے دریافت کرنے کا خاص ملکہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اپنے نور فطرت کی بدولت نیچر کی تہ تک پہنچکر اُس میں سے اعلیٰ راز و رموز کو نکال کر الفاظ میں ادا اور اُن کی تاویل و تشریح کرتے ہیں اور اس طرح سے اُن کی خاص معلومات کی بدولت عام مستفیض و مستفید ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے الٰہی و روحانی باتوں کے سمجھنے کے لئے روحانی نبی اور خدا کی ہدایت کی ضرورت ہے دیکھیں پرانے عہدنامہ میں موسیٰ رموز الٰہی میں کس تہ تک پہنچا ہوا تھا۔ اُسکی نسبت خدا نے کہا کہ وہ میرا خادم ہے اور وہ میرے تمام گھر کا امین ہے میں اُس سے بالمشافہ کلام کرتا ہوں۔ باقی نبیوں پر اُسکا ظہور بذریعہ خواب و رویا ہوا مگر موسیٰ سے خدا نے ہو بہو باتیں کیں کیونکہ پرانے عہدنامہ کا درمیانی وہی مقرر ہوا تھا اور اس لئے ضروری تھا کہ وہ خدا سے پوری پوری ہدایت کو حاصل کرے اور یہہ تب ہی ہو سکتا تھا جبکہ وہ اطاعت کی راہ سے خدا کی پوری پوری قربت حاصل کرے۔ باقی نبیوں نے جو کچھ کہا وہ موسیٰ کی تعلیمی بنیاد پر کہا وہ گویا موسیٰ کی شریعت کے مصدق تھے۔ مگر الہام یا نبوّت کے سلسلہ میں ہم برابر ایک عروج کی صورت کو دیکھتے ہیں مثلاً موسیٰ انسان کے اُن فرائض کو منکشف کرتا ہے جو خدا سے علاقہ رکھتے ہیں اور مسیح خدا کی اُس محبّت کو ظاہر کرتا ہے جو انسان سے علاقہ رکھتی ہے۔ موسیٰ شریعت پر زور دیتا ہے شریعت دی گئی اور مسیح فضل پر زور دیتا ہے چنانچہ

مرقوم ہی کہ شریعت موسیٰ کی معرفت دی گئی مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح سے پہنچی۔ موسیٰ خدا کے گھر کا خادم تھا اور اُس گھر کا خاص مدعا یہہ ظاہر کرنے کا تھا کہ وہ اُن اشیا کی شہادتِ معتبر ہو جو آئندہ ظہور پکڑنے والی ہی کیونکہ موسیٰ کو یہہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ اُس نمونہ کے مطابق جو حورب کے پہاڑ پر اُسپر ظاہر کیا گیا مسکن اور اُس کے لوازمات متعلقہ تیار کرے لیکن مسیح کو تو بیٹے کا لقب ملا تاکہ خداوند کے گھر میں با اختیار ہو کر حکومت کرے اور چونکہ اُس کی بادشاہت کی بنیاد وسعت کا درجہ رکھتی تھی اِس لئے اُس کی تعلیم بھی رسومات سے مبرا اور روحانی تھی۔ اور گو موسیٰ کے ساتھ خدا نے روبرو بات چیت کی مگر مسیح میں خدا کی روح کی کامل بھرپوری تھی۔ موسیٰ نے خدا کے کلام کو لیا اور اُسکو دوسروں تک پُہنچایا اور باقی انبیا موسیٰ کی شریعت کی بنیاد پر فرائض اور حکومت وغیرہ کو لوگوں پر منکشف کرتے رہے چنانچہ سموئیل کے زمانہ میں ایک پوری جماعت انبیا کی اُن الہامی باتوں کو جو موسیٰ کی معرفت حاصل ہوئی تھیں لوگوں کے دلوں پر مثبت اور منقش کرتی رہیں۔ اور بعد ازیں ایک اور سلسلۂ انبیا و مرسلین زمانہ سلاطین سے مبعوث ہوا جو کہ از حلقہ حضرت داؤد تھا۔ اس گروہ نے موسوی شریعت میں ایک نئی جان ڈالی۔ اُس کے زبور رواں سے شریعت کا روحانی مقصد منکشف ہوتا ہی۔ اُن میں شریعت ایک شفاف آئینہ کی طرح انسان کی اصلی اور حقیقی حالت کو دکھاتی ہو اور انسان کی دینی آرزو و اُمنگ اور سوز و گداز بخوبی نظر آتے ہیں اُن میں ہم انسان کے اُن مختلف پہلوؤں کو بھی دیکھتے ہیں جو اُسکو اپنے مختلف تجربوں

میں خدا کے سامنے اختیار کرنا زیبا ہی۔ اور اُن میں ایک ایسا انسانی درد موجود ہی
جسکو دور و دراز گذشتہ اور آئندہ زمانوں کا فاصلہ بھی ہرگز مٹا نہیں سکتا۔
اُن میں محض تعلیم ہی قلم بند نہیں کی گئی ہی بلکہ فضل کے بندے کا عام انسانی تجربہ
قلم بند ہی۔ الحاصل موسیٰ کی معرفت خدا لوگوں سے متکلم ہوا مگر مسیح میں کلام خود
مجسم ہوا۔ خدا موسیٰ سے ہمکلام ہوا لیکن خدا مسیح میں بولا۔ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ
خدا کا ظہور مختص صورت سے صورت عامہ اختیار کرتا ہی چنانچہ مسیح کے بعد روح اقدس
عام طور پر مومنوں پر نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ الہام کے بارہ میں روح کے تین طریق
عمل ہیں۔ اول وہ حقائق جو انسانی کُنہ و رسائی سے بعید ہیں روح کی معرفت
انسان کے کشود کار و حصول مقصود ہوتے ہیں اس طریقِ عمل کا نام اِلقاء یا
وحی یا الہام ہی۔ دوم روح ہی انسان کے کلام کی ہدایت و رہنمائی کرتی ہی تاکہ
اُسکا کلام غلطی و سہوِ معنوی و لفظی سے محفوظ رہے اس طریقِ عمل کا نام انکشافِ
باطنی ہی سوم روحِ الٰہی خدا کی پیش کردہ باتوں کو لیکر مومنوں کو سمجھاتی ہی اس
طریق عمل کا نام روحانی عرفان یا معرفت ہی۔ اب جائے غور ہی کہ خدا نے انسان
کی تعلیم اور اپنے ظہور کے لئے شروع ہی سے خود انتظام کیا ہی۔ اور اپنا ظہور
پہلے پہل مخاطبات و مکالمات سے شروع کیا اور بعد میں اُس الہام کو اطاعت
اور ایمان کی شرط پر عام کیا۔ اگر یہہ اعتراض کیا جاوے کہ خدا نے اپنا الہام
شروع ہی سے عام طور پر ظاہر کیوں نہیں کیا تو اسکا جواب یہہ ہی کہ گناہ
عام اظہار الہام کا مانع ہی اس لئے یہہ ضروری تھا کہ خدا آوائل میں خاص

خاص بندوں کو چن لے جو اُسکی قربت میں ہو کر اُس کی الہامی باتوں سے معرفت
حاصل کریں۔ نیچر میں خود یہی قاعدہ بدستور نظر آتا ہی چنانچہ کل شعرا یا فلاسفر یا باریک
بین محقق نہیں ہوتے بلکہ تھوڑوں کی معلومات سے عام کو فیض پہنچتا ہی۔ تھوڑوں
کی ایجاد و اختراع سے بزم جہان روشن ہوتا ہی اسیطرح سے خدا نے روحانی دنیا کے لئے بھی
وہی قاعدہ جاری کر رکھا ہی کیونکہ دونوں کا خالق اور مالک وہی ہی چنانچہ پرانے عہدنامہ میں ہم خاص
خاص اشخاص میں روحانیت و دینداری اور الہام کی صورتیں پاتے ہیں مگر نئے عہدنامہ میں ہم دینداری
وغیرہ کو چنداں شخصی صورت میں نہیں دیکھتے بلکہ مجموعی صورت میں۔ پرانے عہدنامہ میں خدا نے اپنا
ظہورِ ارادہ خاص خاص بندوں کو دیا اور اُنہوں نے خدا کے کلام کو قلم بند کیا۔ لیکن
نئے عہدنامہ میں کلام جو مجسم ہوا جسکو شاگردوں نے دیکھا سُنا۔ اور چھوا جن میں
سے چار نے اُس کلام مجسم کی کیفیت کو قلم بند کیا اور جو انکشاف باطنی کی بدولت
کیفیت مذکور کے بیان کرنے میں غلطی اور سہو سے محفوظ رکھے گئے۔ پرانے عہدنامہ
میں خاص خاص بندوں نے دنیا کی طرف سے اپنی آنکھوں کو بند کرکے اور پوری
اطاعت منظور کرکے خدا کے کلام کو لیا اور دوسروں تک پہنچایا۔ لیکن اب زمانہ کی
بھرپوری میں ہر ایک انسان توبہ اور ایمان کی راہ سے کلامِ مجسم کے روحانی بھیدوں
سے واقفیت حاصل کرسکتا ہی اُن چار کیفیتوں سے جن میں مسیح کی زندگی کا
احوال پایا جاتا ہی پوری پوری شہادت ملتی ہی لیکن مسیح کی کیفیتِ زندگی اُن
ہی پر ختم نہیں ہی بلکہ ہر زمانہ میں مسیح کی کیفیتِ زندگی مسیحیوں کی زندگی میں
ظاہر ہوتی رہتی ہی۔ گویا ہر ایک زمانہ کے مسیحی اپنی اپنی زندگیوں میں مسیح کی

زندگی کی ایک پانچویں کیفیت ساتھ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اب الہام مجسم عرفان سے متبدل ہو کر حقیقی مومنوں پر ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح سے انبیاء کی پیشگوئیں خدا کے عرفان کے بارہ میں خداوند مسیح میں پوری ہوتی ہیں چنانچہ (یسعیاہ ۱۱: ۹) میں مرقوم ہے "وہ میرے مقدس کوہ کی سب اطراف میں کسی کو دکھ نہ دینگے اور توڑنہ ڈالینگے کیونکہ جس طرح پانی سے سمندر بھرا ہوا ہے اسی طرح سے زمین خداوند کے عرفان سے معمور ہوگی" اور (یرمیاہ ۳۱: ۳۴) "اور وہ پھر اپنے اپنے پڑوسی اور اپنے اپنے بھائی کو یہہ کہہ کے نہ سکھا دینگے کہ خداوند کو پہچانو۔ کیونکہ چھوٹے سے بڑے تک وہ سب مجھے جانینگے خداوند کہتا ہے۔ کہ میں اُن کی بدکاری کو بخش دونگا اور اُنکے گناہ کو یاد نہ کرونگا"۔

مسیح میں ہماری تقلید کے لئے انسانی زندگی کا پورا نقشہ پیش کیا جاتا ہے اور وہ بھی تعلیمی ہی صورت میں نہیں بلکہ زندہ صورت میں تاکہ انسان کے جذبات کی تاریں متحرک ہو کر صحیح اخلاق کی طرف اُس کے باطنی پردوں کو سوز و الفت کے ساتھ چھیڑیں اور متاثر کریں۔

پھر مسیح میں نہ صرف خدا کی صفات ظاہر کی جاتی ہیں بلکہ مجسم صورت میں خدا ہمارے نزدیک آتا ہے۔

اول مسیح کی زندگی میں ہم انسانی منصب و پایہ کا کامل اندازہ دیکھتے ہیں۔ وہ عصمت کی امکانی حالت سے ترقی میں قدم رکھ کر اور مقابلہ کی راہ سے ہر مشکل پر غالب آکر اور ہر آزمائش کا مقابلہ کر کے اور خدا کی مرضی کو مقدم

رکھ کے پاکیزگی کے اعلیٰ معیار تک پہنچ جاتا ہے۔ اُس کی زندگی کا نمونہ تعلیم سے
کہیں بڑھکر انسان کے دل میں برقی اثر پیدا کرتا ہے جس طرح کوئی شخص جسکا
میلان تصوّر یا موسیقی کی طرف ہے کسی مصوّر کی عمدہ تصویر کو دیکھ کر یا کسی اعلیٰ راگ کو سُنکر
پکار اُٹھتا ہے کہ میں بھی راگی ہوں یا مصوّر ہوں اسی طرح سے مسیح کا زندہ نمونہ تعلیم
سے بڑھ کر انسان کے دل میں بجلی کا سا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ مسیح میں ہم اُن خوبیوں کا جوہر
دیکھتے ہیں جن پر انسان اور سوسائٹی کی خوشی اور امن کا دارومدار ہے مگر جن کو اکثر لوگ دنی
اور ناچیز سمجھ کر عمل میں نہیں لاتے مثلاً فروتنی کی خوبی۔ غرور تو طبعاً بڑھتا رہتا ہے مگر فروتنی
تعلیم اور تربیت کی محتاج ہے۔ خودی نکالنے ہی سے نکلتی ہے مگر خود انکاری اور خودنثاری
سوز و گداز کی محتاج ہے خودغرضی تو طبعاً ہم میں موجود ہوتی ہے مگر فرمانبرداری والی
طبیعت نئے جنم کا ظہور ہے۔ انصاف کی تعریف و تحسین تو ہوتی ہے مگر انصاف کے پیرو
کم ہوتے ہیں۔ دوسروں سے فرمانبرداری یا سیاست طلب کرنی آسان تر ہے مگر خود
اُس پر عمل کرنا نہایت مشکل ہے۔ دشمنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا تو آسان ہے مگر عفو
کرنا گوارا نہیں کیا جاتا۔ دشمنوں کے لئے عذرخواہی کرنا بھی آسان ہے مگر اُس کو
اپنی محبّت کا گرویدہ بنا لینا نہایت ہی دشوار ہے۔ دنیا کا حاصل کر لینا آسان ہے مگر
روح کی فکر کرنا مشکل ہے عزت قائم کرنا سب چاہتے ہیں مگر خدا کے راستے میں ذلیل
و خوار ہونا کوئی گوارا نہیں کرتا۔ کون ایسا ہے جو سچائی کی خاطر برادری کی پھٹکار جھیلنے
کو تیار ہے۔ کون بدبختوں کی مدد کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ کون آوارہ گردوں کو
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور دُکھ اور مصیبت کے گھٹانے اور بگڑے ہوؤں کو سنوارنے

کے درپے رہتے ہیں۔ کون غریبوں کو اُٹھاتے اور اُن کے ہمدرد ہوتے ہیں؟ جو بدمعاشوں کو محبت کی راہ سے صلاح دیتے ہیں گو وہ اُن کی صلاحوں پر لات مارتے ہیں۔ کون دنیا کے اندھیرے میں روشنی کی طرح چلتے ہیں؟ انسان کا مقصد و انجام مسیح میں پورا ہوتا ہے۔ اُسی میں انسانی راز و رموز فاش ہوتے ہیں مسیح کو جانکر انسان اپنی حالت اور منصب سے آگاہی پاتا ہے اور اُس میں وہ اپنے آپ کو پورا کامل انسان پاتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو تب ہی پہچانتا ہے جب وہ اپنے انجام سے آگاہی پاتا ہے۔ ہم اپنی آشنائی تب ہی حاصل کرتے ہیں جب ہم اُس شریعت سے آگاہی پاتے ہیں جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں مسیح زندہ شریعت ہے کیونکہ عمل کی راہ سے اُس نے شریعت کی پوری اطاعت اور پابندی اختیار کر کے اُسکو ظاہر و باہر کیا کیونکہ وہ شریعت کو ٹالنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا تھا۔ اُس نے شریعت کے حرف و روح اور سزا و جزا بلکہ عدالت کا بھی سامنا کر کے اُسکو پورا کیا اور شریعت کو انسان کے دل و ضمیر پر ایسا کالنقش فی الحجر کیا ہے کہ اُسپر یہہ ظاہر ہو گیا ہے کہ شریعت انسانی زندگی کا ہمیشہ کے لئے دستور العمل ہے۔ اس دستور العمل کے ظہور کی بدولت ہمارے اوپر یہہ بھی آشکارا کر دیا گیا ہے کہ ہماری اصلی حالت کیا ہے اور ہم کو حقیقت میں کیا ہونا چاہیئے۔ اُسکی بدولت ہم مقابلہ کر کے دریافت کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کی ناہموار پیچ در پیچ راہوں کی جس ناہموار سطح پر ہم موجودہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ ہم کو کمال تک نہیں پہنچاتی بلکہ سطح کے نیچے ہم اپنے دلوں کی جانچ پڑتال کر کے یہہ دیکھتے ہیں کہ اپنی زندگی کے اصلی وحقیقی انجام تک پہنچنے کے لئے ہم کو اپنے خیالوں اور خواہشوں اور اعمال میں پاک

ہونا چاہیئے۔ شریعت ہمارے دلوں میں روشنی ڈالتی ہی جس سے ہم کو اپنی اصلی
حالت معلوم ہو جاتی ہی اور اپنے نقائص نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ اس شریعت کی
کامل تشریح مسیح نے اپنی زندگی میں پوری کر کے دکھائی اس لئے اُس کی زندگی
ہمارے لئے کامل و زندہ نمونہ شریعت ہی کیونکہ اُسی میں ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور
یہہ بھی کہ ہم کو کیا ہونا چاہیئے۔ اِس لئے وہ اپنی انسانی ذات میں انسانی معیار کا
پورا اندازہ و پیمانہ ہی۔

اس کے علاوہ جس شخص نے گناہ کے سخت جرم کو نہیں جانا اور گناہ سے جو دکھ پیدا
ہوتا ہی اُسکو محسوس نہیں کیا ہی وہ حقیقت میں اپنے آپ سے ناآشنا ہی مسیح کا کفارہ
جو اُس نے اپنی انسانی و الٰہی ذات دونوں میں پورا کیا بخوبی آشکارا کرتا ہی کہ ہم خدا
کی نظر میں نہایت ہی خطاکار و قصوروار ہیں اور ساتھہ ہی یہہ بھی جتاتا ہی کہ خداوند
مسیح ہمارا نجات دہندہ ہی۔ کفّارہ ہماری برّیت اور مخلصی کا باعث ہوتا ہی۔ کفارہ
کی بدولت ہم نہ صرف سزا سے رہائی پاتے ہیں بلکہ گناہ کے تسلط اور اُس کے کل نتائج
سے بھی رہائی پا کر خدا سے صلح و میل کرتے ہیں مسیح نے گناہ کی قربانی ہو کر اپنے
آپ کو کفارہ میں دیا ہی۔ مسیح کے دکھوں اور موت سے شریعت کے سزائی فتویٰ
کا دعویٰ پورا ہوا۔ اُس کے دُکھ ہمارے بدلے میں ہوئے۔ جو اُس نے کیا وہ ہمارے
بدلہ میں بشرطِ توبہ و ایمان قبول کیا جاتا ہی گویا کہ وہ ہم نے ہی کیا ہی۔ اِس کے علاوہ
مسیح نے شریعت کی دعاوی کو ہمارے بدلہ میں قایم مقام ہو کر پورا کیا جب مسیح
نے بحیثیت قربان بدلہ دیا تو اُس کے اس عمل سے ہمارے جرائم مٹائے گئے اور ہم

بری ہوئے اور بریت کا نتیجہ یہہ ہوا کہ خدا نے اپنی خوشنودی ظاہر کی کیونکہ اُس نے
بدلہ کو قبول کر کے اصلی مجرم سے خوشنودی ظاہر کی ہی۔ محض خدا کا رحم اور انسان
کی توبہ نجات کے کام کو پورا نہیں کرتے کیونکہ خدا پاک ہی اور انسان گنہگار ہی دونوں
کے میل کے لئے پاکیزگی کا تقاضا پورا ہونا چاہیئے۔ گناہ سزا کا سزاوار ہوتا ہی معافی
تب ہی ہو سکتی ہی جب سزائی فتویٰ رفع کیا جاوے اور جرم کی بریت کی جاوے۔
اس لئے کفارہ کی ضرورت ہی۔ اگر محض خوشی حاصل کرنا یا مفید مطلب حصول انسان
کی زندگی کی علت غائی ہی تب تو کفارہ کی ضرورت نہیں ہی لیکن اگر راستبازی
اور پاکیزگی علت غائی ہی تب گناہ کی معافی کے لئے خدا بحیثیت ایک پاک منصف
کے نظر آویگا۔ یہی وجہ ہی کہ بہت لوگ ایسے موجود ہیں جنہوں نے گناہ کے جرم
کو دریافت تو کیا ہی لیکن یہہ دریافت کر کے اُن کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی
چھا گئی ہی اور بجز اُس کے اُن کو کوئی اور چارہ نظر نہیں آیا کہ وہ خدا کی پاک
حضوری سے گریز کریں۔ لیکن جب مسیح کے مقابلہ میں ہم کو اپنی کمی نظر آتی ہی
اور اُس میں ہم اپنے جرائم اور دُکھوں کو دریافت کرتے ہیں تو ہمارے دلوں میں
اُمید کے ساتھ توبہ اور ندامت پیدا ہوتی ہی اور معافی کی مُہر پا کر ہماری آئندہ
کوشش یہی رہتی ہی کہ پاکیزہ یا مسیحی زندگی بسر کریں کیونکہ اپنی خستہ حالت سے
آگاہی پا کر ہم یہہ جان لیتے ہیں کہ حقیقت میں انسانی منصب اور مرتبہ خدا کی
نظر میں نہایت ہی افضل ہی اور گو ہماری موجودہ حالت اُس کی نظر میں نہایت
مکروہ ہی تاہم ہماری زندگی کا انجام یہہ ہی کہ ہم پھر اُسی شکل و صورت پر بحال کئے

جاویں جو جاتی رہی تھی۔ مسیح میں ہم عدالت کے فتویٰ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اُس کی صلیبی موت میں ہم شریعت کے ایک ایک شوشہ اور نقطہ کو پورا ہوتے دیکھتے ہیں اور ہم کو چون وچرا اور قیل وقال کی مطلق گنجایش اور مجال باقی نہیں رہتی بلکہ مسیح کی سزا کو اپنی سزا منظور کر لیتے ہیں اور اِس طرح سے خدا کی عدالت والضاف کو قائم رکھکر اور اپنے دلوں میں حقیقی تائب اور نادم ہو کر ہم اپنی تسلی اور معافی کی خبر پاتے ہیں اور خدا کے حضور آنا سیکھتے ہیں اور مسیح میں ہو کر اُس اندازہ کو اپنے سامنے رکھتے ہیں جس کو مسیح نے اپنی شروع زندگی میں اپنے شاگردوں کے سامنے پیش کیا اور جس کی وہ خود زندہ مثال بنا کہ **کامل ہو جیسا کہ تمہارا باپ جو آسمان پر ہی کامل ہی**

دوم۔ مسیح میں ہم خدا کی پوری قربت کو بھی حاصل کرتے ہیں اور اُس کے نزدیک سیکھتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان طبعاً کوئی نہ کوئی انسانی کاملیت کا پیمانہ اپنے آگے رکھتا ہی۔ اخلاق کے متعلق اُس کا کوئی نہ کوئی کامل معیار مدنظر ہوتا ہی بلکہ کسی نہ کسی ہیرو کو انسان طبعاً ہمیشہ سے مانتا چلا آیا ہی۔ اِسی طرح سے انسان فطرتاً خدا کو بھی جسم کا لباس پہنا کر مانتا رہا ہی تاکہ خدا اُس کے سامنے اپنی صفات سمیت کسی مجسم صورت میں نظر آوے۔ خدا کو اپنے نزدیک لانے کے واسطے بتوں کی سیوا ہوتی چلی آئی ہی۔ بہادروں میں خاص خاص خوبئیں اور جواہر دیکھکر اُن کو خدا کا اوتار مانا ہی۔ یہہ غور کرنے والی بات ہی کہ ایک طرف تو انسان نے کوئی نہ کوئی کامل معیار زندگی کا اپنے سامنے رکھکر اس امر کا اعتراف کیا ہی کہ

اُس کی موجودہ زندگی میں کوئی نہ کوئی نقص ہی جبکو رفع کرنا چاہئیے اور کچھہ نہ کچھہ کمی
جو پوری ہونی چاہئیے۔ اور دوسری طرف خدا کو نزدیک لانیکے لئے اسکو انسانی لباس
پہنایا ہی۔ مسیح میں یہہ انسانی فطرتی تقاضا پورا ہوتا ہی۔ مسیح نہ صرف شریعت
کی زندہ مثال ہی بلکہ خدائے مجسم ہی۔ مسیح میں ہم خدائے مجسم کو دیکھہ کر اُس کی
پوری تعظیم و تکریم اور عبادت و بندگی بجالاتے ہیں۔ اُس میں خدا اور انسان
کا ایسا میل ہوجاتا ہی کہ ہم اپنی حیثیت کو پہچانکر مناسب حال رشتہ خدا سے قائم
کرتے ہیں۔ مسیح میں وہ جو ہم سے نہایت ہی دور تھا نہایت نزدیک ہوجاتا ہی۔ خدا
کا بے پایاں اور لامحدود جاہ و جلال جس کو دیکھہ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں مسیح میں
ایک بادۂ عظمت سا تھہ لئے ہوتا ہی جو ایک ایسے ہی خوش پیرایہ میں نظر آتا ہی جیسے سورج
کی کرن قوس قزح میں۔ خدا کی غیر متناہی محبّت مسیح میں ایسا نمایاں ظہور پکڑتی ہی
جس کو ہم آنکھوں سے دیکھہ سکتے اور کانوں سے سُن سکتے اور دل سے محسوس کرسکتے
ہیں۔ خدا کو گناہ سے جو نفرت ہی اُس کا پورا تصوّر ہم کو مسیح میں ہوجاتا ہی اور خدا کی
محبت کا سماں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے اور مسیح کی الٰہی
زندگی میں ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ خدا نے ازل سے کس طرح ہم کو پیار کیا اور ہماری
نجات کا بندوبست کیا ہی اور ہم کو اب کس طرح سے اپنے پاس بُلاتا ہی۔ مسیح میں
خدا انسانی ذات و انسانی صورت اور انسانی زبان اختیار کرتا ہی۔ اگر ہر پھول
اور ہر شجر اور ہر برگ و ثمر میں نقش و نگارِ قدرت نظر آتے ہیں تو کیا خدا کا انسانی جامہ
پہننا غیر ممکن تصور کیا جاوے جبکہ زیادہ تر اپنے کیرکٹر اور مرضی کے ظاہر کرنے کے

لئے یہہ ضروری ہو؟ اگر خدا محبت ہی تو کلمہ یعنے مسیح کا مجسم ہونا خدا کی محبت کا عملی نمونہ ہی کیونکہ جیسا مسطور ہی وہ اُن دیکھے خدا کا جلال ہی اور اُس کی ماہیت کا نقش، دوم پطرس (۱: ۲۱) میں مرقوم ہی "کہ نبوت کی بات آدمی کی خواہش سے کبھی نہیں ہوئی بلکہ خدا کے مقدس لوگ روح القدس کے بلائے ہوئے بولتے تھے" اس آیت میں الٰہی و انسانی دو پہلو پائے جاتے ہیں خدا کے مقدس لوگ یہہ تو انسانی پہلو ہوا۔ روح کے بلائے بولتے تھے یہہ الٰہی پہلو ہوا۔ کل نوشتہ خدا کا کلام کہا جاتا ہی۔ نوشتوں کا کلامِ خدا بطفیل روحِ پاک نبیوں کے قلبوں میں جاگزیں ہوا۔ یعنے شروع میں خدا بذریعہ کتابی الہام بوساطتِ انسان ہم سے متکلم یا مخاطب ہوا۔ زمانہ کی بھرپوری میں کلمہ خدا نے انسانی جامہ پہنا۔ دونوں کا ظہور بذریعہ روحِ پاک ہوا۔ ایک کا تو مریم کے رحم مطہر میں اور دوسرے کا انبیائے سلف کے قلبوں میں۔ کلمہ خدا آسمان سے نازل ہو کر ہمارے درمیان بصورتِ انسان رہا۔ پُرانے عہدنامہ میں الہامِ خدا مخصوص بندگان پر نازل ہوا۔ دونوں کی سمجھ ہم تک بذریعہ روحانی معرفت و عرفان پہنچی۔ دونوں میں فی الواقع اِنسانیت و الوہیت کا میل و توصل ہوا مسیح میں تو الوہیت کی معموری پائی گئی اور انبیائے سلف میں الوہیت نے مخاطبت کی صورت اختیار کی۔ اُن میں تو خدا نے ہماری رہنمائی کی اور نگاہِ امید آئندہ چیزوں پر لگائی اور مسیح میں عمانوئیل یعنے خدا نے ہمارے ساتھ ہو کر نجات کے کام کو پورا کیا۔ چنانچہ مرقوم ہی (عبرانیوں کا خط ۱: ۱ و ۲) "خدا جس نے اگلے زمانہ میں نبیوں کے وسیلہ باپ دادوں سے بار بار اور طرح بطرح کلام کیا۔ اِن آخری دنوں

ہیں ہم سے بیٹے کے وسیلہ بولا۔ جیسے مسیح میں الٰہی و انسانی ذاتوں کا ایسا اتحاد و میل ہی کہ دونوں ذاتیں بدستور قائم رہتی ہیں۔ اسی طرح سے کتب مقدسہ میں الٰہی و انسانی خصوصیتیں دونوں موجود ہیں جیسے مسیح ابن اللہ ہی اور ابن آدم بھی اسی طرح سے کتب مقدسہ کلامِ خدا ہی اور کلام انسان بھی۔ جیسے بدن اور روح کا باہمی رشتۂ اتحاد ہم بیان نہیں کر سکتے ویسے ہی ہم انسانی و الٰہی رشتۂ اتحاد کو بیان تو نہیں کر سکتے مگر حقیقت جانکر تسلیم کرتے ہیں۔ یہہ الٰہی و انسانی توصل و میل خصوصیت کے درجہ سے عمومیت کی صورت اختیار کرتا ہی مثلاً خدا کا الہام نوشتوں میں تکلم کی صورت سے شروع ہو کر مسیح میں شخصی صورت اختیار کرتا ہی اور پھر وہ کلمہ روح القدس سے متبدل بہ عرفان ہو کر مومنوں میں صورت عامہ اختیار کرتا ہی۔ ہم ابن اللہ کو خدا جانکر اُس کی عبادت اور بندگی کرتے ہیں اور کلامِ خدا جو نوشتوں میں پایا جاتا ہی اُس کو اپنے ایمان و دین کا صحیح عقیدہ جانکر قبول کرتے ہیں +

جائے غور ہی کہ مسیح کی آمد سے نبوت نے صورت عامہ اختیار کی چنانچہ مسیح کی پیدایش کے بارہ میں ہم یہہ بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح مریم نے الہام و نبوت کے حاصل کرنے کے شرائط کو پورا کرکے قدوس کو اپنے رحم میں لینا قبول کیا اور کس طرح وہ ایامِ حمل میں محفوظ و پاک رکھی گئیں۔ پھر اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح سے شروع میں موسیٰ کی نسبت بیان کیا گیا ہی کہ جب وہ تنِ تنہا جنگل میں بھیڑ بکری چراتا تھا اُس وقت خدا اُس پر ظاہر ہوا اور موسیٰ نے اُس کلام کو جو خدا نے فرمایا قبول کیا۔ نیچری ظہور میں باری تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کو جو روز مرہ انسان کے مشاہدہ اور فکر میں آتے ہیں ظاہر کیا ہی لیکن الہامِ نبوت وہ الہام

ہے جس میں انسان وہ پہلو اختیار کرتا ہے جس سے یکسوئی کی حالت میں ہو کر اُس کی مرضی خدا کی مرضی کے تابع ہو جاتی ہے اور تب انسان اور خدا میں ایک حقیقی توصل و میل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح سے موسیٰ نے اور موسیٰ سے پہلے اور بعد کے نبیوں نے خدا کے پیغام کو لیا اور پوری تصدیق کے ساتھ دوسروں تک پہنچایا لیکن مسیح کی پیدائش کے ساتھ نبوت کی خصوصیت جاتی رہتی ہے کیونکہ اب وہ درجہ عمومیت اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے کہ جب مسیح پیدا ہوا اور جس بستی میں پیدا ہوا اُس مُلک میں گڈریے تھے جو میدان میں رہتے اور رات کو باری باری اپنے جھنڈ کی پاسبانی کرتے تھے۔ اور دیکھو کہ خداوند کا ایک فرشتہ اُن پر ظاہر ہوا اور خداوند کا نور اُن کے چوگرد چمکا اور وہ نہایت ڈر گئے۔ تب فرشتہ نے اُنہیں کہا کہ مت ڈرو کیونکہ دیکھو میں تم کو بڑی خوشی کی خبر دیتا ہوں جو سب لوگوں کیواسطے ہوگی کہ داؤد کے شہر میں آج تمہارے لئے ایک نجات دینے والا پیدا ہوا وہ مسیح خداوند ہے" اور پھر یہہ نشان اُن کو دیا کہ "تم ایک لڑکے کو کپڑے میں لپٹا ہوا اور چرنی میں رکھا ہوا پاؤگے۔ اور ایک بارگی اُس فرشتہ کے ساتھ آسمانی لشکر کی ایک جماعت خدا کی تعریف کرتی اور یہہ کہتی ظاہر ہوئی کہ خدا کو آسمان پر تعریف اور زمین پر سلامتی اور آدمیوں سے رضامندی ہووے" اس میں کئی ایک باتیں غور طلب ہیں اول۔ ایک آسمانی پیغام خوشخبری کی صورت میں فرشتہ کی معرفت دیا جاتا ہے۔ اب خدا خود مخاطب نہیں ہوتا کیونکہ مسیح میں خدا انسانی جامہ پہنکر انسان کی نجات کی خاطر ہمارے ساتھ ہوتا ہے اِس واسطے خدا کی نزدیکی کی خوشخبری دیجاتی

ہی۔ دوم کس کو یہہ پیغام دیا جاتا ہی۔ کیا کسی خاص نبی پر یہہ پیغام نازل ہوتا ہی؟
نہیں بلکہ عام طور پر عام کی قائم مقامی میں گڈریوں پر یہہ خوشخبری ظاہر کیجاتی
ہی۔ سوم سابق انبیا پر خدا کا پیغام تنہائی میں نازل ہوتا تھا اور اُس وقت نازل
ہوتا تھا جب وہ اپنے کانوں اور آنکھوں کو دنیا کے دلکش راگوں اور خوش نما
نظاروں سے بند کرتے تھے اور روحانیت میں محو ہوکر صرف خدا کی آواز سننے پر اُسکو
اپنا ہمراز بناتے تھے اور یہہ امر مسلمہ ہی کہ خموشی کی دمسازی میں اکثر انسان شاہد
مقصود سے ہم آغوش ہوتا ہی۔ تب نہ صرف وہ پیغام کو لیتے تھے بلکہ پیغام سے متأثر
ہوکر اُسکو دوسروں تک پہنچا دینے میں اُن کی تمام انسانیت حرکاتِ باطنی اور جذبات
کا ایک امڈا ہوا بہاؤ ہو جاتا تھا اور سوز و الفت سے اُن کے دل گداز ہو جاتے
تھے تب اُن کی طبیعت میں جولانی اور اُن کے فہم و فراست میں ایک سلسلہ جنبانی
پیدا ہو جاتا تھا اور اُن کی ضمیر نورانی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ
مسیح کی پیدایش کے وقت جو رات کو واقع ہوئی گڈریے میدان میں اپنے جھنڈ
کی پاسبانی کرتے تھے یہہ وہ گھڑی تھی جب تمام دنیا پر خاموشی کا عالم تھا اور
تاریکی کا پردہ چھایا ہوا تھا جب نہ تو نسیم سحری کے جھونکے اٹھکیلیاں کرتے
ہوئے اُن کے دل و جگر کو گدگداتے تھے اور نہ مرغِ سحر کی آواز اُن کے روحانی
دھیان اور توجہ میں مخل ہوتی تھی۔ عین اس موزوں موقعہ پر جب رَین کٹی تارے
گن گن اُن کی آنکھیں یہہ تن محو لذتِ دیدار آسمان کے ستاروں پر لگی ہوئی تھیں
تب اُن کے چوگرد نور چمکا اور ایک فرشتہ اُن پر ظاہر ہوا اور خوشخبری کا یہہ پیغام

ایک نشان کے ساتھ دیا کہ "داؤد کے شہر میں آج تمہارے لئے ایک نجات دینے والا پیدا ہوا وہ مسیح خداوند ہے اور تم ایک لڑکے کو کپڑے میں لپٹا ہوا اور چرنی میں رکھا ہوا پاؤ گے"۔ اب جب اِس عجیب و غریب نظارہ نے اُن کے منہہ پر مہر خاموشی اور اُن کو محو حیرت اور اپنا گرویدہ بنا لیا تب ایک اور دل کش منظر اُن کی آنکھوں کے سامنے سے پھر گیا اور اُن کے مستعد اور سُننے والے کانوں نے اس فرشتہ کے ساتھ آسمانی لشکر کی ایک جماعت کو خدا کی تعریف میں اور نبوت آمیز الفاظ میں یہہ آسمانی ترانہ گاتے سُنا کہ خدا کو آسمان پر تعریف اور زمین پر سلامتی اور آدمیوں سے رضامندی ہووے" جس شیریں اور جنت الفردوس کے نغمہ کے سُنتے ہی اُنکے دل فرطِ طرب سے جوش میں بھر آئے ۔ پھر چہارم ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس نظارہ کو دیکھ کر اور خوشخبری کے پیغام کو سُنتے ہی خدا کی حلقہ بگوشی اختیار کرتے ہیں اور نشان کی تصدیق میں اپنی بھیڑ بکریوں کو خدا کی حفاظت میں چھوڑ کر بیت اللحم میں کشاں کشاں آتے ہیں اور اپنے دلوں میں اطمینان پا کر اُس خوشخبری کے پیغام کو خدا کی تعریف کرتے ہوئے دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں +

اور پھر ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ وہ کلمہ ہمارے ساتھ رہا اور اپنی با اختیار تعلیم اور اعمال اور زندگی سے انسانی و الٰہی دونوں پہلوؤں کو دکھاتا رہا چنانچہ اُس نے کہا کہ تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا کہ تو زنا نہ کر۔ زنا کا مفہوم فریسیوں اور عام یہودیوں میں یہہ ہو گیا تھا کہ کسی منکوحہ عورت سے جو کسی غیر کی ہو تو نزدیکی کا تعلق پیدا نہ کر۔ ورنہ شہوت رانی گناہ متصور نہیں تھا۔ یہی محمد صاحب نے

بھی سمجھا کہ نکاح ضروری ہی خواہ دس روز کے لئے ہی ہو لیکن خداوند مسیح ظاہر سے باطن کی طرف مخاطب ہوتا ہی چنانچہ کہا ہے "پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی شہوت سے کسی عورت پر نگاہ کرے وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا"۔ اِسی طرح سے الٰہی اظہار کے بارہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک مفلوج کو چار آدمیوں سے اُٹھوا کر اُسکے پاس لے آئے اور ایک کثیر انبوہ وہاں موجود تھا تب مسیح نے اُس مفلوج کو بھیڑ کے روبرو کہا کہ "ای بیٹے تیرے گناہ معاف ہوئے" بعض فقیہہ جو وہاں بیٹھے تھے اپنے دلوں میں خیال کرنے لگے کہ یہہ کفر ہی کیونکہ خدا کے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ ایک طرح سے وہ فقیہہ منقولات اور معقولات دونوں کے رو سے سچے تھے۔ اگر مسیح محض انسان تھا تو یہہ کلمہ اُس کا بے شک کفر میں داخل تھا لیکن منقولات کے رو سے وہ یہہ بھی جانتے تھے کہ اگر یہہ دعوے گناہ بخشنے کا مسیح نے کیا ہی تو وہ اس دعوی کا ثبوت بھی با تصدیق کرے جیسا انبیائے سابق نے اپنے دعاوی کی ثبوت میں نشان پیش کئے۔ لیکن سخت دلی کی وجہ سے وہ خاموش رہتے ہیں لیکن مسیح خود اُن کا چیلنج منظور کرتا ہی اور علانیہ پوچھتا ہی کہ "مفلوج کو کیا کہنا آسان تر ہی کیا یہہ کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یا یہہ کہ اُٹھ اور اپنا کھٹولا لے چل لیکن تاکہ تم جانو کہ ابن آدم زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہی سو لو اس دعوی کا یہہ نشان ہی۔ "میں تجھے کہتا ہوں (میں پر تاکید ہی) اُٹھ اور اپنا کھٹولا اُٹھا کے اپنے گھر کو جا"، اور وہ فی الفور اُٹھا اور اپنا کھٹولا اُٹھا کر اُن سب کے سامنے چلا گیا۔ خیر اِس خدائے مجسم کی شہادت کے لئے ضروری تھا کہ وہ

اور بھی زیادہ نزدیک ہمارے ساتھ نزدیکی رشتہ اختیار کرے تاکہ خدا ہمارے دل کی ہیکل میں سکونت پذیر ہو جاوے چنانچہ مسیح کے صعود فرما ہونے کے بعد یہہ مرقوم ہو کہ خداوند مسیح کے شاگرد پنتکست کے دن "ایک دل ہو کر اکٹھے ہوئے" اس عمل میں اُن کی حلقہ بگوشی نظر آتی ہو۔ وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے پورے طور سے تابع کر دیتے ہیں۔ مسیح نے مُردوں میں سے اُٹھ کر اپنے آپ کو شاگردوں کے سامنے قوی دلیلوں سے زندہ ثابت کیا تھا اور یوں اُن کے مرجھائے ہوئے ایمان کو تقویت پہنچائی تھی اور اب مسیح کے جی اُٹھنے کی گواہی دینے کے لئے اور مسیحیت کے اظہار کے لئے اُنہوں نے اپنے دلوں کو خدا کی پوری اطاعت منظور کر کے مضبوط کیا اور ایک دل ہو کر خدا کی روح کے نزول کے منتظر ہوئے۔ اب کسی نئے الہام کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی بلکہ اُس عرفان کی ضرورت تھی جس سے مسیح کی باتیں اُن پر پوری طرح سے منکشف ہوں چنانچہ مرقوم ہو کہ "ایک بارگی آسمان سے ایک آواز آئی جیسے بڑی آندھی چلی اور اُس سے سارا گھر جہاں وہ بیٹھے تھے بھر گیا . . . . تب وہ سب روح القدس سے بھر گئے اور غیر زبانیں جیسے روح نے اُنہیں بولنے کی قدرت بخشی بولنے لگے"۔ الخ مطابق اُس نبوت کے جو یوئیل نبی کی معرفت فرمایا گیا کہ خدا کہتا ہو کہ آخری دنوں میں ایسا ہو گا کہ میں اپنی روح میں سے سب آدمیوں پر ڈالونگا اور تمہارے بیٹے اور تمہاری بیٹیاں نبوت کرینگی اور تمہارے جوان رویا دیکھینگے اور تمہارے بوڑھے خواب اور میں اُن دنوں میں اپنے بندوں اور باندیوں پر اپنی روح میں سے ڈھالونگا اور وہ نبوت

کریں گے،، الخ +

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس نے ابتدا خلقت میں سب کچھ خلق کر کے کہا بہت اچھا ہی اُسی نے مسیح میں ہوکر الہام کے انجام کے خاتمہ میں کہا پورا ہوا۔ اور وہ جس نے ابتدا میں انسان کو پیدا کرتے ہوئے اپنی الوہیت کے اقانیم میں کہا کہ "ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بناویں" اُسی نے زمانہ کی بھرپوری اور نجات کے خاتمہ میں کہا یوحنا ۱۷: ۲۱ "تاکہ وے ہماری طرح ایک ہو جاویں" وہی اب ہر ایک مومن سے مخاطب ہوکر کہتا ہی (مکاشفات ۳: ۲۰) دیکھ میں دروازے پر کھڑا ہوں اور کھٹکھٹاتا ہوں اگر کوئی میری آواز سُنے اور دروازہ کھولے تو میں اُس پاس اندر آؤنگا اور اُس کے ساتھ کھاؤنگا اور وہ میرے ساتھ کھائیگا +

لیکن مطابق قول (پولوس رسول اقرنتی ۱۳: ۱۲) کہ اب ہم آئینہ سے دھندلا سا دیکھتے ہیں پر اُس وقت روبرو دیکھیں گے۔ اِس وقت میرا علم ناقص ہی پر اُسوقت میں بالکل جانونگا جس طرح کہ میں سراسر پہچانا گیا" اس کی تشریح بوضاحت مکاشفات کے ۲۱ ویں باب میں دیکھتے ہیں جہاں یہہ بھی مرقوم ہی کہ "دیکھ خدا کا خیمہ آدمیوں کے ساتھ ہی اور وہ اُن کے ساتھ سکونت کریگا اور وہ اُس کے لوگ ہونگے اور خدا اُن کا خدا آپ اُن کے ساتھ رہیگا وغیرہ +

الحاصل۔ جب میں ایک طرف ان مجوسیوں کی طرف نگاہ دوڑاتا ہوں جو ستارہ دیکھ کر یورپ سے یروسلم میں آکر دریافت کرتے ہیں کہ یہودیوں کا

بادشاہ جو پیدا ہوا کہاں ہی؟ یعنے جو نیچریوں کے قائم مقام ہو کر اور خدا کے دریافت کرنے کے لئے وہ پہلو اختیار کرتے ہیں جو جین اُن کو زیبا تھا کیونکہ اُنہوں نے کہا کہ ہم نے پورب میں اس کا ستارہ دیکھا ہی یعنے ہم نے نیچر میں خدائے حقیقی کے نشانات و علامات دیکھے ہیں" اور اسے سجدہ کرنے آئے ہیں" اور جب میں یہہ دیکھتا ہوں خدا اُن کے مناسب حال پہلو اختیار کرنے کے ساتھہ ہی اُن کی ہدایت کرتا ہی اور منزل مقصود تک پہنچا دینے میں نیچر ہی کے ایک نشان کو اُن کا رہبر بناتا ہی اور جب میں دوسری طرف گڈریوں پر نظر کرتا ہوں جن کی خدا خود ہدایت کرتا ہی اور نبوت اور الہام کے ذریعہ سے اُن کو نجات دہندہ کی پیدائش کی خبر اور مکان کا پتہ دیتا ہی اور وہ بھی بالائی الہام سے آشنا ہو کر تسلیم و رضا کا پہلو اختیار کرتے ہیں جو مجوسیوں نے اختیار کیا تھا اور در مقصود حاصل کر کے خدا کی تعریف کرتے ہوئے خوشخبری کے پیغام کو پھیلاتے ہیں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک روح افزا نظارہ کا سماں بندھ جاتا ہی۔ یعنے میں اس ظہور خدا میں جو نیچر میں نمود ہی اور اس الہام خدا میں جو عالم بالا سے نازل ہوا ایک عجیب و غریب اتحاد پاتا ہوں۔ گویا کہ دونوں آپس میں ہم آغوش ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے بوسہ لیا ہی۔ ایک طرف نیچر مجھہ کو اپنی ہدایت سے درگاہ الٰہی کے پاکترین مقام تک پہنچاتا ہی اور مجھہ سے یہہ استدعا کرتا ہی کہ کھٹکھٹا تاکہ تیرے لئے کھولا جاوے مانگ تاکہ تجھہ کو دیا جاوے اور دوسری طرف خدا خود عالم بالا سے مجھہ سے ہمکلام ہوتا ہی اور مجھے اُس پوشیدہ حکمت اور راز و رموز سے آشنا کرتا ہی

جو نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں نہ انسان کے دل میں آئیں +

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ خدا جو طرح بطرح نبیوں کی معرفت ہم سے ہمکلام ہوتا رہا اور آخرکار مسیح میں متکلم ہوا اُس نے انسان سے اپنے دیدار کی شرط اطاعت طلب کی اور خود دھیمی اور دبی آواز سے انسان کے باطن سے مخاطب ہوا چنانچہ مرقوم ہی کہ ایک موقعہ پر جب ایلیا نبی اثنا سفر میں ایک غار میں وارد ہوا اور وہیں رہا تو خداوند کا کلام اُسپر نازل ہوا۔ اور خداوند اُس کے سامنے سے گذرا چنانچہ لکھا ہی کہ خداوند گذرا اور بڑی شدید آندھی نے پہاڑوں کو پھاڑ ڈالا اور خداوند کے آگے چٹانوں کو توڑ تاڑ کیا ہی پر خداوند آندھی میں نہیں اور آندھی کے بعد زلزلہ آیا پر خداوند زلزلہ میں نہیں۔ زلزلہ کے بعد آگ آئی پر خداوند آگ میں نہیں اور آگ کے بعد ایک دھیمی اور ہلکی آواز آئی ۔ خداوند مسیح کی پیدائش کی خبر سُنانے کے وقت فرشتہ مریم سے تنہائی میں متکلم ہوا مسیح کی پیدائش کے وقت ایک فرشتہ نے گڈریوں کو خبر پہنچائی اور باوجودیکہ تمام آسمان فرشتوں کی جماعت کی نغمہ سرائی سے عالم سرود میں تھا تاہم زمین کے رہنے والوں میں سے سوائے گڈریوں کے کانوں کے اُس نغمہ کی گونج اور کہیں نہیں پہنچی۔ جس وقت مسیح مُردوں میں سے جی اُٹھا اس وقت بھی عورتوں پر دو شخص چمچماتی پوشاک پہنے ظاہر ہوئے اور اُن سے دھیمی آواز سے کہا دیہہ آواز انسان تب ہی سُنتا ہی جب وہ دل کی تمام کھڑکیوں کو دنیا کے شور و غل سے بند کر کے تمام دھیان اور توجہ سے صرف خدا کی آواز سُننے پر

آمادہ ہوتا ہی) تم کیوں زندہ کو مُردوں میں ڈھونڈھتی ہو؟ وہ یہاں نہیں ہی بلکہ اُٹھا
ہی" اس پیغام کے ساتھہ مسیح کی پیشگوئی کا نشان بھی دیا "کہ ضرور تھا کہ ابن آدم گنہگاروں
کے ہاتھہ میں حوالہ کیا جاوے او صلیب دیا جائے اور تیسرے دن مُردوں میں
سے جی اُٹھے" پھر لکھا ہی کہ "تب اُس کی باتیں اُنہیں یاد آئیں اور قبر پر سے پھر
کے اُن گیارھوں اور سب باقی لوگوں کو ان سب ماجروں کی خبر دی"۔

اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ مسیح کے صعود فرما ہونے کے بعد بھی جب اُس کے
شاگرد آسمان کی طرف تک رہے تھے اُس وقت بھی دو مرد سفید پوشاک پہنے
اُن کے پاس کھڑے تھے اور اُنہوں نے یوں کہا "کہ تم کیوں کھڑے آسمان
کی طرف دیکھتے ہو؟ یہی یسوع مسیح جو تمہارے پاس سے آسمان پر اُٹھا یا
گیا ہی اُسی طرح جس طرح تم نے اُسے آسمان کو جاتے دیکھا پھر آویگا" ایک طرف
تو مجھے وہ دنیا نظر آتی ہی جسکو خداوند مسیح الوداع کہہ چکا تھا یعنے وہ دنیا جس
نے مسیح کو صلیب دیکر اور رد کرکے اور قبر میں رکھہ کر اپنی راہ لی تھی اور دوسری طرف
میں اُس دنیا کو دیکھتا ہوں جو نبوت کو ساتھہ لئے ہوئے ہی جس نے مسیح کو مُردوں
میں سے جی اُٹھا ہوا دیکھا ہی اور اب جس حالت میں اُس کے عروج کے بعد وہ
ایک دل ہو کر دعا میں خدا کے منتظر ہوتے ہیں اور روح پاک اُن کے دلوں کی
ہیکلوں میں آکر سکونت پذیر ہوتی ہے اور وہ خداوند کے جی اُٹھنے کی شہادت
کے لئے شہید ہو کر اپنے خون کی مُہر لگاتے ہیں اور مسیح کے اقوال وافعال کو لیکر
دوسروں تک پہنچاتے اور خود اُن پر عمل کرتے ہیں اب وہ رسم ربت کی ظاہری

زنجیروں کو جو اُن کو بہت کچھ اس دنیا سے وابستہ کرتی تھیں توڑ کر روحانی دنیا سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ اب وہ اس شریعت کو جو پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی موسیٰ کی معرفت عنایت ہوئی تھی اپنی لوح دل پر کندہ کی ہوئی پاتے ہیں اور اُن احکام کو جو موسیٰ کی معرفت دئے گئے کہ میرے حضور تیرے لئے کوئی دوسرا خدا نہ ہو تو بت پرستی نہ کر اور خدا کا نام بیفائدہ نہ لے وغیرہ اور وہ خدا جو یہوواہ اور الوہیم کے نام سے یہودیوں سے دور سے مخاطب ہوتا تھا اور باسیاست احکام صادر فرماتا تھا

اب مسیح کے شاگرد اُس خدا کو ایک نزدیکی رشتہ حاصل کر کے یوں کہتے ہیں کہ "اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہی تیرے نام کی تقدیس ہو ۔ ۔ ۔ الخ اور اُس کے احکام و فرامین کو فرزندوں کی حیثیت میں نہایت محبّت و انقیاد کی روح سے قبول کرتے ہیں ؛

ابتک تو نیچر اور الہام کے ذریعہ سے خدا ہم سے نرم اور دھیمی آواز سے ہمکلام ہوتا رہا لیکن وہ دن بھی قریب آرہا ہے جب وہ بڑے جاہ و جلال اور کروفر و شان و شوکت سے تختِ عدالت پر عدالت فرما ہو کر کل دنیا سے افعال و اقوال اور تمام کردار کا محاسبہ کریگا چنانچہ انجیل شریف میں اُس کی اس شاہانہ اور پرشان آمد کا بیان یوں مندرج ہے کہ "جیسے بجلی پورب سے کوندھ کے پچھم تک چمکتی ہے ویسا ہی ابنِ آدم کا بھی آنا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن دنوں کی مصیبت کے بعد ترت سورج اندھیرا ہو جائیگا۔ اور چاند اپنی روشنی نہ دیگا اور ستارے آسمان سے گر جائینگے اور آسمان کی قوتیں ہل جائینگی۔ تب ابن آدم کا نشان آسمان پر ظاہر ہوگا اور

اُس وقت زمین کے سارے گھرانے چھاتی پیٹینگے اور ابنِ آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کی بدلیوں پر آتے دیکھینگے اور وہ نرسنگے کے بڑے شور کے ساتھ اپنے فرشتوں کو بھیجیگا ۔ ۔ ۔ الخ

پس مناسب ہی کہ اس ہولناک موقعہ سے بیشتر ہم ہوش میں آویں اور توبہ و ایمان کے حبل المتین کا وسیلہ ہاتھ میں لاکر جناب باری تعالیٰ میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ سربسجود ہوں اور اُس ستار و غفار خالقِ کون و مکان اور مالکِ انس و جان کے حضورِ پاک میں مقبول ہو کر سعادتِ دارین حاصل کریں اور خداوند یسوع مسیح کل جہان کے حقیقی نجات دہندہ کا دامن پکڑ کر در مقصد کو ہاتھ میں لاویں اور بدبختی کی ولدل اور ضلالت و بطالت کے گڑھے سے نکلکر فائز المرام اور دین و دنیا میں فرخندہ فال اور شاد کام ہوں۔ آمین ثم آمین ۔

تمت

لودیانہ مشن پریس ایم۔ وائلی مینیجر ۱۹۰۳ء

فہرست کتب سی-ایل-ایس-لودیانہ

کتاب		قیمت
بائبل کی نجات		۳ پائی
سورۂ فاتحہ مصنفہ پادری آر- روس صاحب		۱ پائی
خداتعالیٰ کے دس احکام	،،	۳ پائی
انجیل شریف کی صحت و درستی	،،	۲ پائی
قرآن	،،	۳ پائی
یسوع مسیح	،،	۳ پائی
یسوع مسیح کے حق میں پیشین گوئیاں	،،	۳ پائی
یسوع مسیح کی موت اور اُسکا مُردوں میں سے جی اُٹھنا	،،	۳ پائی
بیگناہ نبی	،،	۳ پائی
محمد صاحب کی سرگذشت	،،	۳ پائی
مسیح یا محمد	،،	۳ پائی
فارقلیط	،،	۳ پائی
اسماء الٰہی	،،	۳ پائی
سچا اسلام	،،	۳ پائی
ہمارا شافع کون ہے	،،	۳ پائی

نیز رومن حروف و گرمکھی زبان میں بقیمت ۳ پائی فی کتاب مل سکتی ہے۔

۱۶۔ حضرت اسحاق اور اسمٰعیل ۔ مصنفہ پادری آر روس صاحب

۱۷۔ روزہ 〃

۱۸۔ نماز 〃

۱۹۔ خدا ہمارا باپ 〃

۲۰۔ کیا انجیل منسوخ ہو گئی 〃

۲۱۔ ہدایت الممترین مصنفہ ڈاکٹر ویری صاحب

۲۲۔ صفائی کی ضرورت مترجمہ مسٹر ای میا داس صاحب بی ۔ اے

۲۳۔ جھوٹی و سچی خیرات

۲۴۔ پرستش حیوانات

۲۵۔ ویدوں کی ازلیت و ماہیت

۲۶۔ تاریخ طاعون مؤلفہ ڈاکٹر فلپس صاحب

۲۷۔ مسیح کی تعلیم مصنفہ پادری جیمس رابرٹسن صاحب ڈی ۔ ڈی سٹف کور

۲۸۔ 〃 〃 〃 کلاتھ

۲۹۔ رامپال سنگھ رومن مصنفہ مس لوئس مارسٹن صاحبہ ۔ سٹف کور

۳۰۔ 〃 〃 〃 کلاتھ

۳۱۔ رامپال سنگھ اردو مصنفہ مس لوئس مارسٹن صاحبہ سٹف کور

۳۲۔ 〃 〃 〃 کلاتھ

۳۳۔ رشیوں کا آبائی وطن ۔ مصنفہ پادری بی ایل رائے صاحب

۳۴۔ آئندہ زندگی مصنفہ پادری جی ۔ ایل ٹھاکر داس صاحب